اثاثہ

(کلیاتِ نظم و غزل)

رفعت سروش

مرتبہ

ڈاکٹر شبانہ نذیر

اثاثہ

(کلیاتِ نظم و غزل)

(جلد دوم)

رفعت سروش

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

مرتبہ

ڈاکٹر شبانہ نذیر

© جملہ حقوق محفوظ

کتاب : اثاثہ (جلد دوم)

مصنف : رفعت سروش

مرتبہ : ڈاکٹر شبانہ نذیر

مطبع : ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔

ناشر : ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز

10 میٹرو پول مارکیٹ، 2724-25 کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

ASASA

(A Collection of Nazms & Ghazals)

by: ***Rifat Sarosh***

Compiled by: ***Dr. Shabana Nazeer***

Email: drshabananazeer@gmail.com

ISBN: 978-93-86125-83-5

First Edition :2018

Price: **₹ 1000/-** (2 Volume Set) Vol. 2: **₹ 500/-**

Library Edition: ₹ 1250/- (2 Volume Set)

Printed & Published by

M. R. Publications

Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books

 # 10 Metropole Market, 2724-25 First Floor

Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 09810784549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com

گم ہوتا ہوا آسمان

ناشر
نورنگ کتاب گھر، نوئیڈا
اشاعت:
۲۰۰۳ء

•

انتساب

صبیحہ کے نام

جن کی یادوں کی خوشبو میرے شعروں میں بسی ہوئی ہے

پیش لفظ

نئی صدی میں میرے کلام کا یہ پہلا مجموعہ ہے جس میں تازہ اور غیر مطبوعہ مختصر نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ اس سے قبل میرے منظوم ڈراموں، طویل نظموں اور متعدد نثری کتابوں کے علاوہ مختصر نظموں اور غزلوں کے دس مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۹۳۸ء سے آج ۲۰۰۳ء تک میری شاعری پر پینسٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس عرصے میں مختلف ادبی تحریکیں، نظریات اور رُجحانات رُونما ہوئے اور میں اس سارے منظر نامے کا ایک فعال کردار رہا ہوں۔ بدلتے ہوئے معاشرتی وسماجی حالات اور عالمی پیمانے پر رُونما ہونے والی تبدیلیوں کا عکس۔ کہیں گہرا، کہیں ہلکا۔ میری داخلی زندگی میں جذب ہو کر میرے تخلیقی سفر کی راہوں میں اُجالا بکھیرتا رہا ہے۔

میں نے حرف و بیاں کے بہت سے تجربے کیے ہیں، اور میں اس کتاب کے حوالے سے اپنے قارئین اور ناقدین سے پھر آنکھ ملانے کی جرأت کر رہا ہوں۔

—— رفعت سروش

بہ نامِ قوّتِ صد نام

وہ ایک قوتِ صد نام جس کے قبضے میں
تمام ارض و سما ہیں ، تمام حرف و صدا
ہر ایک مخفی و ظاہر حقیقتِ عالم
نظامِ گردشِ رُوح و بدن ، فنا و بقا

فضا میں گونجتی آوازیں اس نے پیدا کیں
ڈھل ڈھل گئے سیّارے، ٹکڑے ٹکڑے ہوئے،
بدن زمینوں کے، اُبھرے پہاڑ، دشت و دمن
سمندروں نے اُچھالے وہ ابر کے پیالے،

نہائے رحمتِ باری میں دشت اور کہسار
زمیں کے سینۂ سوزاں سے کونپلیں پھوٹیں
روش روش پہ کھلے پھول زندگانی کے
ہوائے شوق سے سب خفتہ رونقیں جاگیں

وہ ایک قوّتِ صد نام ، مالکِ عالم
اسی نے بندے کو تخلیق کا شعور دیا
اسی نے بخشی قلم کو یہ دولتِ نایاب
کہ میں نے لفظ کی عظمت کو آشکار کیا

بہ قدرِ ذوق لکھی حمد اور ثنا میں نے
وجودِ باری کی وحدت کا اعتراف کیا
اُٹھا جو عقل کا فتنہ کبھی ، تو پَل بھر میں
عقیدتوں کے ہیولے پہ اس کو وار دیا

مگر یہ کانٹا کھٹکتا ہے دل میں رہ رہ کر
یہ آب و گل کا جہاں پیاس کا نگر کیوں ہے
غریبِ شہرِ صداقت ازل سے ہے محتاج
تونگروں کی عنایت پہ منحصر کیوں ہے

(۲۹ر نومبر ۲۰۰۲ء)

بہار

بوڑھے پیڑ کے خشک تنے پر
اِک ننھی سی کونپل پھوٹی
پہلا حرف،
لکھا،
موسم نے
شادابی کا

نیا حرف

نئی سے نئی نظم لکھی ہے میں نے
نئے سے نئے شعر میں نے کہے ہیں
زباں و بیاں کے نئے تجربوں سے مرا واسطہ ہے
مگر پھر بھی لگتا ہے

جو کچھ لکھا، ہو گیا وہ پرانا

بہت تیز ہے وقت کے انقلابوں کی رفتار
سماجی رویے نئی کروٹیں لے رہے ہیں
ہر اک لمحہ تاریخ بنتا چلا جا رہا ہے
ہر اک لفظ ہو کر رقم لوحِ ماضی پہ کندہ ہے،
لیکن حوالے کی صورت
مگر آج بھی تجربوں کا مجھے حوصلہ ہے
دُھندلکے میں احساس کے منتظر ہوں
نیا حرف اُترے
نئے زاویے سے
نئے روز و شب کی بلاغت کو
شعروں کے پیکر میں ڈھالوں

(۲۶ر نومبر ۲۰۰۱ء)

سچّائی

وہ اِک ننھی سی بچّی تھی
فرشتوں کے جہاں میں کھیلتی تھی چاند تاروں سے
اُڑی پریوں کے ساتھ اِک دِن
اور اُتری سیر کرنے ایک میلے کی
جہاں وہ بھیڑ میں گم ہوگئی ہے، اب کہاں ڈھونڈیں

اسے دیکھا تھا اِک دن ایک تتلی نے
بغل میں بستہ، اور اس کی نظر تھی شوخ پھولوں پر
اسے دیکھا تھا اِک دن جھیل کی بیتاب لہروں نے
وہ اپنے پاؤں سے پانی میں اِک نغمہ جگا کر کھلکھلاتی تھی

اسے دیکھا تھا اِک دن گاؤں کی پگڈنڈیوں نے
سوگئی تھی آم کے باغات میں جا کر
اسے دیکھا تھا اِک دن شہر کی گنجان سڑکوں پر
ہر اِک سے پوچھتی تھی وہ، مرا گھر کس طرف ہوگا

اسے دیکھا تھا ریگستان میں اُڑتے بگولوں نے
وہ اک ٹیلے پہ بیٹھی ریت کے قلعے بناتی تھی

وہ ٹیلہ اُڑ گیا اِک آن میں، طوفان جب آیا
وہ بچّی پھر کسی کو بھی نظر آئی نہیں اب تک
اسے ڈھونڈیں کہاں اتنی بڑی دُنیا کے میلے میں

کبھی ایسا بھی ہو

کبھی ایسا بھی ہو
میں ٹوٹ کے یکسر بکھر جاؤں
پھر اس کے بعد ان ٹکڑوں کو جوڑے اجنبی طاقت
مگر اس طرح،
اِک ٹکڑا کہیں اور اِک کہیں، جس سے،
نئی صورت ہویدا ہو
نئی ترتیب سے اِک دوسرا انسان پیدا ہو
جو 'میں' ہو کر بھی مجھ سے مختلف ہو شکل و صورت میں

(۱۲ر ستمبر ۱۹۹۹ء)

تم؟

تم سے میرے ہزار رشتے ہیں
تم مرے دوست بھی ہو دُشمن بھی
تم مرے راہبر بھی ہو رہزن بھی

کبھی اتنے قریب ہوتے ہو
اپنے دِل کے ہر اِک گوشے میں
تم کو محوِ خرام پاتا ہوں
اور کبھی بن کے نوکِ نشترِ جاں
مجھ سے تم انتقام لیتے ہو
پھر محبّت سے رکھتے ہو شبنم
میرے مجروح دِل کے زخموں پر

دشتِ غربت میں جب بھٹکتا ہوں
تم کسی موڑ پہ اچانک ہی
تھام لیتے ہو میرے دامن کو
باتیں کرتے ہو زیرِ لب مجھ سے
مثلِ آئینہ مجھ کو تکتے ہو
کبھی ہنستے ہو، مسکراتے ہو

تم جو بتلا سکو تو بتلاؤ
کس طرح بس گئے ہو تم مجھ میں!

(۱۱ر مارچ ۱۹۹۵ء)

گوشۂ ذہن

ذہن کے اس گوشے میں
جس میں بھولی بسری یادیں ہیں
ماضی کا انبار پڑا ہے بے ترتیب
ٹوٹی پھوٹی اُمیدوں کا ملبہ ہے
کچھ تصویریں اور خطوں کے پرزے ہیں
جھوٹے سچّے وعدے ہیں

(یکم دسمبر ۱۹۹۴ء)

آپا کلثوم

(بسترِ مرگ پر)

موت کھڑی ہے اس کے سرہانے
دیکھ رہی ہے اس کو کب سے
للچائی للچائی نظر سے
وہ ہے اِک کمزور سی عورت
بے بس ، لاچاری کی مورت
سلب ہے گویائی کی قوت
پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی
دیکھ رہی ہے جانے کس کو
کون اپنا ہے کون پرایا
اس کی بھی پہچان نہیں ہے
ہاں لیکن ارمان بہت ہیں
اس کی ان پیاسی آنکھوں میں

ستر سال ہوئے جب اس نے
کھولی تھیں دُنیا میں آنکھیں
پہلے سانس کا زہر پیا تھا
بس تب سے اس کے سینے میں
سانسوں کا میلہ سا لگا ہے
اور زخموں کی ہے گلکاری

بچپن اور چھٹپن بیتا ہے
بے حد عسرت کی حالت میں

دُھوپ یتیمی کی سر پر تھی
پاؤں میں تھے غربت کے چھالے
سانسوں کی پرشور کہانی
اس کے روز و شب کی شاہد

محنت اور مشقت عادت
سب سے محبّت، سب سے شفقت
اک بیوی کا اور اِک ماں کا
فرض نبھانا اُس کی سعادت

سال ، مہینے ، لمحے بیتے
اب وہ سانسوں کے کانٹوں پر
اپنی زندہ لاش سمیٹے
کب سے خلا کو گھور رہی ہے
سانسوں کی کمزور سی ڈوری
رُوح کے قدموں سے لپٹی ہے
موت تماشہ دیکھ رہی ہے،
اس بے بس کی لاچاری کا
جانے کب وہ ہاتھ بڑھائے
رُوح کو قبض کرے اُڑ جائے

(پوریٹی، ۶؍جولائی ۱۹۹۲ء)

مقروض موت

وقت کے اس موڑ پر
جہاں زندگی اور موت گلے ملتے ہیں
تم کہاں سے آ گئیں
رفاقت کی شمع لے کر

ذرا ٹھہرو!
ابھی زندگی کا حساب چکانا ہے
اس نے جو کچھ مجھے دیا
لوٹانا ہے
میں نہیں چاہتا مقروض موت
مجھے عدم کا سکون چاہیے!

(۱۸ دسمبر ۲۰۰۱ء)

خلوتِ ناز

اس کی زلفوں کی گھٹا،
اس کی آنکھوں کے کنول
اس کے عارض کے گلاب
اس کے ہونٹوں کی شراب
اس کی سانسوں کی مہک
اس کا چاندی سا بدن
مدتیں گزریں کہ سب خاک کا پیوند ہوا

میں اسی سحر میں زندہ ہوں مگر
اس کی قربت کا نشہ باقی ہے
خلوتِ ناز کا افسوں نہیں ٹوٹا ہے ہنوز

(۹ / اکتوبر ۱۹۹۹ء)

صبحِ بہار

ابھی ابھی تو یہیں تھیں، کہاں گئی ہو تم!
تمھارے قرب کی خوشبو سے رُوح ہے سرشار
تمھاری سانس کا نغمہ نہاں سماعت میں
تمھارے لمس کا نشہ بدن میں ہے رقصاں
تمھارے عارض و گل کی زکوٰۃ لالہ و گل
کہاں گئی ہو ! یہ صبحِ بہار لوٹ نہ جائے

(۲۸/اکتوبر۱۹۹۹ء)

مکتوبِ الیہ

آج جی یہ چاہتا ہے......
پھر کسی کو خط لکھوں
اور حرفوں کو سجاؤں لالہ و گل کی طرح
اُن میں بھر دوں شوخیاں
ناشگفتہ آرزوؤں کے حسیں غنچوں کے دل کی تازگی
حرفِ مطلب تو نہ لکھوں،
ہاں چھپا کر پردۂ الفاظ میں
دھڑکنیں دِل کی مزین اس طرح کر دوں،
کہ ہوں ابہام کے معنی ہزار
بے نیازی کی ادا میں ہو نیاز

حافظؔ و خیامؔ و غالبؔ کے حسیں اشعار سے پیکر سجاؤں
عشق کے پندار کا
بے قراری کو مُصوّر کر دوں لفظوں کے سنہرے رنگ میں
ایسا خط لکھوں جسے پڑھ کر کھلیں خفتہ اُمنگوں کے کنول

اب بھی ہے دل کا وہی عالم مگر
کل مرے مکتوب کا رہتا تھا ہر لمحہ کسی کو انتظار
اور کوئی رہتا تھا ہر دم بیقرار
اب قلم خاموش ہے
کس کو خط لکھوں کہ اب کوئی نہیں مکتوب الیہ

(۲۰ر اکتوبر ۲۰۰۰ء)

افعی

کنڈلی مارے
تنہائی کا افعی کمرے میں بیٹھا ہے
سنّاٹا پھنکار رہے ہر کونے میں
ساری فضا میں زہر بھرا ہے
بھول کے بھی یاں سانس نہ لینا
چپ رہنا، غم کھاتے رہنا

(۲۱/اکتوبر ۱۹۹۹ء)

خیال و خواب

نہ دن نہ رات ، فقط وقت کا دُھندلکا ہے
خیال و خواب کی پرچھائیاں سی رقص میں ہیں
کبھی کبھی تو یہ لگتا ہے آسمانوں سے
برس رہے ہیں ستارے مرے تخیّل میں
سمیٹ کر کوئی ٹوٹے ہوئے ستاروں کو،
نچوڑتا ہے تو جگنو بکھرنے لگتے ہیں
اندھیری رات میں جنگل چمکنے لگتے ہیں

اُتر کے رفعتِ تخیّل سے کوئی جھرنا
تصوّرات کی وادی میں بہنے لگتا ہے
ہر ایک موجِ رواں لفظ بنتی جاتی ہے

نہیں ہے سمت معیّن ، خیال کے دریا،
کبھی تو بڑھ کے سمندر پہ کرتے ہیں یلغار
کبھی خود اپنے ہی مخرج کی سمت بہتے ہیں
مگر کبھی کبھی رستے میں سوکھ جاتے ہیں

زمیں سے تا بہ فلک خواب ہے دُنیا
ہزار صدیوں سے پتھریلی نیند میں ہے ہنوز
ستارے نیند میں چلتے ہیں آسمانوں پر
فقط زمین ہے بیدار ، زندگی بردوش

(۲۵ رجنوری ۲۰۰۰ء)

فرصت

پھر بند ہوئے جاتے ہیں پلکوں کے دریچے
اعضا کی تھکن مانگے ہے بستر کی رفاقت
ہلچل ہے نہ ہیجان، نہ شورش ہے نفس میں
خواہش کوئی دیتی نہیں دستک درِ دل پر
نغمہ بھی اُبھرتا نہیں کوئی رگِ جاں پر

دالان میں پَر باندھ کے بیٹھی ہے خموشی
تنہائی ہے اس گھر کے در و بام کی دربان
مدّت میں میسّر ہوئے فرصت کے یہ لمحات
بے مثل ہے، انمول ہے، یہ وقت کی سوغات

(۶ را کتوبر ۱۹۹۹ء)

سانولی شام

سانولی شام کے ہاتھوں میں مہکتے گجرے
اور جوڑے میں جنوں خیز شفق رنگ گلاب
رقص میں موجِ صبا ہے تو پرافشاں ہے شمیم
چمپئی شاخوں نے چھیڑا ہے محبت کا رباب
وقت کچھ دیر ٹھہر جا، تو یہ دلکش منظر
اپنی آنکھوں میں بسالوں کہ نظر ہو سیراب

(۲۱ رمارچ ۱۹۹۶ء)

درد کا سورج

یہ کیسا درد کا سورج اُگا ہے
شب کے سناٹے میں،
کرنیں جگمگا اُٹھیں بدن کے ریشے ریشے میں
یہ کس کی سرد مہری، بے نیازی،
آج نشتر بن کے اُتری ہے رگِ جاں میں
نہ جانے زخم تھے کتنے
ہوئے تھے مندمل جو،
وقت کے مرہم کی کاوش سے
اچانک جاگ اُٹھے، تلملا اُٹھے
بنی ہے درد کی اِک کہکشاں،
جس میں ہزاروں غم
سرِ افلاکِ احساسات رہ رہ کے چمکتے ہیں
کوئی اس درد کی لذت کو کیا سمجھے
کسی کو کیا خبر یہ درد کس کس کی امانت ہے

(۱۱ رمئی ۲۰۰۰ء)

شبِ تنہائی

تجھ کو سو رُوپ میں دیکھا ہے شبِ تنہائی
تیرا ہر عکس مرے ذہن میں رقصندہ ہے
چاندنی بن کے تو اُتری مرے آنگن میں کبھی
کبھی تاروں کے دوشالے میں سمٹ کر آئی
کبھی تو آئی ہے پہنے ہوئے خوشبو کا لباس
صورتِ برق گری میرے شبستاں میں کبھی
بن کے بادل کبھی برسی مرے غم خانے میں
کبھی آنچل میں سمیٹے ہوئے جگنو آئی
کبھی محسوس ہوا تو ہے فقط اِک آواز
یا پہاڑوں سے اُترتی ہوئی بنسی کی تان
تو کوئی جھرنا ہے تاروں کا، فلک سے گر کر،
میرے سینے کے بیاباں میں سما جاتا ہے

آج اس طرح سے آ میرے سیہ خانے میں
تجھ میں اور مجھ میں کوئی فرق ہی باقی نہ رہے
میں تری گود میں سو جاؤں شبِ تنہائی!

(۲۸؍جولائی ۲۰۰۰ء)

زندگی کا ایک اور دِن

شام ہی سے
دردکی لہریں بدن میں اُٹھ رہی تھیں بار بار
ذہن میں تھا انتشار
رُوح تھی بے چین، دل تھا بے قرار
آنکھ لگتی ہی نہ تھی
کر رہی تھی جانے کس کا انتظار
لحہ لحہ رات کے اوراق پر،
لکھ رہا تھا وقت حرفِ تابدار
بند کمرے کی فضا میں،
ایک سایہ ناچتا تھا بار بار
کشتیٔ جاں منقلب تھی بحرِ غم تھا بے کنار

آخر شب جب ستارے ٹوٹ کر بکھرے خلا میں
ہر طرف پھیلا صباحت کا غبار
دُور سے آنے لگی اللہ اکبر کی صدا
ٹل گیا آخر وہ لمحہ
جس کو کرنا تھا دل وجاں کا شکار

(۲۸ر ستمبر ۲۰۰۰ء)

قیاس

کوئی ثبوت نہ ہو پر قیاس کہتا ہے
یہ دل فریب ستارے زمیں کے ہمسائے
کبھی زمین کی صورت تھے مرکزِ ہستی

وہاں بھی بارشیں ہوتی تھیں پھول کھلتے تھے
وہاں بھی آبِ رواں آئینہ دِکھاتا تھا
وہاں بھی بادِ صبا سرسرا کے چلتی تھی
طیور گاتے تھے اور آشیاں بناتے تھے

وہاں بھی قرنوں تک آباد تھی کوئی مخلوق
سنوارتی تھی جو محنت سے چپہ چپہ کو
وہاں بھی ہوگا تمدن، وہاں کی تہذیبیں،
عروج پا کے زوال آشنا ہوئی ہوں گی
ہر ایک شے کو ہوس نے نگل لیا ہوگا

وہاں بھی قہر کی جب بجلیاں گری ہوں گی
تو زلزلوں نے پہاڑوں کو روئی کے گالے،
بنا کے، ملکِ عدم میں اُڑا دیا ہوگا
وہاں کی جھیلیں بھی بے آب ہوگئی ہوں گی
ہوا کا دم بھی وہاں گھٹ کے رہ گیا ہوگا

زمیں بھی ایک ستارہ ہے اس کی بھی مخلوق
سجا رہی ہے اُسے جانے کتنی صدیوں سے

عروج بخشا ہے اس کو سبھی کی محنت نے
چمن کھلائے ہیں تہذیب نے یہاں کیا کیا

مگر زمین بھی اب ہے زوال آمادہ
ہوس پرستوں کے لالچ کی ہو رہی ہے شکار
یہ کرہ کتنا حسیں، رقص میں ہے ہر ساعت
بغل میں بھینچ کے بیٹھے ہیں اس کو دیوانے
اور اس کی سانس گھٹی جا رہی ہے ہر لمحہ
زمیں کے سینے سے کر کے کشید اُس کا لہو،
تجوری بھرتے ہیں، اس کو بنا دیا کنگال
اُجڑتا جاتا ہے یہ گلشن بہارِ حیات

مشیت اس کو بھی بے آب کر نہ دے اِک دن
یہ دردِ تشنہ لبی سے کراہتی رہ جائے
جلا نہ دے اسے اِک دن جلال سورج کا

کوئی ثبوت نہ ہو پر قیاس کہتا ہے
یہ دلفریب ستارے زمیں کے ہمسائے
کبھی زمین کی صورت تھے مرکزِ ہستی
اب ان کے پاس نہ ہے زندگی، نہ آب و ہوا
فقط کھنڈر ہی کھنڈر، اور مہیب سناٹا

جو اُن کا حال ہے وہ ہے زمیں کا مستقبل
کوئی ثبوت نہ ہو پر قیاس کہتا ہے

(۲۷/مارچ ۲۰۰۰ء)

گھنا جنگل

گھنا جنگل،
گھنی بیلیں نہ جانے کب سے ہم آغوش،
سورج دیکھ کر اُن کو چھپا لیتا ہے منہ اپنا
گلِ تر — پنکھڑی نازک
مگر کانٹوں کے گھیرے میں
محافظ حسن کے،
انگشتِ کو سزا گستاخیوں کی دیتے رہتے ہیں
گھنا جنگل
زمین و آسماں کے درمیاں اِک سبز چادر سی
کرن چھن کر نہیں آتی
روپہلی نیم روشن جھیل، کشتی، مچھلیاں
اِک بنتِ آب اس طرح رقصاں موجِ طوفاں پر
کہ جیسے سب تماشہ ہے

(۱۴راپریل ۲۰۰۰ء)

چاندنی کا رقص

اِک عالی شان کوٹھی،
دیکھتی تھی جھیل کے شفاف آئینے میں رُوپ اپنا
صنوبر، سرو اور شمشاد پہرے دار تھے اس کے
نہا کر چاندنی میں جب نکھرتی تھی
گلاب اور موتیا، بیلا، چنبیلی، اس کو سب مل کر سجاتے تھے
مہک اُٹھتی تھی جب وہ چاندنی میں 'تاج' کی صورت
تو اِک نازک بدن، بنتِ ثریا، اِک دریچہ کھولتی تھی،
چاندنی قدموں میں اس کے لوٹ جاتی تھی
مگر وہ سر ہتھیلی پر لیے کچھ سوچنے لگتی تھی
کھو جاتی تھی خاموشی کے ساگر میں
کبھی دھیمے سُروں میں شعر کوئی گنگناتی تھی
کبھی شاید کسی کی یاد میں آنسو بہاتی تھی

سنا ہے اب وہ کوٹھی ہے، نہ پہرے دار باقی ہیں
مکیں سب کر گئے ہجرت
وہاں فولاد کا اِک کارخانہ ہے، جہاں ہتھیار ڈھلتے ہیں
مگر جب چاندنی ساگر میں آ کر رقص کرتی ہے
تو لہروں سے کسی کے گنگنانے کی
مدھر آواز آتی ہے

(۲۳ر اپریل ۲۰۰۰ء)

نئی صدی کے تناظر میں

میں سو برس کا نحیف بوڑھا
میں زندگی کے عذاب ڈھوتا رہا ہوں کب سے
منافقت، مکر، کذب و ریا، فریبِ خلوص آسا
ہزار تحفے دیے ہیں مجھ کو زمانے بھر کی رفاقتوں نے
خلوص کا کیا صلہ ملا ہے
میں سخت جاں ہوں
کہ زہر پی کر بھی جی رہا ہوں
یہ تجربے روشنی کی نئی کرن ہیں
میں زندگی کے اب آخری موڑ پر کھڑا ہوں

وہ ایک بچّہ
جو آگہی کے نئے سمندر میں غوطہ زن ہے
مجھی میں پروان چڑھ رہا ہے

(۱۴ رمئی ۲۰۰۰ء)

منزل بہ منزل

ہماری زندگی اک خواب تھی
جب خواب بکھرے
زندگی جاگی
چلی گھٹنوں کے بل
پھر لڑکھڑائی
اور استادہ ہوئی آخر
پکڑ کر وقت کی انگلی
سفر اُس کا ہوا جاری

لکھیں صدیوں نے تاریخیں
کھلے یونان و مصر و روم کے پرچم
زمینِ نینوا جاگی
خرد کے نقش اُبھرے ارضِ بابل سے

دیا رُوحانیت کا درس چین و ہند کے پُرسوز نغموں نے
عرب نے اور عجم نے زمزمے گائے
ہوائیں جب چلیں تہذیب کی مل کر
ہویدا اختلاطِ باہمی سے ہو گئیں کتنی ہی تہذیبیں
اُجالا شوخ رنگوں میں ہوا رقصاں
جلی ہر گوشۂ تاریک میں مشعل تمدن کی
ہوا جشنِ بہاراں
اور ہزاروں سال کی تاریخ سمٹی ایک مرکز پر
ہزاروں تجربوں کی آنچ میں تپ کر

زمیں اب اِک اکائی ہے
زمیں تہذیبِ رنگا رنگ کا گہوارۂ حاضر
یہ انساں کی ہزاروں سال کی محنت کا حاصل ہے

زمیں گردش میں ہر لمحہ
سفر اس کا نہیں تنہا
خلا میں ہم سفر ہیں اس کے جانے کتنے سیّارے
اُسے ہم سائیگی کا فرض بھی آخر نبھانا ہے
زمیں کی عظمتوں کو کل فلک تک پھیل جانا ہے

(۱۱؍ ستمبر ۲۰۰۰ء)

سوالوں کے بھنور

چاند تاروں نے کیا جب رقصِ اوّل
جب اچانک کونپلیں پھوٹیں
اُگے جنگل
پہاڑوں نے اُبھاری چھاتیاں
اُمڈے سمندر
زندگی ظاہر ہوئی منظر بہ منظر

توڑ کر پتھر کی چھاتی
بوند اِک پانی کی نکلی
بن کے چشمہ گنگنائی
اور جھرنا بن کے پھیلی
اور پھر دریا کی صورت ایک انجانے سفر پر چل پڑی وہ

جب عناصر مل کے باہم
دیکھ کر آبِ رواں میں شکل اپنی
ہو گئے وارفتہ خود اپنی ادا پر
زندگی نے شکل پائی

اور بے ہنگم ہواؤں نے زمیں کو روند ڈالا
بھوک کا احساس جاگا
اور غذا بننے لگے سب پیڑ پودے
اور بے ہنگم ہیولے
صورتیں اپنی بدلتے
آدمی کی شکل تک جب آ گئے تو،
زندگی کا سوز جاگا
آدمی حیران، ششدر
بحر و بر کو دیکھتا تھا
کون ہوں میں —؟
اور یہ سب کیا!
اور کیوں ہے؟

وقت گزرا
اور لمحے، سال، صدیاں اور قرن کتنے ہی بیتے
رُونما ہوتی رہیں تبدیلیاں بھی،
اس جہانِ آب و گِل میں
آدمی لیکن کھڑا ہے
اب بھی بنیادی سوالوں کے بھنور میں
کون ہوں میں؟
اور یہ سب کیا!
اور کیوں ہے؟

(۲۰/اکتوبر ۲۰۰۰ء)

آگہی! کوئی عقیدہ کوئی خواب!

آگہی!
کیا کیا تُو نے
تصور کے محل توڑ دیے
ایک جنت تھی تخیل کے سمن زاروں میں
خواب ہی خواب تھے
اور رُوح تھی خوابوں کے نشے میں سرشار
تُو نے سب خواب ہی آنکھوں سے مری چھین لیے
تُو نے صدیوں کے عقائد کو کیا ہے مسمار
زلزلے بو دیئے ایقان کی بنیادوں میں
کوئی دیوار نہیں اب ایسی
جس کے سائے میں سکوں مل جائے

دُھوپ ہی دُھوپ،
حقائق کی کڑی دُھوپ سے جل اُٹھے دماغ
جاگ اُٹھے ہیں سوالات کے جنگل دِل میں
اور نہیں جائے پناہ

آگہی!
کہ تو حقیقت کی ہے پروردہ مگر
خود ترے پاس نہیں میرے سوالوں کا جواب
ہر جواب اور سوالوں کی نئی فصل اُگا دیتا ہے
فہم و اِدراک میں تشکیک کے کانٹوں کی نمو جاری ہے

آگہی!
میں کہ انسان ہوں، احساس کا پیکر ہوں میں
تیری عظمت بھی مسلّم ہے مگر
مجھ سے مت چھین یہ سرمایۂ احساسِ جمال
عقل و دانش کے چراغوں میں نہیں روشنیٔ خواب و خیال
آگہی! کوئی عقیدہ کوئی خواب
جاگتے جاگتے صدیاں بیتیں
نیند اب آنکھوں میں آنے کے لیے ہے بیتاب

(۲۵ر فروری ۲۰۰۱ء)

ڈھلتی دھوپ

ہاں! یہ بیشک میرا گھر ہے
جس کی دیواریں شکستہ اور چھت ہے منہدم
جس کے ملبے میں دبا ہے میرا بچپن
میری گیندیں، گلی ڈنڈا اور کھڑاؤں
زندگی گزری ہے لیکن اس قدر پر پیچ راہوں سے کہ اب
ہے یہ سب کچھ دُھندلے دُھندلے نقشِ ماضی کی طرح بے جاں سا

کیوں مگر یہ گھر، مرے خوابوں میں آ کر کرتا ہے نیندیں حرام!!
منہدم ہوتا ہے میری رُوح و جاں میں بار بار
منہدم ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی ماں کا وجود،
اور بہن کا پیار، نانی کا دُلار،
باپ کی شفقت کے پھول

یاد آتی ہے وہ مسجد
جس کے مُلّا نے پڑھایا قاعدہ

اور وہ مکتب جس میں سیکھی تھی الف بے اور گنتی جو کبھی بھولا نہیں
اور وہ اسکول جس کی بینچوں پر
نام لکھتا تھا میں اپنا کھردرے الفاظ میں
اور وہ بجلی کا کھمبا — روشنی میں جس کی پڑھتا تھا کتاب
اور کتنے ہم سبق
ساتھ جن کے کھیلنا، لڑنا، جھگڑنا روز کا معمول تھا
یاد آتا ہے یہ سب اِک فلم کے دلچسپ منظر کی طرح
حافظے میں چند لہریں سی اُبھرتی ہیں فقط
جیسے یہ سب وقت کی اِک دُھوپ تھی جو ڈھل گئی

(۷ر ستمبر ۲۰۰۱ء)

چہرہ

مجھے بچپن کا چہرہ یاد ہے معصوم سا چہرہ
ہزاروں ملگجی سی خواہشیں پلکوں کے سائے ہیں
اُداسی کی تہیں سی سانولی رنگت کے پردے میں
لبوں پر پیاس انجانی سی،
اور آنکھوں میں جلتی بجھتی حیرانی

وہ چہرہ ہو چکا ہے خواب،
جب بھی روبرو ہوتا ہے آئینہ
نظر آتا ہے اِک چہرہ کہ جس پر سو خراشیں ہیں
لبوں پر تلخ و شیریں ذائقوں کی پپڑیاں! آنکھوں میں خالی پن
ثوابوں اور گناہوں کی بہت سی سلوٹیں اُبھری ہیں ماتھے پر

مرا دِل ہو کے حیراں آئینے سے پوچھتا ہے۔
کون ہے تجھ میں!
بہت اپنا سا، پھر بھی اجنبی جیسا
یہ آخر کس کا چہرہ ہے!
یہ آخر کس کا چہرہ ہے!!

(۷ر جنوری ۲۰۰۲ء)

خستہ عمارت

یہ خستہ عمارت
ستّرا ٹھتّر برس ہے پرانی
دراڑیں ہیں دیواروں میں،
اور پلستر اُکھڑنے لگا ہے
کڑی تختے اپنی جگہ سے کھسکنے لگے ہیں
وہ چھجا جُھکا جا رہا ہے
اچانک کہیں گر نہ جائے کسی پر
یہاں کل تھے ہنگامے،
بچوّں کی کلکاریاں،
چوڑیوں کی کھنک،
قہقہوں کی بہاریں
مگر اب یہاں کوئی آتا نہیں ہے
ہوائے حوادث کے رُخ پر عمارت یہ تنہا کھڑی ہے
زمیں بوس ہو جائے کب کون جانے

(۲۰ر دسمبر ۲۰۰۱ء)

سفر سے پہلے

یہ جسم تو ادھورا ہے ، خواہش نہ ولولے
ٹھہرو میں اپنی ذات کے ٹکڑے سمیٹ لوں

بچپن کا اِک گھروندا تھا اور اس کے طاق میں
میں نے سجا کے رکھی تھیں اپنی شرارتیں
دو چار بول پیار کے، کچھ جھڑکیوں کے ساتھ،
جن کے بغیر میرا لڑکپن ادھورا ہے،
موجود ہوں گے اب بھی وطن کی ہواؤں میں

جس کارزارِ درد سے گزری ہے زندگی
اس کے ہر ایک موڑ پہ جی کا زیاں ہوا
طے کی ہیں ذوق وشوق میں کتنی ہی منزلیں
گم ہو گئے جو راہ میں لیکن وہ ہمسفر!
منسوب تھے جو مجھ سے مری ذات کے تھے عکس

وہ زخم زخم بکھرے ہیں جانے کہاں کہاں
مل جائے گر سمیٹ لوں میں اُن کی گردِ پا

مرجھا گئے جو وعدۂ فردا کے شوخ پھول
اُن کی مہک کا بادِ صبا دے گی کچھ پتہ
جانے کہاں کھڑے ہیں وہ لمحاتِ انتظار
اِک ہم نفس کی راہ میں ارض و سما کے بیچ
اُن کے بغیر ذات مکمل نہیں مری

اس عرصۂ حیات میں کیا کچھ نہیں مِلا
ہمدردیاں ، خلوص ، محبّت ، نوازشیں
افواہیں ، بدگمانیاں ، الزام ، سازشیں
بدنامیوں کے داغ بھی ، شہرت کے تاج بھی
رُتبہ عجیب بخشا ہے مجھ کو سماج نے
سب کچھ یہ میری عمرِ رواں کا اثاثہ ہے
یہ جسم تو ادھورا ہے ، لازم ہے گر سفر
ٹھہرو! میں اپنی ذات کے ٹکڑے سمیٹ لوں!

(۲۹/اکتوبر ۲۰۰۰ء)

زندگی کے سائے میں

یہ کیوں سوچیں!
ہماری عمر کیا ہے، اور کب تک زندہ رہنا ہے!!

گزرتی ہے جو ساعت چھوڑ جاتی ہے نقوش اپنے
اُڑا کر اُن کو لے جاتی ہے لیکن وقت کی آندھی
جو نقشِ معتبر ہو، بس وہ ساعت زندہ رہتی ہے
وہی تاریخ بنتی ہے، بدل جاتی ہے صدیوں میں

نہیں ممکن گھڑی کی سوئیوں سے ناپنا عمرِ گریزاں کو
کسی کو بھی نہیں معلوم کس لمحے کی کتنی عمر ہوتی ہے
کبھی سو سال جی کر بھی کسی کو معتبر لمحہ نہیں ملتا
کبھی دو چار دن ہی نقشِ دائم چھوڑ جاتے ہیں

ہمارا کام جب تک زندگی ہے، سانس لینا ہے
مسلسل شورشِ طوفاں میں اپنی ناؤ کھینا ہے

(۲؍فروری۲۰۰۲ء)

مشورے

یہ مت لکھو کہ تم تنہا کھڑے ہو دھوپ کے بن میں
یہ سوچو تم نے کتنے پیڑ صحرا میں اُگائے ہیں
اور ان پیڑوں پہ کتنے پھول کھل کر مسکرائے ہیں
یہ مت لکھو تمھیں نسبت ہے مٹّی کے گھروندوں سے
یہ سوچو کتنے محلوں سے تمھیں پیغام آئے ہیں
تمھارے خواب کس کس نے نگاہوں میں سجائے ہیں
یہ مت لکھو کہ کتنے دوستوں نے بے وفائی کی
یہ سوچو کیسے کیسے گل رُخوں نے ناز اُٹھائے ہیں
تمھارے اشکِ حسرت اپنے دامن میں سجائے ہیں
یہ مت لکھو تمھیں کچھ کور چشموں نے نہ پہچانا
یہ سوچو تم نے علم و فضل کے دریا بہائے ہیں
تمھاری شوخیٔ اشعار نے طوفاں جگائے ہیں
اگر لکھو تو یہ لکھو کہ تم ہو خود سے بیگانہ
جو گردش میں سدا رہتا ہے تم ہو ایسا پیمانہ

(۱۸ر فروری ۲۰۰۲ء)

وہ رقص میں ہے

وہ رقص میں ہے
نظر ٹھہرتی نہیں ہے اس پر
خموش بجلی
چمک چمک کر
تھرک تھرک کر
سمٹ سمٹ کر
بکھر بکھر کر
ہزار افسانے کہہ رہی ہے
بدن کا ہر انگ بولتا ہے
بھوؤں کی جنبش میں سحر جیسے

اور آنکھیں جذبات کی زباں ہیں
کبھی تحیّر، کبھی تکبّر
کبھی تحمّل، کبھی تجمّل

کبھی محبت، کبھی ہے نفرت
کبھی خوشامد، کبھی شرارت
کبھی ہے غصہ، کبھی شکایت
کبھی ہے اندازِ خودنمائی
کبھی ہے عجز اور خاکساری
کبھی جنوں ہے
کبھی فسوں ہے

بدن کی شوخی
بہار کے زاویے سجائے
جگائے فتنے
دِلوں میں طوفاں نئے اُٹھائے
کلائیاں
اُنگلیاں
کمر اور ساقِ سیمیں

نئی اداؤں سے شوخ پیکر نئے بنائیں
فضا میں بانہوں کے قوس منظر نئے سجائیں
جب آئے گردش میں یہ سراپا
زمین جھومے
فلک کے تاروں کو وجد آئے
لچک لچک جائے جسمِ نازک کمان بن کر
جگائے قوسِ قزح کا منظر

ڈھلک ڈھلک جائے سر سے آنچل
چھلک چھلک جائیں جام، صہبائے بے خودی کے
ہر ایک لمحہ جو گردشیں تیز ہوتی جائیں
بدن کے طائر ہوا میں پرواز کرتے جائیں
قدم قدم گھنگھروؤں کی جھنکار
چھنن چھنا چھن، چھنن چھنا چھن

زمیں کی ہم رقص ہے وہ کب سے
محبتوں کا نیا ستارہ
بسیط اور بے صدا خلا میں
وہ زندگی کا ہے استعارہ
چھنن چھنا چھن، چھنن چھنا چھن

(۲۵ر فروری ۲۰۰۳ء)

پتّھروں کا شہر

کسے آواز دوں اس گونگے اور بہروں کی بستی میں
مری آواز بھی شاید معلق ہو گئی،
پتھرا گئی ہے،
لوٹ کر آئی نہیں میری سماعت تک

یہ بستی ہے کہ ویرانہ
یہ دُنیا پتھروں کی،
کوہِ استبداد سے اس دور کے قہّار آذر نے تراشی ہے
یہ لگتا ہے — ہر اک منظر
اچانک منجمد ہو کر
جہاں بھی تھا وہیں پر ہو گیا پتّھر

وہ ماں ہے،
اُس کا بچّہ گود میں چھاتی سے چمٹا ہے
سکوں ہے مامتا کا اس کے چہرے پر

وہ ہیں دُلھا دُلہن اِک سیج پر،
بانہیں اُٹھی ہی رہ گئی ہیں اُن کی ملنے کو

وہ اِک بچہ،
نوالہ ہاتھ میں اس کے مگر منہ تک نہیں پہنچا
گلابوں کے مہکتے کُنج میں وہ دو دھڑکتے دِل
مصوّر ہو گیا بوسہ — یہ قربت بن گئی پتھر

وہ عورت پیکرِ مظلومیت
اِک چیخ اس کے منہ میں اٹکی ہے
اسے پکڑے ہوئے دو ہاتھ
اور اِک ہاتھ میں ماچس

وہ ہے اسکول،
سارے بچّے نکلے ہیں کلاسوں سے
کوئی ہنستا ہوا چہرہ
کوئی سنجیدہ سنجیدہ
کسی کی پیٹھ پر بستہ
کسی کے ہاتھ میں پانی کی اِک بوتل

وہ دو لڑکے ہیں کشتم کشتی
کچھ بچّے اُنھیں شہ دے رہے ہیں، اور کچھ ہیں بے تعلق سے
یہ منظر کتنا زندہ ہے، مگر ہے منجمد سارا

وہ اِک بیمار بڑھیا ہڈّیوں کا ایک ڈھانچہ سا
پیالی ہے دوا کی نرس کے ہاتھوں میں
کیا دلدوز منظر ہے

وہ بے گور و کفن اِک لاش
جس کا سر کچل ڈالا ہے شاید تیز موٹر نے
پڑی ہے بیچ چوراہے پہ
اُس کے گرد دو کتّے
کھڑے ہیں نوچنے کو بوٹیاں اس کی
مگر سب ہو گئے پتھّر

یہ شہرِ سنگ ہے منظر بہ منظر دُور تک پھیلا
نہ جانے کب سوا نیزے پہ سورج آئے گا
اور برف پگھلے گی
یہ پتھّر منہ سے بولیں گے

(۲۰ رفروری ۲۰۰۲ء)

جنگل

خواہشوں کا یہ گھنا جنگل، کہ جس میں،
دُھوپ بھی چھن کر نہیں آتی،
اندھیرے کی ہر اک سُو حکمرانی،
سرسراتے پھرتے ہیں جھونکے ہوا کے
پیڑ آپس میں ہیں سب دست و گریباں
مختلف شاخوں کی بانہیں
دوسروں کی گردنوں میں ہیں حمائل
جرم کا احساس بھی اور لذّتِ آسودگی بھی
ذائقے حرص و ہوس کے سب کو چکھنے کی ہے عادت
دھیرے دھیرے پھیلتا جاتا ہے جنگل

اور اس میدان کی وُسعت سکڑتی جا رہی ہے
جس میں ہیں شفّاف چشمے
دُھوپ کا آنچل پَرافشاں
پیار کے گلشن، قناعت کے دبستاں
جسم و جاں کو فرحتیں بخشے جو، وہ خوشبو فراواں
دھیرے دھیرے بڑھتا جاتا ہے گھنا جنگل اندھیری خواہشوں کا

(۲۸ر فروری ۲۰۰۲ء)

کبھی انسان نہیں مرتا

شہیدانِ وطن!
قبروں سے اُٹھ کر دو گھڑی آؤ
تمھیں سابرمتی کے آشرم کی آتما آواز دیتی ہے
تمھیں باپو کی دھرتی خون میں ڈوبے ہوئے منظر دِکھاتی ہے

یہ چرواہے، محافظ اپنے گلّے کے
خود اپنی بکریوں، بھیڑوں کو، بچھڑوں کو
درندوں کی طرح جبڑوں سے اپنے پھاڑتے ہیں،
پھر تلک کرتے ہیں خوں سے،
اور لہو معصوم جانوں کا غٹا غٹ پی کے تانڈو ناچ کرتے ہیں

شہیدانِ وطن!
کل سامراجی بھیڑیوں کا دور تھا، لیکن
یہاں اب تو پشاچوں کی حکومت ہے
وہ زندہ بستیاں جن میں تھے کل تک قہقہے بچوں کے،
دوشیزاؤں کی اٹکھیلیاں، نغمے محبت کے
مِلیں اور کارخانے،

مدرسے، اسکول اور بازار بارونق
اذانیں تھیں، نمازیں تھیں
دُعائیں، منّتیں، سجدے
ہوئے سب رائیگاں یکسر
پشاچوں اور درندوں نے
بہایا خون معصوموں کا، لوٹیں عصمتیں،
گھر گھر لگائی آگ، بھڑکے موت کے شعلے
مساجد اور مقابر کو کیا مسمار
بے حرمت کیے قرآں،
جلایا زندہ انسانوں کو،
قتلِ عام کر ڈالا
لگا کر دھرم کا نعرہ

جو کل تک بستیاں تھیں،
اب ہیں قبرستان سے بدتر
کبھی تم نے نہ دیکھے ہوں گے ایسے رُوح فرسا، بدنما منظر

شہیدانِ وطن!
اب لوٹ جاؤ اپنی قبروں میں
وہیں آرام سے ہو تم
درندے کیا خبر تم پر بھی جھپٹیں پا کے مانس گندھ

تم سے چھین لیں قبروں کی دو دو گز زمینیں بھی

شہیدانِ وطن!
بابو سے جا کر کچھ نہ کہنا، ان کو دُکھ ہوگا
اُنھیں محسوس ہوگا
گوڈ سے نے تو فقط دو گولیاں کمزور سینے میں اُتاری تھیں
مگر میرے وطن کے سورماؤں نے،
ہزاروں گولیوں سے کردیا چھلنی مرا سینہ
مرے سپنے تو زندہ تھے،
اُنھیں بھی بھسم کر ڈالا
شہیدانِ وطن! بابو سے جا کر کچھ نہ کہنا، ان کو دُکھ ہوگا

ہمارا خوں بہا ہے اپنی دھرتی پر
اسی دھرتی پہ اپنے خون سے تعمیر کرنی ہے نئی دُنیا
عقیدہ ہے ہمارا
شیطنت کرتی ہے اِک دن خودکشی اپنے ہی خنجر سے
اگر ایمان ہو پختہ
کبھی انساں نہیں مرتا
کبھی انساں ہیں مرتا

(۱۶ر مئی ۲۰۰۲ء)

ربطِ باہم

وہ ربّ العالمیں ہے، وسعتِ کونین ہے اُس کی
ہزاروں جانے انجانے جہاں اس نے بنائے ہیں
نہ جانے کتنے سورج اور سیارے خلا میں رقص کرتے ہیں
وہ ہوں مٹّی کے تودے، غار یا کہسار، سب اس نے
عجائب خانۂ عالم میں اس صورت سجائے ہیں
کہ ہر پیکر ہے تجریدی عمل اِک دستِ قدرت کا
ہر اِک سیّارۂ رقصاں کی گردش میں توازن ہے
کشش سے ربطِ باہم کی
کشش اِک ڈور ہے جس کا سرا ہے دستِ قدرت میں
نچاتا ہے انھیں اس طرح وہ حسنِ تدبّر سے
کہ ٹکراتے نہیں آپس میں، بس نظریں ملاتے ہیں
رفاقت، دوستی، ہمسائیگی کے راگ گاتے ہیں
خلا میں بھیڑ ہے کتنی، مگر یہ سارے سیّارے
ازل سے ہیں سفر میں منزلِ بے نام کی جانب

زمیں بھی ایک سیّارہ ہے، جس کو خالقِ کُل نے
کچھ اس صورت سنوارا ہے کہ اس میں زندگی کی رونقیں بھر دیں
بنایا اس کو افضل ہر ستارے سے
دیا تحفہ ہواؤں کا
پہاڑوں پر بچھائے برف کے گالے
اُتاریں ندیاں،

بل کھا کے جو ساگر میں مل جائیں
بھرے دامن میں اس کے پھول پھل
لعل و گہر، رعنائیِ گلشن
یہ ساری نعمتیں اس نے زمیں کے لاڈلے انسان کو بخشیں
عطا پر اپنے خالق کی زمیں کو جس قدر بھی ناز ہو، کم ہے

پر اس سیارے کے باسی
بُھلا بیٹھے ہیں قدرت کے نظامِ ربطِ باہم کو
بھٹک کر سیدھے رستوں سے وہ ٹکراتے ہیں آپس میں
انھیں بخشی گئی تھیں نعمتیں انسانیت کے ارفع و اعلیٰ مقاصد کی
مگر وہ بغض و نفرت، حرص و لالچ کی اندھیری راہ پر چل کر
ہوئے جاتے ہیں یکسر دُور منزل سے

اٹل قانونِ قدرت ہے کہ راہِ راست پر چلیے
نظامِ ربطِ باہم سے بغاوت موت کو آواز دینا ہے

کہیں ایسا نہ ہو، انسان کی یہ لغزشِ بے جا
زمیں کو ہی نہ لے ڈُوبے
چلے پھر تیز آندھی
زلزلے آئیں……
توازن ہی بگڑ جائے
بکھر جائے خلا کے دشت میں آخر یہ سیارہ

(۲۵؍اگست ۲۰۰۲ء)

بدصورتی کی جمالیات

کھنڈر ویران،
ماضی کے پرانے قلعہ کا ملبہ
کنگورے، بُرجیاں، اوندھے پڑے ہیں ایک کونے میں
ادھر محراب اِک ٹوٹی ہوئی
کہتی ہے آنے جانے والوں سے
کبھی مسجد تھا یہ گوشہ
کنواں تھا یہ،
مگر اب اَٹ چکا ہے، مینڈکوں، سانپوں کا مسکن ہے
اُدھر سوکھا ہوا اِک پیڑ کیکر کا
نکیلے تیز کانٹے جس کی قوت ہیں
کھڑا ہے زد پہ طوفانی ہواؤں کے

وہ اِک بوڑھا
بہت سی جھرّیاں ہیں جس کے ماتھے پر
سڑک کے اِک کنارے پر پڑا ہے ہاتھ پھیلائے
گزرتے شخص نے اُس کی ہتھیلی پر رکھا سکہ،
اور اپنے دل میں سوچا،
میں بھی اپنے دور کا ہوں حاتمؔ طائی

وہ قبرستان جس میں ہیں کئی بیٹھی ہوئی قبریں
سیہ فام ایک ڈاکو اس طرف آیا،
چھپا کر رکھ گیا اس قبر میں لوٹی ہوئی دولت

شکستہ جھونپڑی،
اندر جھلنگے پر پڑی ہے ایک عورت
ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ سا

اور اِک چھوٹا سا بچّہ، کیچ میں لت پت،
مگن ہے کھیل میں جیسے یہ سب دُنیا اسی کی ہے،
علامت زندگی کی ہے۔

(۳ر ستمبر ۲۰۰۲ء)

اُس پار

ہمارے ساتھ کے سب لوگ جا چکے، اب ہم
کنارے بیٹھے ہیں، کشتی کے انتظار میں ہیں،
جو لے چلے ہمیں دریائے درد کے اُس پار،
جہاں سکون ہے، بے دست و پا ہیں ہوش و خرد
نہیں ہے عقل کا فتنہ، نہ جائے جنبشِ لب
فقط سکوت —— فقط بے پناہ سنّاٹا

(دسمبر ۲۰۰۲ء)

کبھی کبھی

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے
آنسو دل میں ٹھہر جاتے ہیں
آنکھیں ویراں ہوجاتی ہیں
گھٹتی ہے آواز گلے میں
ہاتھ قلم سے گھبراتے ہیں

قلب و نظر کی یہ کیفیت
رُوح پہ جب طاری ہوتی ہے
دُھندلاتے ہیں سب آئینے
اور میں یادوں کے کاندھوں پر
سر رکھے سوتا رہتا ہوں

گم شدہ قلم

بہت دِنوں میں اچانک قلم وہ ہاتھ آیا
جو رکھ کے بھول گیا تھا میں طاقِ نسیاں میں
قلم جو بھول گیا میری انگلیوں کی گرفت
قلم جو میرے اشاروں پر سر جھکاتا تھا
قلم جو میرے خیالوں کے ساتھ چلتا تھا
قلم جو سوچ کے معنی مجھے بتاتا تھا
قلم میں اب وہ جنبش نہ ذوق و شوقِ خرام

وہ جس سے لکھتا میں روز پیار کے عنواں
حکایتِ لب و رُخسار و نکہتِ گیسو
کسی کا ناز سے نظریں چرا کے شرمانا
پھر اس کے بعد شرارت سے کھلکھلا پڑنا
جواب لکھتا تھا خط کا، تو میرے لفظوں میں
دھڑکتا رہتا تھا دِل ، اور قلم کی ہر جنبش
مزاجِ یار کی تصویر کھینچ دیتی تھی
قلم شبیہ سے اس کی بہت ہی تھا مانوس

بھری بہار میں آیا خزاں کا اِک جھونکا
شبیہ کھو گئی وہ موت کے اندھیروں میں
اب اس کے ناز و ادا، قہقہوں بھری شامیں
جمالِ گیسو و عارض، نگاہِ کیف افزا
سبھی ہیں ایک تصوّر، سبھی ہیں خواب و خیال
مرا وجود بھی خود بن گیا ہے ایک سوال
نہ میری فکر میں وہ تازگی نہ وہ شوخی
ہے اِرد گرد مرے اِک غبارِ تنہائی
حروف مجھ سے گریزاں، خیال پژمردہ
تھکا تھکا ہے مرا ذہن، دِل ہے افسردہ

بہت دِنوں میں اچانک قلم وہ ہاتھ آیا
جو رکھ کے بھول گیا تھا میں طاقِ نسیاں میں

قلم اُٹھا تو لیا ہے، مگر لکھوں میں کیا؟

تخریب

چلو اُٹھائیں وہ لاشہ جو اَب ہے لاوارث
ہزاروں سال کی تہذیب کا ہے یہ تابوت
سمیرین کا عروج اور تمدنِ بابل
جلالِ نینوا ، ایسیرین کے رامش و رنگ
ہے کربلا کا تقدس ، نجف کی عظمت بھی
ہے اس میں بصرہ و بغداد کا جلال و جمال
ہزاروں سال کی تہذیب کا ہے یہ تابوت

وہ قوم عمر ہے مشکل سے جس کی پانچ سو سال
وہ قوم جس کی ہے بنیاد صرف مادّیت
ہنوز وحشی ہے وہ قوم زر پرستوں کی
جسے خبر نہیں تہذیب کس کو کہتے ہیں
نہیں ہے علم کہ تاریخ کے ہیں معنی کیا!
وہ قوم تیغِ ستم لے کے جارحانہ بڑھی
نوادرات کی جنت کو کر دیا مسمار

یہ کارنامۂ تخریب آدمیت ہے
کھلا ، زمین پہ شیطان کی حکومت ہے

پھر وہی تجربہ

پھر وہی تجربہ
سانس اندر سے رُک رُک کے اُوپر اُٹھے
جیسے مٹھی میں باندھے کوئی، چھوڑ دے،
اور پھر باندھ لے
اور پھر چھوڑ دے
اِک دھواں،
ہانپتا، کانپتا، چیختا، کھانستا
گھیر لے پورے اعصاب کو
ایسا محسوس ہو
موت اور زیست کے درمیاں ہوں معلّق، مگر
سانس کی آس جب ٹوٹنے سی لگے
پھر کوئی ڈور کو باندھ دے
پھر وہی تجربہ

کارزارِ زندگی

موت کی دہشت میرے دل پر
طاری کرنے کی کوشش میں
کس نے آخر میرے سر پر
اِک تلوار سی لٹکا دی ہے

شاید اس کو علم نہیں ہے
بچپن سے مر مر کے میں نے
رونا ، ہنسنا ، جینا سیکھا
بھوک مری خوراک بنی ہے
پیاس بڑھی تو پینا سیکھا
انگاروں پر چلنا سیکھا
بیہڑ جنگل کے کانٹوں نے
آگے بڑھنے کی ہمت دی
خون دیا پیاسی دھرتی کو
زخموں نے ایسی طاقت دی

آخر محنت کا پھل پایا
کانٹوں کے بیہڑ جنگل میں
گل بوٹوں کا موسم آیا
دشت و دریا ، کوہ و صحرا
تند بگولے ، ریت کے میداں
سات سمندر ، بپھرے طوفاں
پار کیے سب تنہا میں نے
منزل منزل بڑھتے بڑھتے
مشکل سے آیا ہے جینا
غاصب دُنیا کے ہاتھوں سے
اپنا حصّہ بڑھ کر چھینا

ویسے موت ہے ایک حقیقت
بے معنی ہے اس سے ڈرنا
جب آنا ہے آجائے گی
سانس کی گٹھری لے جائے گی

آپریشن[1] سے پہلے

تم ذرا ٹھہرو ، ابھی موت سے مل کر آیا
آپریشن کی نئی میز بلاتی ہے مجھے
آگ سینے میں دہکتی ہے ، لرزتا ہے بدن
زندگی روز نیا زہر پلاتی ہے مجھے
کیسے کہہ دوں کہ ہوا مجھ سے خفا ہے لیکن
ہر نفس درد کا اِک راگ سناتی ہے مجھے
رُوح بے چین سی رہتی ہے مرے سینے میں
جانے انجانے عذابوں سے ڈراتی ہے مجھے
وادیٔ درد سے گزرا ہوں کئی بار سروشؔ
یاد بیتے ہوئے ہر لمحے کی آتی ہے مجھے
امتحاں اور سہی جرأتِ رندانہ کا
زندگی اب بھی نئے خواب دِکھاتی ہے مجھے
تم ذرا ٹھہرو ، ابھی موت سے مل کر آیا
آپریشن کی نئی میز بلاتی ہے مجھے

جون ۲۰۰۳ء

[1] کینسر کا آپریشن

مرے گلزارِ سینے میں جنوں کی لالہ کاری ہے

ہوا کا آشیاں، سانسوں کا پنجرہ ہے مرا سینہ
مرے گلزارِ سینے میں جنوں کی لالہ کاری ہے
خوشی کے پھول کھلتے ہیں، غموں کے خار پلتے ہیں
صبا انفاس سے سیراب کرتی ہے اسے ہر لحظہ، ہر لمحہ

نہ جانے کس نفس کی نوک تھی مسموم، جب اُتری وہ سینے میں
بنا کر نقش اک موہوم، جا کر سو گئی پھولوں کے پہلو میں

ہوا پھر یوں
ہوا کے آشیانے میں سموم آئی، صبا بن کر
گلوں کا رنگ پھیکا پڑ گیا، کانٹے بنے خنجر
بنا گلزارِ سینہ درد کا جنگل

تجسّس کی نگاہیں،
گھُپ اندھیروں میں اُتر کر،
نقطۂ موہوم کو پھر ڈھونڈنے نکلیں
کہ جو گلزارِ سینے کی زمیں میں ہو گئی پیوست،
پھولوں کو جلا ڈالا
صبا کو پی گیا، کلیاں کھلاتی جو اُمنگوں کی
ہوا محسوس، جسم و جاں کے سارے چاند سورج بجھنے والے ہیں
تجسّس تھا تعاقب میں

مگر فتنہ بھی تھا پُر فن
رہا کچھ دیر تک یہ کھیل بھی جاری
تجسس کی نگاہوں کے شکنجے نے،
بلآخر کس لیا مسموم فتنے کو
مٹا ڈالا، کیا نابود اس کے کالے سائے کو

مرے گلزار سینے میں جنوں کی لالہ کاری ہے
جنوں کے رنگ میں لاکھوں،
مگر سب زندگی کے عکسِ روشن ہیں

(میٹرو ہسپتال، نوئیڈا)

ایک ٹکڑا درد

آج تو شام سے زخموں میں بہت سوزش ہے
آج کی رات مجھے نیند نہیں آئے گی

کہیں اندر سے لپکتا ہے کوئی شعلہ سا
درد رہ رہ کے چٹکتا ہے، نمو پاتا ہے
ایک احساس کہ پہلو میں ہے زخموں کی لکیر
قمقمے درد کے جلتے ہیں، کبھی بجھتے ہیں
تیرگی کا تو ہر اک لمحہ قیامت ٹھہرا

آزمائش ہے ترے ضبط کی اے قلبِ تپاں
آج کی رات مجھے نیند نہیں آئے گی

کیموتھیریپی

محسوس نہیں ہوا تھا ، لیکن
شعلے سے اُتر گئے رگوں میں
جلتا ہے لہو کا ریشہ ریشہ
ہونٹوں پہ ہے تشنگی کا پہرہ

'کیمو' کا مزاج بھی عجب ہے
اُترے جو بدن کے جنگلوں میں
ہوں پھول کہ خار، سب کھلسائے
امیدِ بہار پھر بھی کہلائے

(دسمبر ۲۰۰۳ء)

قلم قبیلہ

جہادِ قلم

اگر بڑھا ہے کبھی فتنہ و فسادِ قلم
بچایا اہلِ صداقت نے اعتمادِ قلم
قلم کی کاٹ قلم ہے، قلم ہے تیغِ خرد
جہادِ سیف سے کم تر نہیں جہادِ قلم

قلم کی نوک پہ تہذیب کے ہزاروں سال
اُلٹ دے سلطنتیں برشِ قلم کا جلال
قلم کا نام ارسطو ہے، رازیؔ و لقمانؔ
قلم نے بخشے ہیں دُنیا کو رومیؔ و اقبالؔ
قلم رفیقِ صداقت، قلم ہے ذکرِ جمیل
قلم ہے حرفِ محبّت، قلم نوائے خلیلؑ
اُٹھا لیا کبھی شیطان نے جو بھولے سے
تو پاسبانِ قلم نے کیا ہے اس کو ذلیل

قلم وہ باعثِ رحمت جو حرفِ حق لکھے
کتابِ فکر و نظر کا نیا ورق لکھے

(۲۹/مارچ ۱۹۹۴ء)

(رشدی کی کتاب کے جواب میں ڈاکٹر رفیق زکریا کی کتاب "محمد اور قرآن" کے اجراء کے موقع پر)

نذرِ حضرت امیر خسروؔ

امیر خسروؔ!
نظام کے لاڈلے، چہیتے
تمھاری عظمت ہے ایک خوشبو
جو علم و حکمت کے پَر لگا کر
اُڑی ہے ہر گوشۂ جہاں میں،
عرب، عجم میں
دیارِ مغرب میں،
ایشیا کے ہر ایک خطّے میں جس کے باعث
مہک رہا ہے تمام عالم
تمھارے اشعار میں حقائق ہیں معرفت کے
تمھارے الفاظ میں مہک ہے دھرتی کی،
اور خوشبو ہے اپنے باغوں کی،
کوک کوئل کی، اور بلبل کی راگنی ہے

تمھارے شبدوں میں
شام پنگھٹ کی
دھوپ کھیتوں کی
دلکشی صبحِ زندگی کی
تمھاری نظمیں ورق ہیں تاریخ عہدِ وسطیٰ کے،
زندگی کی ہماہمی، کشمکش اور جنگ وجدل کے شاہد
تمھارے نغمے ہیں زندگی کے نئے ترانے
نئے نئے راگ ہند وایران کی ثقافت کے آئینے ہیں
تمھاری بابت کہا تھا شیراز کے سخنور نے،
طوطیٔ ہند امیر خسروؔ ہے آبروہند کے چمن کی
کئی صدی بعد آج بھی وہ سخن ہے سعدیؔ کا اِک حقیقت
وہ سارے شہزادے اور سلاطین،
جن کے تم نے قصیدے لکھے
چھُپے ہیں اب گردِ روز وشب میں
تمھاری عظمت ہے روز افزوں
حوالے سے اپنے فکر وفن کے
پیا ہے آبِ حیات تم نے

(۳۱ر جنوری ۲۰۰۲ء)

نذرِ سرسیّد

اور پھر یوں ہوا
آخری کیل ٹھوکی گئی جب کہ تابوت میں مغلیہ دَور کے
موت ارزاں ہوئی قتل و غارت کے بازار میں
تیغِ افرنگ نے سر قلم کر کے لٹکائے چوراہوں پر
اور بچوّں کو نیزوں پہ ایسے اُچھالا گیا
جیسے لاشیں ہوں مستقبلِ ملک و ملّت کی
اور خون سے لکھ دیا
'درسِ عبرت ہے یہ'
کلمہ گو ایسے چن چن کے مارے گئے
جیسے حرفِ غلط کو مٹائے کوئی صفحۂ زیست سے
مسجدیں اصطبل بن گئیں
مدرسے ڈھے گئے
کوچے، ایوان، دیوان خانے، مٹے
ہُو کا عالم ہوا

رہ گیا نام اللہ کا
عدلِ افرنگ نے نصب میزان کی
اور ذی علم، ذی جاہ، خوددار سب،
قابلِ دار ٹھہرائے ظالم کے انصاف نے

اور پھر یوں ہوا
منتشر ملّتِ احمدی اور بھی منتشر ہو گئی
ہو کے مفتوح، مجبور، بے دست و پا
کچھ نہ تھا دل میں اب نفرتوں کے سوا
نفرت انگریز سے،
نفرت اس لفظ سے جو زباں پر تھا انگریز کی،
نفرت اس علم سے جس نے انگریز کو ظلم ڈھانے کے قابل کیا،
نفرت انگریزیت کے ہر اک طور سے
کلمہ گو،
سر پہ نفرت کی گٹھری اُٹھائے ہوئے
بیچ رستے پہ آ کر کھڑے ہو گئے
عافیت کس طرف ہے، کدھر جائیں ہم
زخم سینے کے اب کس کو دِکھلائیں ہم
کیسے انگریزیت سے اماں پائیں ہم
اور پھر یوں ہوا
اِک جواں حوصلہ، مردِ حق، کلمہ گو ان سے گویا ہوا
بزدلی جرم ہے
بے حسی جرم ہے
جہل دُنیا میں سب سے بڑا عیب ہے
علم ایمان ہے
علم ہے توشۂ آخرت
علم عزّت سے جینے کا سامان ہے
علم حرفِ محمدؐ ہے، تفسیرِ قرآن ہے

حرفِ آزاد

اچانک ایک شعلہ سا جو لپکا دشتِ ہستی میں
تحیر تھا زمانے کو کہ یہ کس کی صدا گونجی
جھنجھوڑا ہے یہ کس نے سانس لیتی زندہ لاشوں کو
غلامی کو پسینہ آ گیا ، گھبرا کے کروٹ لی

ذرا دیکھے تو کوئی شدّتِ احساس کا عالم
کہ سوزِ دل سے پگھلی جا رہی ہیں ساری زنجیریں
بھڑک اُٹھے دلِ مایوس میں شعلے بغاوت کے
بدلتی ہیں اسی انداز سے قوموں کی تقدیریں

حقائق ہیں ، دلائل ہیں ، نہیں یہ کھوکھلے نعرے
کہ ہر اک لفظ میں تاریخ کی عظمت کا پرتو ہے
نئی تفہیم ہے ماضی کے زندہ کارناموں کی
ہے کس کا سحرِ گویائی ، یہ کس آواز کی ضو ہے

وہ مذہب ہو، معیشت ہو، ثقافت ہو، سیاست ہو
ہر عقدے کی گرہ کھولی ہے، یہ کس کی ذکاوت نے
یہ فخرِ ایشیا آزآد کی معجز بیانی ہے
کیا تسلیم جس کے حرف کو مغرب کی عظمت نے

پڑھیں تحریر جب اس کی تو یہ محسوس ہوتا ہے
مجسم ہوگیا ہے جیسے اِک آواز کا شعلہ
وہ علم و فضل و دانش کا ہے اِک مینارۂ عظمت
بجا ہے گر اُسے کہئے ارسطو عصرِ حاضر کا

(۱۵ر فروری ۱۹۹۷ء)

رفیقِ منزل۔ فیضؔ

تجھے رفیق کہوں، ہم سفر کہ راہنما
مری نوا میں ترا سوز و ساز شامل ہے
مچل رہی ہے جو منزل ترے تصوّر میں
وہی مرے بھی شعورِ جنوں کی منزل ہے

جہانِ درد میں ہم سب ہیں 'نقشِ فریادی'
جہاں کے درد کا نغمہ ترے کلام میں ہے
عجب ادا سے تو اس دور میں ہے نغمہ سرا
نوا کی گونج تری بزمِ خاص و عام میں ہے

'یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر'
کہ جس کی تاب نہ لائے شعورِ اہلِ نظر
ترے جنوں کو نیا عزم اسی نے بخشا ہے
تری غزل ہے کہ اک نغمۂ عروجِ بشر

فرازِ دار و رسن پر ہوا تو نغمہ سرا
حیات تیرے لیے بے قرار گزری ہے
نشانہ سنگِ ملامت کا کیوں نہ بن پایا
'یہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے'

(۱۹۶۵ء "افکار" فیض نمبر میں چھپی)

نذرِ تاباںؔ*

بغاوت زندگی کا شعلۂ بیتاب رقصاں ہے
بغاوت طنطنہ ہے، عزمِ محکم، جوشِ طوفاں ہے
بغاوت تو قدامت کے لیے ہے موت کا ساماں
بغاوت نغمۂ تجدید ہے، ذوقِ فراواں ہے

صداقت بے نیازِ کفر و ایماں ہے ہمیشہ سے
صداقت نورِ دانش، علم و عرفاں ہے ہمیشہ سے
صداقت جذبۂ فکر و عمل ہے، رُوح کا نغمہ
صداقت مسلک و آدابِ زنداں ہے ہمیشہ سے

قناعت بخشتی ہے ذہن و دِل کو ایک سرشاری
قناعت سے غنی ہو دل تو جاگ اُٹھتی ہے خودداری
قناعت نام ہے سود و زیاں سے بے نیازی کا
قناعت ہو تو پھر عزّت کی اک روٹی بھی ہے پیاری

محبّت آدمی کو واقعی انساں بناتی ہے
محبّت دوسروں کے واسطے جینا سکھاتی ہے
محبّت میں نہیں تفریق رنگ و نسل و مذہب کی
محبّت ساقیٔ میخانہ ہے، سب کو پلاتی ہے

بغاوت جس کو کہتے ہیں اُسی کا نام ہے تاباںؔ
صداقت نام ہے جس کا اُسی کا نام ہے تاباںؔ
قناعت جس کو کہتے ہیں اُسی کا نام ہے تاباںؔ
محبّت جس کو کہتے ہیں اُسی کا نام ہے تاباںؔ

* غلام ربانی تاباںؔ

(۱۴رفروری ۱۹۹۳ء)

حرفِ تہنیت

(سردار جعفری کے ۸۰ ویں جشنِ سالگرہ کے موقع پر)

یہ برق و شرر، شورشِ طوفاں کی صدی ہے
گزرا ہے تغیّر سے ہر اک گوشۂ عالَم
سردآر نے اس دور سے یوں آنکھ ملائی
لہجے میں یقیں، حرفِ عمل، عزمِ مصمم
باطل کے مقابل ہو تو تاریخ نے دیکھا
سردآر کے ہاتھوں میں بغاوت کا ہے پرچم

سردآر سے ملئے تو لطافت کا ہے پیکر
الفاظ میں اخلاص کا پرتو سا نظر آئے
سردآر کو پڑھیے تو گماں ہوتا ہے ایسا
ہم علم و معانی کے سمندر میں اُتر آئے
سردآر کو سنیئے تو خطابت کا کرشمہ
شعلوں کے لپکنے کا سا انداز نظر آئے

سردآر کی عظمت کے بہت پھول کھلیں گے
شہرت کے اسے اور بھی افلاک ملیں گے

بیادِ علی سردار جعفری

فضا ہے اشک بداماں ، ہوا ہے سرگرداں
پہاڑ غم کا اُٹھائے ہوئے ہے ابرِ رواں
خموش ہوگئیں الفاظ و نطق کی پریاں
اُداس زہرہ و پرویں ، اُداس کاہکشاں
زمیں پہ آج یہ کس آسماں کا ماتم ہے
چمن میں طوطیٔ شیریں بیاں کا ماتم ہے

زبان کہتی ہے اب میرے ناز اُٹھائے گا کون
اُداس حرف ہے جادو مرا جگائے گا کون
غزل یہ سوچ رہی ہے ، مجھے سجائے گا کون
یہ فکر نظم کو ، گیسو مرے بنائے گا کون
جو فنِ شعر کی عظمت کا رازداں تھا ، گیا
جو اہلِ اُردو کا بیباک ترجماں تھا ، گیا

یہ مژدہ کون سنائے گا ، پھر میں آؤں گا
زباں میں چڑیوں کی بولوں گا ، گیت گاؤں گا
چمن میں پھولوں میں چھپ کر میں گنگناؤں گا
سخنوروں کے لبوں سے میں مسکراؤں گا

یہ ہندو پاک کی سرحد پہ کس کا ہے سایہ
ہے انتظار ابھی کس کو صبحِ فردا کا

لطیف رنگ ہے ، نکہت ہے اب علی سردارؔ
جمالِ حرفِ محبّت ہے اب علی سردارؔ
دیارِ ہند کی عظمت ہے اب علی سردارؔ
بہت حسین روایت ہے اب علی سردارؔ

وہ میرؔ و غالبؔ و اقبالؔ کا تسلسل ہے
ہمیشہ چہکے گا ، اپنے چمن کا بلبل ہے

(۵/اگست ۲۰۰۰ء)

انورعظیم کی یاد میں

زمانے سے الگ وہ شخص
پھر بھی سب میں شامل تھا
وہ ہندو بھی، مسلماں بھی،
ہر اِک مذہب کی عزّت اس کا ایمان تھا
حدودِ مذہب وملّت سے بالا ایک انساں تھا
قلم اس کا رفیقِ جاں،
قلم کاروں کی محفل میں الگ پہچان تھی اس کی
وہ لفظوں کا مسیحا تھا
وہ جملوں کی نئی ترتیب کا خالق
صحافت میں وہ طرزِ نو کا موجد تھا
وہ باتونی نہیں تھا،
ہاں مگر ''باتیں'' وہ لکھتا تھا
وہ باتیں تہہ بہ تہہ جن کے معانی بو لتے تھے اپنے قاری سے

فسانہ گر تھا وہ اس دور کا جس میں
غریبی ایک لعنت ہے،
خوشامد باعثِ عظمت
امارت باعثِ عزّت،
ریاکاری ذہانت ہے
اُلٹنا چاہتا تھا وہ بساطِ کہنہ کو لیکن
وہ خود نرغے میں آ کر پھنس گیا تھا کم نگاہوں کے
وہ جھلایا،
وہ جھنجلایا،
مگر اس بہری دُنیا میں بنایا اس نے خاموشی کو مسلک،
اور سارا زہر خود پی کر،
ہوا آزاد دُنیا سے
وہ اب آرام سے ہے
اور ہم ماتم مناتے ہیں
یہ ماتم اصل میں ان سوختہ جانوں کا ماتم ہے
ازل سے جو رہِ حق پر چلے،
اور مرتے مرتے،
اور اُونچا کر گئے ہیں حق کے پرچم کو

(۳۰/اکتوبر ۲۰۰۰ء)

نذرِ کیفیؔ

موت اِک زندہ حقیقت ہے، مفر اس سے کہاں
موت کے بعد جو بچ جائے وہ ہے اصلِ حیات
جسم اِک روز فنا ہوتا ہے ، لیکن اعمال
زندہ رہتے ہیں بہرحال ، بہ صد حسنِ صفات
آدمی اپنے عمل سے ہی امر ہوتا ہے
اور بن جاتی ہے اِک مشعلِ نور اس کی ذات
عمر بھر حرف کو دیتا رہا جو خونِ جگر
عمر بھر جس نے لکھیں علم کی روشن آیات
جس کی آواز اندھیروں میں جلاتی تھی چراغ
جس کے افکار سے کھل جاتے تھے اسرارِ حیات
آج اس شخص کو مرحوم کہیں تو کیسے
گونجتے رہتے ہیں ماحول میں جس کے نغمات
اے سروشؔ آج ہر اِک حرف ہے نذرِ کیفیؔ
یاد آئے ہیں ملاقات کے کتنے لمحات

(۱۶؍مئی ۲۰۰۲ء)

گم ہوتا ہوا آسمان

کے بعد کی نظمیں

رہوار

یہ رہوارِ عمرِ رواں ہے اسے باندھ کر اصطبل میں نہ رکھو
تڑائے گا رسّے،
ہواؤں سے باتیں کرے گا،
خبر بھی نہ ہوگی کہاں اُڑ گیا وہ
یہ رہوارِ عمرِ رواں ہے اسے پیار سے تھپتھپاؤ
ہتھیلی کا لمس اس کی نس نس میں بھر دو
کرو اپنی آواز کا اس پہ جادو
اسے اپنے سانسوں کا،
قدموں کی آہٹ کا عادی بناؤ
سواری کرو اس پہ،
اور سبزہ زاروں میں، دریاؤں، کہساروں،
اور جنگلوں میں اسے دوڑنے کا سلیقہ سکھاؤ کہ ٹھوکر نہ کھائے
پھلانگے — تمھیں حادثوں سے بچائے

(۳۱/اکتوبر ۲۰۰۳ء)

جوابوں کے دائرے سے پرے

وہ اِک سوال جوابوں کے دائرے سے پرے
کبھی ہے رنگ، کبھی نور ہے، کبھی خوشبو
کبھی خیال، کبھی رُوح ہے، کبھی ہے بدن
اس اِک سوال کا ہی نام ہے وہ پیکر بھی
جو میرے لمس کی بھی دسترس سے دُور رہا،
نظر بھی چھو نہ سکی جس کی جلوہ ریزی کو
وہ کب کا ہو چکا معدوم، بن چکا ہے یاد
مگر ہے ذہن میں پیچیدہ فلسفے کی طرح

(۲۸راکتوبر ۲۰۰۳ء)

کتب خانے میں ایک شام

سنہری شام ہے،
میں اک کتب خانے میں بیٹھا سوچتا ہوں،
یہ کتابیں،
ہزاروں سال کی تاریخ و تہذیب و تمدن کی ہیں شاہد
سمیٹے اپنے حرفوں میں،
زمیں کی کوکھ سے اُگتی ہوئی نازک سی کونپل
نگاہِ جستجو پر ہیں خواص اس کے اُجاگر
انھیں پودوں میں زہر، ان میں ہی تریاق
بہت خاموش ہے پتھر کی دُنیا
چمکتا ہے مگر اس میں ہی چقماق

زمیں کی سطح پر سونا اُگایا
گیا زیرِ زمیں انساں،
تو معدنیات اور لعل و جواہر کے بہت انبار لایا
سمندر جب کھنگالے
تو کیسے بے بہا موتی نکالے
یہ سب کچھ زندہ ہے جیسے کتابوں کے جہاں میں

کتابیں،
چھپائے اپنے پہلو میں،
دہاڑیں ظالموں کی اور مظلوموں کی چیخیں
ہزاروں بربریت کے تماشے
لہو کے کھیل، قتل وخوں کے بازار
حکومت کے نشے میں جھومتے شاہوں کی یلغار
سروں سے بے گناہوں کے چنی جاتی ہوئی محلوں کی دیوار
زمیں کے اِس سرے سے اُس سرے تک دوڑتے گھوڑوں کی ٹاپیں
کچلتے کھیت، ننھے منے پودے
اُجڑتی بستیاں، شہروں کی رونق،
فنون وعلم کا ہر قصر مسمار
ہوس کے ہاتھ میں عصمت کی چادر
ہزاروں بار دہرایا گیا یہ بدنما دلدوز منظر
یہ سب کچھ زندہ ہے جیسے کتابوں کے جہاں میں

کرشمہ عقل انسانی کا ہے یہ
کیا تھا خلق جو نورِ ازل نے
اسے تخلیقیت کے لمس اور جہد وعمل سے
اُجاگر کر دیا ہے رفتہ رفتہ
زمیں کی قوتوں کا جو ہے وارث
چلا ہے فتح کرنے اب وہ افلاک
تصور کو حقیقت کر دِکھایا

زمیں کو کس طرح جنت بنایا
سبھی کچھ زندہ ہے جیسے کتابوں کے جہاں میں

مگر اک مسئلہ درپیش ہے اب
کہ ذہن و فکر کا یہ نقشِ معکوس
یہ ایجاداتِ نو کا دیوِ تخریب
بنا سکتا ہے جو دوزخ زمیں کو
جلا سکتا ہے جو ہر نیک و بد کو
مٹا سکتا ہے جو خالق کو اپنے
اسے قابو میں رکھا جائے کیسے

جواب اس کا کتابوں میں نہیں ہے
کبھی محسوس ہوتا ہے کہ جو لکھا ہے اب تک
وہ سعیِ رائیگاں ہے
قلم کا پھر ہمارے امتحاں ہے

(۱۱ر نومبر ۲۰۰۳ء)

کھڑکی

یہ جگنو ہے کہ اس کی یاد کا ننھا سا پرتو
مسکرایا اور نظر سے ہو گیا او جھل
میں آنکھیں پھاڑے اس کو دیکھتا ہوں اپنی کھڑکی سے
یہ کھڑکی وسوسوں کی اور پراگندہ خیالوں کی
جو کھلتی ہے خرابوں میں، سرابوں میں
یہ جگنو کی چمک اکثر مری نیندیں اُڑاتی ہے
مجھے لے جاتی ہے یادوں کے مرگھٹ میں
یہ کھڑکی بند کر دوں
آج تو جی بھر کے سو جاؤں

(۱۳ر نومبر ۲۰۰۳ء)

نفی

ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے سارے قلم
ثبت جن پر انگلیوں کے تھے نشاں
پرزہ پرزہ ہو گئے کاغذ تمام
تھے رقم جن پر مرے اجداد کے نام و نسب
ریزہ ریزہ ہو گیا ہے وہ جہاں جس میں لیا تھا میں نے جنم

میں روایت کی نفی کا نقطۂ آغاز ہوں
میں جنوں پرور تخیل کا پرِ پرواز ہوں

(۶ر اپریل ۲۰۰۴ء)

چند نثری نظمیں

شکستِ زنداں

ٹوٹی ہوئی سلاخیں
جن پر باغی قیدیوں کی انگلیوں کے نشان ہیں
ترُی مڑی
اوندھے منہ پڑی ہیں
جیلر کا جبر و تشدد
ہار چکا ہے
اور کھلنے کو ہیں
زنداں کے دروازے

(۷؍مئی ۲۰۰۴ء)

تجربہ

بہت دشوار لگتا ہے
اندھیرے سے آنکھیں ملانا
اس کے جال میں پھنسے ہوئے ستاروں کے دُکھ کو
محسوس کرنا
اور انھیں ایک نئے آسمان پر سجانا
کام ہے دشوار
مگر
تجربہ کرنے میں کیا اعتراض

(۷؍مئی ۲۰۰۴ء)

انقلاب

پیڑ —— اپنی کونپلوں کے بل کھڑے ہیں
جانور —— پنی پونچھ کے بل پر چل رہے ہیں
دریا —— پہاڑوں کی سمت بہہ رہے ہیں
آدمی —— سر کے بل سرک رہے ہیں
لفظ —— معنی سے بیزار ہیں
یہ کس انقلاب کے آثار ہیں

(۲۶؍اپریل ۲۰۰۴ء)

کوشش

اندھیری کوٹھری میں بند ایک چڑیا
پھڑ پھڑا رہی ہے
چونچ سے روشن دان بنا رہی ہے

مسافر

اوبڑ کھابڑ جنگل میں چلتے چلتے
میں نے سوچا
تلوؤں سے رستے کے کانٹے ہی چن لوں
شاید مل جائے کسی کو راحت

(۲۴ر جون ۲۰۰۴ء)

آخرِ شب

(فلیش بیک)

یہ مرا جسم شکستہ سا مکاں
ایک بوڑھا ہے مکیں
رات بھر درد کی اِک ڈور میں اعصاب کو باندھے
ہوئے چپ چاپ پڑا رہتا ہے
صبح دروازے پہ جب دیتا ہے دستک سورج
کسمساتا ہوا بستر سے وہ اُٹھ بیٹھتا ہے
اور سورج سے ملا کر نظریں
گردشِ وقت کے گرداب میں ہو جاتا ہے گم

گردِ ماضی میں اَٹے گھر کے کسی کونے سے
آ دھمکتا ہے کھلنڈرا بچہ
بے سبب دوڑتا ہے، بھاگتا ہے
اپنی تنہائی پہ حیران سا ہے
کھیلتے کھیلتے انجان جزیروں میں پہنچ جاتا ہے

وہ بھٹکتا ہے کوئی ریت کے صحراؤں میں
اِک بگولے کی طرح

وقت کی دھوپ بہت تیز ہے
ملتی ہی نہیں جائے اماں
کھولنے لگتا ہے بے نام مسائل سے دماغ
اِک تگ ودو ہے،
نہ رستہ ہے، نہ منزل کا سراغ

وقت چلتا ہے دبے پاؤں
کہیں درد سے شہنائی کی آتی ہے صدا
نقرئی قہقہے رہ رہ کر کھنکتے ہیں،
صبا راگ نیا چھیڑتی ہے
اور پھولوں سے سجے بستر پر
دو بدن پیار کے افسانوی ماحول میں کھو جاتے ہیں
اور چولھے میں چہکتی ہے جب آگ
روٹیاں پکنے کی خوشبو سے مہک جاتا ہے سارا ماحول
کھلکھلا اُٹھتی ہے پھر بیلا چمیلی سے مہکتی ہوئی شام
چاند اُترتا ہے سلامی کے لیے

پھر اچانک ہی بدل جاتا ہے سارا ماحول
چاند بجھ جاتا ہے، گم ہوتا ہے سارا منظر
سوگ میں رات پہن لیتی ہے پھر تیرہ لباس
گھر میں رہ جاتا ہے اِک درد بھرا سناٹا
زندگی اتنی بھی بے رحم ہے، معلوم نہ تھا

(۱۳؍ جون ۲۰۰۴ء)

محاسبہ

مرتے جیتے مجھے اب بیت گئے اسّی سال
جسم ہے روبہ زوال
ذہن جب مانگتا ہے عمرِ گذشتہ کا حساب
سر جھکا لیتی ہے آوارہ مزاجی، مری آشفتہ سری
میں وہ ہوں جس نے سدا
وقت کی دولتِ نایاب کو ٹھکرا دیا ہے
اب گرہ میں ہے فقط گردِ ملال
رائیگاں وقت کا اِک کوہِ گراں،
بوجھ بن کر مرے سینے پہ کھڑا ہے جیسے
یہ زیاں وہ ہے، مداوا نہیں جس کا کوئی

اے مری عمر کے باقی لمحو!
مجھ کو جینے کا سلیقہ دے دو

(۱۴؍جون ۲۰۰۴ء)

نیا جنم

بدن پر میلے کپڑے، پاؤں ننگے، ملگجی صورت
اسے احساس تھا وہ سب سے کم تر ہے
وہ بزدل تھا
کرے تذلیل جو اس کی، وہ اس سے جھک کے ملتا تھا
مذمت اپنی خاموشی سے سہتا تھا
مگر اندر ہی اندر ریزہ ریزہ کٹتا رہتا تھا
وہ سب کے حکم کا بندہ تھا، لیکن پھر بھی تنہا تھا

اور اِک دن ہاتھ سے اس کے پیالہ چُھٹ گیا صبر و تحمل کا
خدا کا شکر ہے وہ مر گیا
اب خاک سے اس کی
اُٹھا ہے ایک باغی نوجواں، خود سر
کسی کو اب نہیں لاتا وہ خاطر میں
جو کل تک اس پہ ہنستے تھے
اسے تکتے ہیں حیرت سے
کہ آخر ماجرا کیا ہے

(۳۰ر جون ۲۰۰۴ء)

بیداری

اور وہ سب خواب میں تھے
چلتے پھرتے تھے اسی عالم میں،
لقمے غیر کے کھاتے تھے،
اور پیتے تھے خود اپنی ہی غیرت کا لہو

زلزلہ آیا اچانک، آنکھ ان کی کھل گئی
بے لباس اور بے سروسامان نظر آئے وہ اپنے آپ کو
بے بضاعت، بے اماں، بے آبرو
ہو گئے بیدار،
تو اب کر رہے ہیں زندگی کی جستجو

(۱۶/جولائی ۲۰۰۴ء)

ایک شہر

اِک ایسا شہر بھی دیکھا، جو ملبہ تھا تمدن کا
چھتوں پر گر چکی تھیں جس کی دیواریں
درختوں کی جڑیں تھیں سوختہ ساماں
نہ تھا سایہ، نہ تھی جائے اماں کوئی
کبھی تہہ خانے ہوں گے،
اب وہاں تھے دھوپ کے پہرے

(۱۷ر جولائی ۲۰۰۴ء)

شہید

جب وہ بے جان پھانسی کے تختے سے اُترا،
تو ہونٹوں پہ تھی فاتحانہ تبسم کی ننھی لکیر
کتنی خفت تھی جلاّد کے چہرے پر
جس کے بس میں نہ تھا
اس کے اندر کے انسان کو مارنا

(۱۷ر جولائی ۲۰۰۴ء)

محبت کے خوگر کہاں جائیں آخر

مجھے ایسا لگتا ہے، میں ہوں فضا میں معلق
مرے دائیں بائیں زمیں پر ہیں کتنے ہی حیواں،
سجائے ہوئے مسخ جسموں پہ انسانی چہرے
ہر اک سمت ہے ناچ حیوانیت کا
کہیں خوں میں لتھڑی، تڑپتی ہوئی زندہ لاشیں
کہیں بربریت کے ہاتھوں گلے کٹ رہے ہیں
فحاشی و عریانیت کے چلن نے
بنایا ہے انسان کو بوالہوس اور وحشی

وہ ہتھیار انساں کے ہاتھوں نے جن کو بنایا
اسی کے ہیں دشمن
زمیں کے ہر اک گوشے میں موت برسا رہے ہیں
ہواؤں میں نفرت کی بارود پھیلی ہوئی ہے
محبت کے خوگر کہاں جائیں آخر!

(۳۱/اگست ۲۰۰۴ء)

پچھلا پہر

رات کٹتی ہی نہیں، درد سمٹتا ہی نہیں
گرد جیسے غم و آلام کا ہے ایک ساگر
کبھی انفاس بغاوت پہ اتر آتے ہیں
کبھی لو دیتے ہیں ہنس ہنس کے مرے زخمِ جگر
پھڑ پھڑاتی ہے کوئی چیز مرے سینے میں
پھر بھی ہوتا نہیں ویراں یہ عناصر کا نگر

جسم تو کب سے بکھر جانے پہ ہے آمادہ مگر
زندگی جسم نہیں، روح کا ہے ایک سفر
روح فنکار ہے، پابندِ عناصر رہ کر
تجربے کرتی ہے، سکھلاتی ہے جینے کا ہنر

جسم کو جینے کی تحریک دیئے جاتی ہے
دلِ غم دیدہ کے سب چاک سیے جاتی ہے

(۱۸ر ستمبر ۲۰۰۴ء)

آندھی کی زد میں

ہوا ہے تیز، بہت تیز، سانس کی آندھی
اُڑائے دیتی ہے ہوش و حواس کے ڈیرے
ہوا ہوئے، جو بُنے تھے بہار کے سپنے
میں ایسا پیڑ، اُکھڑنے کو ہیں جڑیں جس کی
جو میری شاخوں پہ بیٹھے ہیں، وہ پرند اُڑ جائیں
بنائیں اپنا نشیمن نئے گلستاں میں

ندی

یہ اک ندی، جو نکل کے مخرج سے، پربتوں، جنگلوں سے،
کھیتوں سے، وادیوں اور بستیوں سے گزر چکی، اب
نہ جانے کس سمت جا رہی ہے

(۲۹ر ستمبر ۲۰۰۴ء)

درد کا سمندر

مرا بدن درد کا سمندر
کبھی ہے ساکت
کبھی جب اُٹھتی ہیں اس میں لہریں
تو جوار بھاٹا بدن کی نس نس کو توڑتا ہے
قرار آتا ہے کچھ، تو ایسے
کہ جیسے لہریں تڑپتی مچھلی کو ریگِ ساحل پر چھوڑ آئیں
پلٹ کے پھر اس کو کھینچ لائیں
نہ جانے کب اس تڑپتی مچھلی کو ریگِ ساحل پناہ دے دے
بدن نئی داستان لکھے

(۲۰ر اکتوبر ۲۰۰۴ء)

قسمت

آدمی
اپنی قسمت کے ستاروں کو پکڑنا چاہے
جیب میں بھرنا چاہے
یہ ستارے تو ہیں لیکن بے نور
ان میں انسان کے اعمال سے آتی ہے چمک

(۲۱ر نومبر ۲۰۰۴ء)

لمبی سڑک

میں گھر میں ہوتا ہوں جب
تو معمول کے مطابق
سکون سے اپنی میز کرسی پہ لکھتا پڑھتا ہوں،
اور بچوں سے کھیلتا ہوں
مجھے یہ لگتا ہے میرا بچپن
یہیں کہیں میرے آس پاس ہی ہے

مگر نکلتا ہوں جب میں گھر سے
تو ساتھ آتی ہیں میری معذوریاں،
تھکن، بدن کا عدم توازن، شکستہ پائی
قدم جب اُٹھتے نہیں
تو لمبی سڑک کو حسرت سے دیکھتا ہوں

(۲۲؍ اکتوبر ۲۰۰۴ء)

سنامی

سمندر کی تہوں سے خشمگیں لہریں، پہاڑوں کی طرح اُٹھیں
بڑھیں، جیسے لچکتے ہاتھ ہوں لمبے۔ قیامت کے فرشتوں کے
چڑھیں طوفان کی صورت
بہایا اس کو جو بھی سامنے آیا
جزیرے، کشتیاں، ملاح، ساحل پر نہاتی لڑکیاں، محلات،
مندر اور مسجد، قحبہ خانے، اور ہنستے کھیلتے بچے
بھرے بازار، تانگے، کاریں، چولھے سے اُترتی روٹیاں،
پکوان سب کچھ جو نظر آیا
چھڑایا باپ سے بیٹے کو، ماں سے اس کے بچے کو
اُلٹ دی یوں بساطِ زندگی جیسے نہ تھیں آبادیاں ـــــ
یہ تو خرابے تھے

بہت سفاک تھیں لہریں
لگاتی قہقہے لوٹیں، تو بس لاشیں ہی لاشیں تھیں سرِ ساحل
تمدن کا نیا ملبہ
بلکتی، چیختی انسانیت، مجبور، بے ساماں

مگر اس موت کے ماحول میں اک پیارا بچہ جب نظر آیا
تبسم لب پہ آنکھوں میں حسیں سپنے
ہوا محسوس، پھر انسانیت نے فتح پائی ہے
کوئی تو زندہ ہے اس خشمگیں طوفان سے آنکھیں ملانے کو

(۵؍جنوری ۲۰۰۵ء)

(ایک مصرعے کی دو نظمیں)

بھیڑ

یہ کیسی بھیڑ ہے، سب لوگ جیسے دائرہ در دائرہ، سیاروں کی صورت رواں ہیں، سب کے چہروں پر چڑھے ہیں آہنی سے خول، ہر اک احساس سے بیگانہ، ان میں شائبہ تک بھی نہیں انسانیت کا، دشمنی کا دوستی کا، پیار کا، بغض و کدورت کا۔

(۲۳ر جنوری ۲۰۰۵ء)

جنگل

عجب جنگل ہے، پیڑوں کی جڑیں تو دھنس گئیں اندر زمیں کے، اور تنے کٹ کر جڑوں سے آندھیوں سے لڑتے بھڑتے، گھومتے پھرتے ہیں، شاخوں پر لدے ہیں ریچھ، بندر، سانپ، چوہے، بلیاں، لنگور، طوطے، چیل، کوّے، اور کبوتر اور چڑیاں، سب ہیں اپنی اپنی دُھن میں اپنے حال میں ہیں مست — آندھی ہو گئی گر تیز، پیڑوں کے تنے آپس میں ٹکرانے لگے اِک دم، تو کیا ہوگا!!

(۲۳ر جنوری ۲۰۰۵ء)

ملبہ

یہ کیسا ملبہ ہے زندگی کا!
یہ دوستوں کی رقابتیں ہیں
یہ دشمنوں کی خباثتیں ہیں
یہ خودستائی، یہ خودنمائی
یہ خود فریبی، یہ کج ادائی
یہ سازشوں کے ہیں تانے بانے
یہ بے وفائی کے تازیانے
یہ نرمِ خو، نرم دل ستمگر
چھپائے ہیں آستیں میں خنجر
یہ زہرِ آلود میٹھی باتیں
فریب کی بے شمار شکلیں
یہ کیسا ملبہ ہے زندگی کا
چلو کہیں اس کو دفن کردیں
کریں فروزاں ہم ایسی قدریں
جو ان کے برعکس زرفشاں ہوں
جو زندگی کا نیا نشاں ہوں

(۶ر فروری ۲۰۰۵ء)

گم ہوتا ہوا منظر

رات ہے اندھی
چاند نہ تارے
اندھیارے کا راج ہے ہر سو
ہوا ہے پاگل
پیڑوں کی شاخوں سے اُلجھتی
جھومتی، بل کھاتی، لہراتی
گھر گھر کے دیپوں کو بجھاتی
سائیں سائیں ناچ رہی ہے
موت کا راگ الاپ رہی ہے
دھرتی تھر تھر کانپ رہی ہے

(۱۴؍اپریل ۲۰۰۵ء)

کہیں کھو گیا نشیمن

مرا گھر تو وہی تھا جس میں بچپن مسکرایا تھا
جہاں کھولی تھیں آنکھیں، سب سے پہلے ماں کو دیکھا تھا
جہاں پھوٹی تھی میرے ذہن میں احساس کی کونپل
جہاں ماحول کی ہر چیز کو اپنا ہی سمجھا تھا

جہاں گھٹنوں چلا تھا، پھر قدم آگے بڑھایا تھا
نہ اپنے آپ پر تھا مجھ کو قابو، یاد ہے اب تک
وہ آنگن تھا مری دُنیا، مرا گلشن، مری جنت
وہ مٹی جس کی سوندھی سوندھی خوشبو یاد ہے اب تک

قدم آگے بڑھے تو راستے پر پیچ تھے اتنے
میں اپنے گھر کی دُنیا سے بہت آگے نکل آیا
پھرا ہوں شہروں شہروں، خاک چھانی کتنی گلیوں کی
مگر جو کچے گھر میں تھا سکوں، مل ہی نہیں پایا

وہ گھر جو دل میں بستا ہے، اُجڑ کر ہو گیا ویراں
نہ بچپن لوٹ سکتا ہے، نہ وہ گھر اور نہ وہ آنگن
میں اِک ایسا پرندہ جس کی ہے پرواز تو اُونچی
مگر کھویا گیا اس کا نشیمن ، پیار کا گلشن

(یکم جون ۲۰۰۵ء)

موت کی سوغات

بہت قریب سے دیکھا ہے موت کو میں نے
نواحِ جاں سے وہ چپ چاپ جب گزر جائے
چراغ جلتا رہے آندھیوں کی یورش میں
ہلاکتوں کی ندی چڑھ کے جب اُتر جائے
وہ لمحہ کتنا حسیں اور لطیف ہوتا ہے

نہ جانے کتنے مہہ و سال سے بھی افضل ہیں
وہ چند لمحے جو کہلائیں 'موت کی سوغات'

(۷/ جولائی ۲۰۰۵ء)

حصار

جانے یہ کیسی دیوار ہے
میرے اور سارے دُنیا کے بیچ
اُس طرف قہقہے، شور، ہنگامۂ خیر و شر
قتل و غارت گری
دشمنی، دُوستی
اس طرف ذات کا اِک حصار
اپنے ہی وضع کردہ اصولوں کی تنظیم کا میں شکار
میرے کاندھے پہ میری صلیب
دوست کوئی نہ میرا رقیب

تھک گیا ہوں میں اس دشتِ تنہائی میں
کاش کوئی پھلانگے انا کی یہ دیوار
اور سرحدِ خودسری توڑ دے
اور مجھ سے مجھے چھین لے

(۲۳؍جولائی ۲۰۰۵ء)

شعر

جب کسی لفظ کو چھوتا ہوں میں
اس کی رگ رگ میں سمو دیتا ہوں میں احساسِ جمال
نطق کے لمس سے بھر دیتا ہوں اس میں جوہر
اور وہ لفظ چہک اُٹھتا ہے نغمہ بن کر

(۱۱/اکتوبر ۲۰۰۵ء)

زلزلے

یہ زلزلے جو ہلاکت کا پیش خیمہ ہیں
جو ہنستے کھیلتے شہروں کو کرتے ہیں ویران
زمیں کے درد کے دلدوز استعارے ہیں

کسی نے سوچا ہے آخر زمیں پہ کیا گزری
تڑپ تڑپ گئی، کس کرب کی شکار ہے وہ
وہ اضطراب میں کروٹ بدل رہی ہے کیوں!
وہ کون ہے جو اسے بے قرار کرتا ہے!
کوئی جواز ہے، اور کیا ہے مقصدِ تخریب!
اسی کی کوکھ سے پھوٹے گی کیا نئی تہذیب!

(۱۳/اکتوبر ۲۰۰۵ء)

مشین

یہ جسم کس کام کا ہے، جس میں
نہ زندگی کی کوئی تڑپ ہے
نہ جان دینے کا حوصلہ ہے
نہ کوئی جذبہ، نہ کوئی خواہش
نہ کوئی منزل، نہ کوئی ساحل

یہ جسم ہے اِک مشین جیسا
جو چل رہی ہے، تو چل رہی ہے
میں اس سے وابستہ ہوں تو لیکن
نہیں مجھے اختیار اس پر
جو اس کا خالق، وہ اس کا مالک

خبر نہیں کب بٹن دبا دے
خبر نہیں کب اسے مٹا دے

(۲۹ر نومبر ۲۰۰۵ء)

خاموشی

یہ شور و شغب ، یہ ہنگامے
پر کاٹ دو سب آوازوں کے
خاموشی ، زندہ خاموشی
منظر منظر جب چھا جائے
اپنے دل کی آواز سنوں
بے حرف ونوا ، بے صوت وصدا
اپنے غم کا افسانہ کہوں

تم سوچ نہیں پاؤ گے ابھی
خاموشی کیسی نعمت ہے
کچھ دیر اکیلے کمرے میں
بیٹھے رہنا بھی عبادت ہے

(۲۳ر نومبر ۲۰۰۵ء)

اُداسی

اُداسی اپنے پر پھیلائے
چاروں سمت ایسے پھڑ پھڑاتی ہے
کہ جیسے لے اُڑے گی مجھ کو بھر کر اپنے پنجوں میں
مگر مردہ نہیں ہوں میں
مری جیبوں میں خوشیوں کے جو سکے تھے
چرا کے لے گیا کوئی
میں خالی ہاتھ بیٹھا ہوں
مجھے محسوس ہوتا ہے
یہ دورِ نامرادی ہے
مرا غم سب کا غم ہے
درد میرا اجتماعی ہے

(۳۰ر دسمبر ۲۰۰۵ء)

دُعا نئے سال کی

اضافہ پھر ہوا اِک قبر کا تاریخ کے شہرِ خموشاں میں
پڑھو اب فاتحہ اس پر
دعائے مغفرت مانگو
ہزاروں بے گناہوں کے لیے جن پر
اچانک قہر ٹوٹا زلزلوں کا
اور دبے شہروں کے ملبے میں
تڑپتی رہ گئی ممتا
بلکتے رہ گئے بچے
دُعا ان کے لیے بھی جو بچے زندہ
مگر مُردوں سے بدتر ہیں

دُعا مانگو،
کھلے اگلا ورق جب وقت کا، اس پر
لکھا جائے نہ قصہ جنگ کا اور خوف و دہشت کا
خصومت کی کوئی تاریخ دُہرائی نہ جائے، وقت کے لب پر
ترانے ہوں فقط انصاف و امن آدمیت کے
فسانے ہوں محبت اور اخوت کے

(۳۱ر دسمبر ۲۰۰۵ء)

اولڈ ہوم

وہ عالم، عاقل و دانا، مگر بوڑھا
اب اس کا علم عصری حسیت سے ہو گیا عاری
وہ بوسیدہ ورق ہے جیسے ماضی کا
نشانہ اہلِ خانہ کی رعونت کا
وہ گھر جو اس نے اپنے خوں پسینے سے بنایا تھا
جہاں اس نے محبت کے سنہرے خواب دیکھے تھے
جہاں اس نے جوانی کی حسیں راتیں گزاری تھیں
جہاں بیوی کی یادیں سانس لیتی ہیں
وہ گھر اب تنگ ہے اس پر

بہو بیٹے کی یہ تجویز اب اس کا مقدر ہے
کہ گھر کے شور و شر میں وہ سکوں سے رہ نہیں سکتا
مناسب ہے اب اس کا اپنے ہم عمروں کے مسکن میں چلا جانا
جہاں اس جیسے کتنے لوگ بستے ہیں
غمِ بیگانگی کا زہر پیتے ہیں

(۷ر جنوری ۲۰۰۶ء)

تعارف

میں ایک فرد نہیں، صرف ایک جسم نہیں
تمام حرف و معانی، تمام صوت و صدا
تمام کیفِ نوا، نغمگی ہواؤں کی
تمام رنگ بہاروں کے، سوزِ بادِ خزاں
خرام جوئے رواں، جوشِ موجِ طوفاں کا
شرارِ برق، ترنم برستے بادل کا
سکوتِ آخرِ شب، دن کا شور اور ہلچل
شعورِ جہد و عمل، کامرانیوں کا وفور
محبتوں کی لطافت، رفاقتوں کا سرور
مرے وجود میں سمٹا ہوا ہے یہ سب کچھ

(۷ر فروری ۲۰۰۶ء)

سچّے موتی

فرصت ہے، کچھ سوچوں، لکھوں
سوچ پہ لیکن بس کس کا ہے
یہ تو ہیں آوارہ لہریں
ذہن میں چکراتی پھرتی ہیں
جب میں کام میں لگ جاتا ہوں
دست و بازو، کان اور آنکھیں
ہوتے ہیں مصروفِ عمل جب
سوچ کی لہریں سو جاتی ہیں
ذہن جو ہے بے انت سمندر
اپنی تہہ میں اُتر جاتا ہے

لیکن جب میں،
کام سے تھک کر سو جاتا ہوں
ذہن کی تہہ سے اُٹھتے ہیں کتنے ہی سنامی
سوچ کی لہریں اک طوفان مچا دیتی ہیں
ان جانے گوشوں میں اُتر کر
چن لاتی ہیں سچے موتی
رکھ جاتی ہیں میرے شعور کے گلیارے میں

(۲۵ فروری ۲۰۰۶ء)

گوشۂ عافیت

ہوا کی لوح پہ لکھا ہے میرا حرفِ صدا
بہت سے ملکوں میں، شہروں میں اور قصبوں میں
سمندروں میں، فضاؤں میں، کوہساروں میں
کہاں کہاں مری آواز گونجتی ہوگی

سمیٹ لو مجھے اب وقت کے حسین لمحو!
بکھر چکا ہوں بہت، اب سمٹنا چاہوں میں
کہ اپنے آپ میں کچھ دیر جینا چاہوں میں

(۲/اپریل ۲۰۰۶ء)

سیڑھی

نہ جانے کتنی لمبی ہے یہ سیڑھی، ختم ہونے میں نہیں آتی
میں اس پر دھیرے دھیرے چڑھتا جاتا ہوں
پھسلتا ہوں، سنبھلتا ہوں، مگر بڑھتا ہی جاتا ہوں
کبھی یہ خواب کی پہنائیوں میں لے کے جاتی ہے
کبھی یہ وسعتِ افلاک کا منظر دِکھاتی ہے
کبھی یہ ریگ زاروں، کوہساروں سے گزرتی ہے
کبھی یہ وادیوں سے، لالہ زاروں سے گزرتی ہے
کبھی یہ آندھیوں سے کھیلتی ہے، جھولتی ہے، پر مجھے گرنے نہیں دیتی
میں اس سیڑھی کا عادی ہوں
جدھر سے بھی گزرتا ہوں وہاں نقشِ کفِ پا چھوڑ جاتا ہوں

یہ سیڑھی ختم کیا ہوگی
کسی دن میں ہی اِک منزل پہ تھک کر بیٹھ جاؤں گا
مرے نقشِ قدم پر چلتے چلتے جو بھی آئے گا
مری انگلی پکڑ کر اور آگے بڑھتا جائے گا
کسی کو بھی نہیں معلوم سیڑھی ختم کب ہوگی

(۷؍اپریل ۲۰۰۶ء)

ہوا کا آنچل

ہوا درختوں سے کھیلتی، گل بہار شاخوں کو چومتی،
رقص کررہی ہے فضا کی بانہوں میں بانہیں ڈالے
دلِ فسردہ پہ کیف موسم کا چھا رہا ہے
گئے زمانوں کی داستانیں سنا رہا ہے
ہزار چہروں میں اِک شگفتہ صبیح چہرہ
فضا کے آنچل کی آڑ میں مسکرا رہا ہے

(۹؍جولائی ۲۰۰۶ء)

ایک خواب

عجب اِک خواب آنکھوں میں پھرا کرتا ہے مدّت سے
ہر اِک شے دُھندلی دُھندلی سی، ہر اِک منظر پگھلتا سا
گھر اِک ایسا کہ بنیادیں نہ چھت ہے، صرف دیواریں
چلے آندھی تو ٹکراتی ہیں آپس میں
کہیں سے اُڑ کے پھونس اور بانس آ جاتے ہیں
دیواروں سے رشتہ جوڑ لیتے ہیں
عجب مخلوق دیواروں کے اندر بس گئی ہے
بھوکی اور پیاسی
گڑھا وہ کھود کر پیتی ہے پانی
پیٹ بھر لیتی ہے مٹّی سے
اسی مٹّی میں سو جاتی ہے......
......اور پھر خواب جیسے ٹوٹ جاتا ہے

(۲۵؍جولائی ۲۰۰۶ء)

بارش

شوخ چنچل ہوا
ساحلِ بحر سے آنکھ مَلتی اُٹھی
کسمساتی ہوئی، پیچ کھاتی ہوئی
سنسناتی ہوئی،
شاخساروں پہ کلیاں کھلاتی ہوئی
رہگزاروں میں لہریں جگاتی ہوئی
ریت کے شامیانے بناتی ہوئی
چڑھ گئی کوہساروں پہ، اور اُڑ گئی آسماں کی طرف

پھر جو اُتری
تو تھی تر بتر
لذّتِ وصلِ کوہسار سے

(۱۳ را کتوبر ۲۰۰۶ء)

ٹھہرا ہوا منظر

وہی ہے زندگی پر شورشِ ایام کی یورش
وہی مجبور اور معذور پر آلام کی یورش
ہزاروں سال سے تہذیب کا منظر نہیں بدلا

وہی روزِ ازل کی بے ثباتی، خانہ ویرانی
پریشانی، پریشانی، پریشانی، پریشانی
وہی قسمت، وہی تقدیر کا محور نہیں بدلا

وہی آزادیٔ افکار پر پابندیاں لاکھوں
وہی ہیں جرأتِ اظہار پر پابندیاں لاکھوں
ہزاروں انقلاب آئے، نظامِ شر نہیں بدلا

وہی معصوم کے حلقوم پر نیزے یزیدوں کے
وہی ہیں بے کفن، بے خانماں لاشے شہیدوں کے
ہزاروں ہاتھ بدلے ہیں، مگر خنجر نہیں بدلا

کوئی تو لمحہ آئے جو ہزاروں سال کو بدلے
کوئی ایسا مسافر جو رہِ پامال کو بدلے
یہ دُنیا مٹ ہی جائے گی اگر منظر نہیں بدلا

(۱۱/اکتوبر ۲۰۰۶ء)

آؤ اِک خواب بُنیں

آؤ اِک خواب بُنیں
چاند سورج پہ لکھیں اپنا پیام
نئی دُنیا کے لیے
جو ابھی خواب میں ہے
تجربے اپنے بتائیں اس کو
اس کو آگاہ کریں — جب بھی وہاں کی مخلوق
خوابِ ازل سے جاگے
کلمۂ حق و صداقت کے سوا کچھ نہ پڑھے
اس کو یہ راز بتایا جائے
زندگی صرف محبت ہے، محبت کے سوا جو کچھ ہے
اپنی تخریب کا، بربادی کا دیباچہ ہے
ان ستاروں پہ جہاں کی مٹی
ابھی کنواری ہے، ابھی ہے معصوم
تخم ریزی نہ کریں نفرت کی
اور ہابیل میں قابیل میں واں جنگ نہ ہو

(۱۲/۱ اکتوبر ۲۰۰۶ء)

نقشِ قدم

مرے نقشِ قدم ہیں جتنی گلیوں، جتنے کوچوں، جتنے شہروں
جتنے صحراؤں میں — سب میرے قریب آئے
کہا، تم جاتے جاتے اپنے قدموں کے نشاں بھی ساتھ لے جاؤ
یہاں بے حرمتی ہوگی
مگر میں چپ رہا — سوچا
یہ میری زندگی کے تجربے ہیں،
نقش میری لغزشوں کے،
عکس ہیں میری ذہانت کے
بھلا ان پر میرا کیا حق
کہ اب یہ اگلی نسلوں کی امانت ہیں

(۱۴؍ اکتوبر ۲۰۰۶ء)

حادثہ

زمیں کے سینۂ سوزاں سے جب اُٹھتے ہیں انگارے
سمندر مشتعل ہوتا ہے، ساحل کے کنارے ٹوٹ جاتے ہیں
ہزاروں بستیاں، آبادیاں، غرقاب ہوتی ہیں

زمیں جھنجھلا کے جب لیتی ہے انگڑائی
تو پیہم زلزلے اس کی زباں بن کر
ہمیں آگاہ کرتے ہیں کہ تم اک بوجھ ہو دھرتی کے سینے پر
صدائے بے اماں سن کر
گھروں، محلوں، دو محلوں کی حقیقت کیا
پہاڑوں کے بھی سینے کانپ جاتے ہیں

ہماری زندگی اک حادثہ ہے
حادثے کی طرح جینا اور مرنا ہے
نفس کی ڈور پہ یہ آب و آتش کا سمندر پار کرنا ہے

(۳ر جنوری ۲۰۰۷ء)

مگر اب ہے سفر تنہا

تبسم، قہقہے، ناز و ادا، عشوہ طرازی
وعدۂ فردا
یہ سب کچھ خواب ہے گویا
گزاری زندگی ہم نے
مہکتے شوخ، رنگیں لالہ زاروں میں
چہکتے مرغزاروں میں
سجیلے گل عذاروں میں
دمِ گلگشت کل تھے ہم سفر سرِ رواں کتنے
مگر اب ہے سفر تنہا
قدم دھنستے چلے ہی جا رہے ہیں ریگِ صحرا میں

(۴ر جنوری ۲۰۰۷ء)

دشمن

چلو یہ مان لیتا ہوں کہ میں خود اپنا دشمن ہوں
مگر تم دوست تھے میرے
مجھے آگاہ کرتے تم
کہ میں زہراب پیتا ہوں،
مری باتوں میں کڑوے سچ کی آمیزش کی تلخی ہے،
لغت سے مصلحت کا لفظ میں نے کاٹ رکھا ہے،
زمانہ سازی ہے اک فن کہ جس سے نابلد ہوں میں
مجھے تم کچھ تو سمجھاتے

مگر تم بھی مرے دشمن ہی نکلے،
چشم پوشی کر کے شاید دے رہے ہو خود کو بھی دھوکا
مجھے لگتا ہے تم بھی اپنے دشمن ہو
اگر یہ دشمنی ہے، تو مقدس دشمنی ہے یہ،
ہماری دوستی کا مرکزی نقطہ

(۲۴ جنوری ۲۰۰۷ء)

میرا سفر

پلٹ کر جو دیکھوں تو گردِ سفر — اور گردِ سفر بھی کہاں، خاک اُڑتی ہے
ماضی کے صحرا میں، ہر نقشِ معدوم، تلوؤں میں ہے بس
چبھن زہر آلود کانٹوں کی، جن سے پڑا واسطہ ہر قدم
ہم سفر تھے کئی، غم کی سوغات دے کر روانہ ہوئے جانے کس سمت میں
میں کھڑا ہوں جہاں اس کے آگے سمندر ہے — میرا سفر
ختم ہے! یا نئی ابتدا ہے نئی منزلِ شوق کی!!

(۲۳/ مارچ ۲۰۰۷ء)

انعام

ایک چھوٹا سا درد کا کمرہ
اور پھر اس میں روشنی بھی نہیں
زندگی! کیا یہی ہے بس انعام
عمر بھر کی میری ریاضت کا

(۲۰/ مئی ۲۰۰۷ء)

رات! میرے ساتھ جاگ

جاگ اے رات مرے ساتھ،
نہ تو سو جانا
اپنے تاروں کو نہ سونے دینا،
ان سے رشتہ ہے مرا دیرینہ
دیکھنا، چاند نہ روپوش کہیں ہو جائے
اس کی ٹھنڈک سے اُجالا ہے مرے ذہن کے ایوانوں میں
ان چراغوں کو نہ بجھنے دینا
تیرے آنچل میں چمکتے ہیں جو موتی بن کر
میرے غم خانے میں بھی جن سے ضیا پاشی ہے
شہر خاموش ہے، سڑکیں سنسان
دن کے پر شور مناظر ویران
چمنیوں سے نہیں اُٹھتا ہے دُھواں
دَم بخود سارا جہان
ایسے سناٹے میں جینے کا مزا ہے کچھ اور
ایسا لگتا ہے کہ قدرت ہے مری بانہوں میں
بے صدا لفظ اُترتے ہیں مرے سینے میں
گفتگو ہوتی ہے خاموشی میں
جاگ اے رات مرے ساتھ، نہ جھپکا پلکیں
اس سے پہلے کہ کمیں گاہ سے نکلے سورج
مل کے ہم رقص کریں، رقص کریں
اور سناٹے کی پہنائیوں میں کھو جائیں

(۱۵ر مئی ۲۰۰۷ء)

امانت

نہیں معلوم میں تھا خواب میں، یا جاگتا تھا،
ایک منظر تھا نظر میں کتنا آسودہ
خیالوں کے پرندے اپنی میٹھی بولیوں میں چہچہاتے تھے
سناتے تھے مجھے پیغام پاکیزہ بزرگوں کا
جو کب کے جا چکے
ہاں ان کا سایہ سر پہ اپنے آج بھی محسوس کرتا ہوں
پرندوں نے کہا
تم دل سے چن لو درد کے کانٹے
ہمارے نام لکھ دو اپنے سب غم
مسکراؤ،
ہم تمھارے واسطے تحفے بہت سے چھوڑ آئے ہیں
یقیں، عزم مصمم، نفس کی پاکیزگی، الفت
حمیت، جرأت و ہمت، صداقت، حرف کی حرمت
ملا تھا جو ہمیں اپنے بزرگوں سے،
امانت ہے تمھاری
درد اور غم کا مداوا ہے
سنبھالو اس کو،
اس میں رنگِ نو بھرتے رہو،
یہ وہ امانت ہے
تمھیں پہچانی ہے جو اگلی نسلوں تک

(۶ جولائی ۲۰۰۷ء)

دو قدم کا فاصلہ

وقت کی دہلیز پر جب میں نے رکھا تھا قدم
دودھیا بادل گھرے تھے چار سو
کچھ نظر آتا نہ تھا

پھر ہوا محسوس،
خوشبو کے پرندے اُڑ رہے ہیں ہر طرف
اور کچھ رنگوں کے نقطے کہکشاؤں کی طرح
خواہشوں کے، چاہتوں کے، آرزوؤں کے گلاب
دعوتِ فکر و نظر دینے لگے،
جیسے بس ہوں دو قدم پر،
مرغزار،
گلستانِ پُر بہار

شوقِ نظارہ میں لیکن جب رکھا پہلا قدم
چبھ گئے کانٹے
ہوا محسوس ہر سو خارزار
اب بھی ہے دل کو یقیں
دو قدم پر ہے بہار
عمر گزری ہے، مگر اب تک نہیں طے ہو سکا
دو قدم کا فاصلہ

(۱۷ر جولائی ۲۰۰۷ء)

شہرِ نا آشنا

میں نے اس شہر میں
جب قدم رکھا
اِک بھیڑ تھی ہر طرف
لوگ اِک دوسرے سے تھے نا آشنا
چل رہے تھے، کہ چلنے پہ مجبور تھے
میں بھی مجبور تھا ــــ چل پڑا
چل رہا ہوں کہ مجبور ہوں
دوستی دُور کی بات ہے
دُشمنی کا بھی امکاں نہیں
ہائے یہ شہرِ نا آشنا

(۲۷ر جولائی ۲۰۰۷ء)

نظمیں

چاندنی کے پروں پر اُڑتی ہوئی
ہلکی پھلکی سبک سبک نظمیں
دل کے آنگن میں یوں اُترتی ہیں
جیسے خوشبوئیں تیری یادوں کی
رقص کرتی ہیں محفلِ جاں میں

(۲۳ر اگست ۲۰۰۷ء)

لبِ ساحل

کنارا یہ سمندر کا بہت ہی خوبصورت ہے
یہاں بس ریت ہے،
اور مضطرب لہریں،
جو ساحل تک پہنچ کر لوٹ آتی ہیں
یہ منظر دیکھ کر میں سوچ میں گم ہوں
وہ کیسا درد ہے، جو مضطرب رکھتا ہے ان لہروں کو ہر لمحہ
نہیں کیا ریت میں طاقت!
کہ ان کو جذب کر لے اپنے سینے میں
سکوں سے آشنا کر دے

(۲۸/ جولائی ۲۰۰۷ء)

خوابوں کی آنکھیں

مرے خوابوں کی آنکھوں میں وہ آنسو ہیں،
چھپا رکھا ہے میں نے جن کو دُنیا سے
مرے خوابوں کی آنکھوں میں وہ شعلے ہیں
جو پوشیدہ ہیں سینے میں
مرے خوابوں کی دنیا میں وہ افسانے
حقیقت جن پہ نازاں ہے
مرے خوابوں کی آنکھوں میں
تجسّس ہے نئے خوابوں کی دُنیا کا
مرے خوابوں کی آنکھوں میں تمنا ہی تمنا ہے
مرے خوابوں کی آنکھیں جاگتی رہتی ہیں ہر لمحہ
مرے خوابوں کی آنکھوں میں ہے نورِ عظمتِ فردا

(۸ر اگست ۲۰۰۷ء)

نشہ خوشگوار لمحوں کا

نچوڑتا رہا ماضی کو ظرفِ عبرت میں
خمیر اُٹھا تو صہبا کشید کی میں نے
لطیف رنگ، نشہ خوشگوار لمحوں کا
سنبھال کر اسے رکھا ہے دل کے شیشے میں

اُداس ہوتا ہوں جب، قطرہ قطرہ چکھتا ہوں
تمام تلخیٔ حالات بھول جاتا ہوں
سرور آتا ہے کچھ اور روز جینے کا

(۵ر ستمبر ۲۰۰۵ء)

خزاں

اُداس اُداس پھول ہیں
روش روش پڑے ہوئے
پلٹ پلٹ کے دیکھتی ہے
شاخ شاخ کو ہوا
کہ بچ سکے نہ کوئی پھول
اب کسی درخت پر

خبر کرو بہار کو
چمن میں آ گئی خزاں

(۶ر ستمبر ۲۰۰۷ء)

درد کی طغیانی

روز آنے لگی ہے طغیانی
درد کے بے کراں سمندر میں
دست و بازو ہوں یا دماغ و دل
ریشہ ریشہ بدن کا یا اعصاب
زد پہ آتے ہیں جب بھی طوفان کے
تند، سفاک، درد کی لہریں
شیشۂ جاں کو توڑ دیتی ہیں

اور مشکل سے جوڑتا ہوں میں
ریزہ ریزہ شکستہ ٹکڑوں کو

(۱۰ر ستمبر ۲۰۰۷ء)

ذہن کی رہگذر

یہ مرا ذہن،
خیالوں کی عجب راہگذر
ہم نوا ملتے ہیں اس راہ میں جب
ہر طرف پھول سے کھل جاتے ہیں
کبھی یہ راہ نظر آتی ہے سونی سونی
بھیڑ ہوتی ہے کبھی اتنی،
کہ ٹکراتے ہیں آپس میں خیالات حریفوں کی طرح
مسخ ہو جاتے ہیں چہرے اُن کے
ٹوٹ کر ایسے بکھر جاتے ہیں
لفظ مشکل سے ہی چُن پاتے ہیں ان کے ریزے

(۳۱ر اکتوبر ۲۰۰۷ء)

سرحدِ جاں سے پرے

سرحدِ جاں سے پرے
میں کبھی ہوتا ہوں ماضی کے نہاں خانوں میں
کبھی تہذیب کے اُجڑے ہوئے ایوانوں میں
کبھی ان زہرہ جبینوں کے شبستانوں میں
جو سدا مجھ سے گریزاں ہی رہیں
کبھی پرواز میں،
ان چاند ستاروں کی فضاؤں سے پرے
دیکھتے دیکھتے بچپن سے جنھیں تھک گئیں میری نظریں
کبھی کچھ ایسے جہانوں میں،
کہ جو میرے تخیل میں ہی رہتے ہیں سدا
اپنی مرضی سے بساتا ہوں انھیں
اور جب چاہوں مٹا دیتا ہوں

سرحدِ جاں سے پرے
جب بھی میں دُور نکل جاتا ہوں
اپنی مرضی سے میں ہوتا ہوں عیاں اور نہاں
پھر کہاں ذات مری
اور کہاں عقل و خرد کا زنداں

(۲۱ر ستمبر ۲۰۰۷ء)

نگینہ

یہ سانس جو مرے سینے میں دھونکنی کی طرح
ہے موجزن، مجھے رکھتا ہے ہر گھڑی فعال
اسی کی دین ہیں یہ عمر کے تراسی سال،
گواہ ہے، کہ فقط چند سال بچپن کے
گزارے میں نے نگینہ کی تنگ گلیوں میں
جہاں اُگا ہے بدن کا یہ منحنی پودا
وہ چند سال ہی بس زندگی کا حاصل ہیں

طویل عمر گزاری ہے میں نے شہروں میں
چمکتے شہر، چکاچوند سے بھرے دن رات
جہاں فریب دیئے زندگی نے ہر لمحہ،
نہ صرف دلّی و بمبئی ، ماسکو ، لندن
فضائے جدّہ و بغداد ، مشہد و لاہور
اِک ایک کر کے ہوئے جا رہے ہیں سب معدوم
بسا ہوا ہے نگینہ لہو کے ریشوں میں

(۷/دسمبر ۲۰۰۷ء)

طائرِ بے دام

اے دلِ ناداں بتا
کب تلک ماتم کروں اس طائرِ بے دام کا
آ کے جو کنجِ قفس میں
چُن کے دانے اُڑ گیا

اس قفس کی ریت ہے
اپنی مرضی سے کوئی آتا نہیں
اپنی مرضی سے کوئی جاتا نہیں
کوئی انجانی سی قوت پر لگا دیتی ہے — کیوں!
جانتا کوئی نہیں

تو بھی اُڑ جا
آنسوؤں کی یاں کوئی قیمت نہیں
تو سمجھتا ہے انھیں موتی مگر،
ان کو کوئی چنتا نہیں

(۵ر فروری ۲۰۰۸ء)

انجم کے نام

مصورِ حسنِ فطرت کے
سنا ہے انگلیوں میں تیری جادو ہے
ترے احساس کی رگ رگ نکھر جاتی ہے تیرے برش کی جنبش سے،
رنگوں میں چمک اُٹھتے ہیں سب سوئے ہوئے جذبات
منہ سے بولنے لگتی ہیں تصویریں

مری بھی ایک خواہش ہے
مری آواز جب پہنچے ترے ذوقِ سماعت تک
تو اے نقاشِ رنگ و بو
بنا کر شوخ رنگوں سے مری آواز کا پیکر
اسے کر دینا آویزاں فضاؤں میں

(۲۸ فروری ۲۰۰۸ء)

تقاضہ

میں ہوں اِک لہر،
بے آواز، بے نام
میں تیرے ذہن میں اِک فکر، اِک سوچ
مجھے تو لکھ،
مجھے اِک لفظ کر دے
مجھے اِک شکل دے دے

(۱۲/ مارچ ۲۰۰۸ء)

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

خالی الذہن

کبھی یوں ہوتا تھا،
احساس کے نازک پیکر
خود بخود ذہن کے آنگن میں اُتر آتے تھے
لفظ بنتے تھے، اور اشعار میں ڈھل جاتے تھے
میرے غم خانے میں رہتا تھا ہجوم

آج میں،
خالی الذہن ہوں،
احساس کی وادی میں ہے اِک سنّاٹا
خالقِ حرف و بیاں!
کوئی اِک لفظ کہ ہو ذہن کی دُنیا آباد
کوئی اِک شعر کہ تنہائی کا جادو ٹوٹے

(۷/اپریل ۲۰۰۸ء)

پانی پت

طویل نظم

ناشر
نورنگ کتاب گھر، نوئیڈا

اشاعت:
۱۹۹۷ء

انتساب

پانی پت کے عظیم فرزند
مولانا الطاف حسین حالی
کے نام

پانی پت: نوائے سروش

رفعت سروش کا شمار اُردو کے اہم، ممتاز اور معروف تخلیق کاروں میں ہوتا ہے۔ اُن کی زندگی کا بڑا حصہ آل انڈیا ریڈیو پر اُردو پروڈیوسر کی حیثیت سے گزرا ہے۔ انھوں نے ریڈیو کو بہت کچھ دیا ہے۔ اسی کے ساتھ ریڈیو نے بھی ان کی ادبی شخصیت کی تعمیر میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔

ریڈیو عوامی ترسیل کا ذریعہ ہے۔ ریڈیو کے طویل تجربے نے رفعت سروش کو یہی تخلیقی ادراک بخشا کہ بحیثیت شاعر اپنے اندازِ گفتگو کے اعتبار سے بقراط بننے کا نتیجہ ان کے اور ان کے قاری کے درمیان کمیونی کیشن گیپ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا، اس لیے بہتر یہی ہے کہ پیشہ ورانہ ترسیلی مہارت کو کام میں لاتے ہوئے وہ پیچیدہ زبان میں آسان بات کو مشکل بنا کر پیش کرنے کا چمتکار دکھانے کے بجائے غیر پیچیدہ، صاف، سادہ اور شگفتہ زبان میں مشکل بات کو آسان بنا کر پیش کرنے کا معجزہ جگائیں۔ چنانچہ انھوں نے ریڈیو کی ملازمت کو پوری لگن کے ساتھ جس ذمے داری کے ساتھ نبھایا، اس کا بھرپور فائدہ ان کے اندر کے تخلیقی فنکار نے بھی اٹھایا۔ اسی لیے انھوں نے ایسی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی، جس میں قاری تک کتابوں کی بجائے براہِ راست تخاطب کے ذریعے پہنچا جاتا ہے۔ اُن کے ریڈیائی ڈرامے، بیلے، اور ڈانس ڈرامے اسی کوشش کا کامیاب نتیجہ ہیں۔

رفعت کے ادبی شعور نے ایسے دور میں آنکھ کھولی جہاں ابھی تک غزل اپنی روایتی گھٹن سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئی تھی اور ترقی پسند تحریک کی غیر معمولی مقبولیت کے سبب نظم کی دنیا کا ایک بڑا حصہ مزدور اور سرمایہ دار جیسے موضوعات تک محدود تھا۔ اس ادبی صورتِ حال میں روشِ عام سے ہٹ کر چلنے والوں نے اپنے لیے نئی راہیں نکالنی شروع کیں۔ اسی نئی راہ نکالنے والی قبیل کے شاعروں میں ایک نام رفعت سروش کا بھی ہے۔ رفعت نے روشِ عام سے ہٹ کر چلنے کا قائل ہونے کے باوجود اپنی شاعری کو چیستان نہیں بنایا۔ وہ واضح طریقۂ اظہار کے ساتھ معنوی سطح پر نئے

تخلیقی تجربات سے گزرتے نظر آتے ہیں اور اسی کو انھوں نے اپنی شناخت بنایا ہے۔ رفعت کے کسی نقاد نے شاید اس حقیقت کی طرف توجہ نہیں کی نظم کی طرح نثر پر بھی رفعت کو پوری قدرت ہے۔ ان کی نثر بہت سادہ سلیس اور شگفتہ ہوتی ہے۔ نظم کی طرح ان کی نثر میں بھی دل کو چھو لینے والی بے تکلف گفتگو کا سا انداز ہوتا ہے۔ وہ انتہائی پیچیدہ اور فلسفیانہ موضوعات کو بھی بہت آسان زبان میں بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی نثر کی یہ خوبی بھی ریڈیو ہی کی دین ہے۔ غرض یہ ہے کہ ان کی نظم اور نثر دونوں میں شگفتگی تازگی اور تخلیقی توانائی ہے۔ اب اس کا کیا کیا جائے کہ بہت سے نقادوں نے ادبی گروہ بندی کی وجہ سے نظم اور نثر میں رفعت کی ممتاز حیثیت کو عرصے تک نظر انداز کیا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب ان کی شعری صلاحیتوں کا اعتراف ہونے لگا ہے۔

بہت عرصہ ہوا میں نے رفعت کی شاعری پر ''انسانی عظمت کا شاعر: رفعت سروش'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا۔ جس میں ترقی پسند تحریک سے ان کے تعلق کے بارے میں خاصی تفصیل سے گفتگو کی تھی۔ میں اس مقالہ کا ایک حصہ یہاں نقل کرنا چاہتا ہوں میں نے لکھا تھا کہ:

''رفعت سروش ان فنکاروں میں ہیں جو جمہوری ترقی پسندی کے قائل ہیں۔ یہ وہی جمہوریت ہے جس کا آغاز کچھ عرصے پہلے روس اور دوسرے کمیونسٹ ملکوں میں ہوا ہے۔ ان فنکاروں کے لیے فن کسی سیاسی نظریے کے پرچار کا نہیں، اپنی شخصیت، تجربے اور فکر کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ ان فنکاروں نے سامراجیت اور سرمایہ داری کے خلاف آواز تو بلند کی لیکن اپنے لہجے کو غیر شاعرانہ خطابت اور نعرہ بازی سے محفوظ رکھا۔ رفعت سروش کا اندازِ گفتار وہی ہے جو جاں نثار اختر مجروح سلطانپوری اور اختر الایمان جیسے ترقی پسند شاعروں کا ہے ان کا لہجہ نرم اور دھیما ہے رفعت ترقی پسند رہے لیکن انھوں نے فکر کے دریچوں کو ہمیشہ کھلا رکھا۔ جس کی سزا اسکہ بند ترقی پسند شاعر آج تک انھیں دے رہے ہیں۔ حالانکہ خود رفعت نے ''مری صدا کا غبار'' کے حرفِ آغاز میں اعتراف کیا ہے کہ ''میرے ذہن و فکر نے اُس دور میں ترقی پسند تحریک سے جو کچھ جذب کیا وہ آج بھی میرے لیے سرمایہ افتخار ہے کیونکہ میں نے زندگی کے لیے جدو جہد کرنا، حق بات پر اصرار کرنا اور غلط رویوں سے اختلاف کرنا اسی تحریک سے سیکھا۔''

ترقی پسند نظریات اور ریڈیو کے ذریعے عوام سے براہِ راست تعلق قائم ہونے کی وجہ سے رفعت سروش کے موضوعات کا کینوس بہت وسیع اور متنوع ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ ہمارے ان نقاد حضرات کی مشقِ ستم سے محفوظ رہے جن کا مبلغِ علم مغرب کے چند نقادوں تک محدود ہے۔ اُردو

میں تنقید فنکار کے نہیں بلکہ اس کے سماجی وقار یا اس کے ساتھ ذاتی تعلقات کی بنیاد پر ہوتی ہے، اس لیے ان نقاد حضرات نے جس فنکار کا بینڈ باجا بجایا، وہی بیچ منجدھار میں ڈوبا۔ فنکار کے ڈوبنے کی دو وجہیں تھیں ایک تو یہی کہ فنکار اس کا اہل نہیں تھا کہ اس کے فن کی طرف زیادہ توجہ کی جاتی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ فنکار کی مدح میں ایسا قصیدہ پڑھا گیا کہ فنکار کی تخلیقی صلاحیتیں زنگ آلود ہو گئیں۔ فن رہا نہ فنکار۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ رفعت کا نظم اور نثر دونوں میں کینوس بہت وسیع ہے۔ نثر میں انھوں نے افسانے اور دو تین کتابیں اپنی زندگی کے حالات پر لکھی ہیں اور شاعری میں تو ان کے موضوعات میں اتنا تنوع ہے کہ ان کے ہم عصر فنکاروں میں کوئی ایسا فنکار نہیں ہے۔ جس نے اتنے مختلف موضوعات کو ایسے متنوع پیرایوں میں بیان کیا ہو۔ رفعت نے بہت بڑی تعداد میں غزلیں بھی کہی ہیں، غزل کے علاوہ انھوں نے رباعیاں، قطعے، نثری نظمیں، طویل نظمیں، مختصر نظمیں، اوپیرا، منظوم ڈرامے ڈانس ڈرامے اور شخصی مرثیے کہے ہیں۔ ریڈیو کے لیے انھوں نے منثور اور منظوم ڈرامے لکھے ہیں۔ ریڈیو ہی کے راستے اسٹیج سے ان کا تعلق قائم ہوا ہے انھوں نے بیلے، اوپیرا اور ڈانس ڈرامے لکھے ہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ اُردو میں سب سے پہلے رفعت سروش ہی نے اوپیرا تخلیق کیا۔ ان کے اوپیرا ''شاہجہاں کا خواب'' کے بارے میں کسی نے لکھا تھا کہ ''یہ ڈرامہ فکر واحساس کا تاج محل ہے اور اُردو کا پہلا اوپیرا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُردو میں اوپیرا بہت ابتدائی شکل میں موجود تھا۔ اُردو میں پہلا اوپیرا امانت کی اندر سبھا ہے۔ عمیق حنفی اور سلام مچھلی شہری نے بھی اوپیرا لکھے تھے۔ مگر انھیں مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔ رفعت نے اسے ہمارے عہد کے تقاضوں کے مطابق نیا آہنگ اور نئی زندگی بخشی۔ رفعت کا اوپیرا ''تاج کی کہانی'' (بعد میں اس کا نام بدل کر شاہجہاں کا خواب کر دیا گیا) اتنا مقبول ہوا کہ پورے ہندوستان میں اسے سینکڑوں بار اسٹیج کیا گیا۔ یہ مقبولیت ہندوستان کی کسی بھی زبان میں لکھے گئے اوپیرا کو حاصل نہیں ہوئی۔ رفعت سروش عصری زندگی کے اہم مسائل اور واقعات کو یا عام دلچسپی کے اہم تاریخی واقعات اور زندگی کی ارضی سچائیوں کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ وہ تاریخی واقعات اس مورخ کی طرح بیان نہیں کرتے جس کا سارا زور تاریخوں، اہم شخصیتوں اور تاریخی واقعات کی جزئیات پر ہوتا ہے اور نہ ہی ان کی تاریخی نظمیں کسی مخصوص عہد کی منظوم تاریخ ہوتی ہیں۔ رفعت تو ایسے تاریخی واقعات کا انتخاب کرتے ہیں جن کی اہمیت اور مقبولیت آج بھی برقرار ہے اور آج بھی جس سے ہم اپنے مسائل حل کرنے کا فن اور بہتر زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھ سکتے ہیں۔ رفعت ہندوستان کی تاریخ کے خوشگوار واقعات

اور الم ناک حادثوں اور عظیم شخصیتوں کو شعری پیکر میں اس طرح ڈھالتے ہیں کہ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ہماری نظروں کے سامنے ہو رہا ہے۔

پانی پت رفعت سروش کی تازہ ترین تخلیق ہے۔ یہ نظم ہندوستان کی تقریباً پانچ ہزار سال کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ ہمارے سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کے ارتقاء کی آئینہ دار ہے۔ پانی پت سے بہت قریب کروکشیتر کا وہ میدان ہے جہاں کوروؤں اور پانڈوؤں نے حق اور باطل کی لڑائی لڑی تھی۔ کروکشیتر اور پانی پت کی اہمیت یہ ہے کہ یہاں حق و باطل، ظلم و انصاف، انسانیت و بہیمیت اور کمزور و طاقتور آپس میں نبرد آزما ہوتے تھے ان جگہوں نے ہندوستان کی تاریخ کا رُخ موڑ دیا تھا۔

رفعت نے پانی پت کو پہلی بار موضوعِ سخن بنایا ہے۔ اگرچہ اس نظم میں اہم سیاسی، تہذیبی اور سماجی واقعات اُجاگر کئے گئے ہیں اور صوفیائے کرام کا بھی ذکر کیا گیا ہے، لیکن بنیادی طور پر یہ نظم رزمیہ ہے۔ جس میں دل کو ہلا دینے والے میدانِ جنگ کا شور و غوغا بھی ہے اور صوفیائے کرام کی دلوں کو متاثر کرنے والی نرم گفتاری بھی۔

نظم کے دو کردار بنیادی ہیں۔ تاریخ اور پانی پت یہ دونوں واقعات اور کرداروں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

نظم کا آغاز پانی پت کے ان مکالموں سے ہوتا ہے:

اک شہر ہوں ، پانی پت مرا نام
دل میں ہے ازل سے میرے کہرام
تاریخ کی دھول میں اٹا ہوں
ہریانہ میں اک طرف پڑا ہوں
تہذیب کے کارواں ہزاروں
تخریب کے کارواں ہزاروں
گزرے ہیں مسل کے میری چھاتی
ہر زخم ہے میرے دل میں باقی
زخموں سے مرے جو خون بہا ہے
تاریخ کو اس نے بھی لکھا ہے
سنتا ہوں میں اب بھی ایک آواز
تہذیب کا ہو رہا ہے آغاز

اس کے بعد مہابھارت کے دو عظیم کردار یدھشٹر اور دریودھن گفتگو کرتے ہوئے دکھائے جاتے ہیں۔ یدھشٹر اور ان کے چار بھائی تیرہ برس کے بن باس کے بعد واپس آئے ہیں پھر بھی یدھشٹر چاہتے ہیں کہ بھائیوں میں آپس میں جنگ نہ ہو بلکہ کسی طرح صلح ہو جائے، مگر دریودھن کسی طرح نہیں مانتے:

یدھشٹر: بھائیو! ہم ہیں اک خون کے رُوپ رنگ
ہم نہیں چاہتے خون سے اپنے جنگ
ایک ہیں، ایک دادا کی سنتان ہیں
ہستنا پور کی آن ہیں شان ہیں
ایک آنگن میں کھیلے ہیں بچپن سے ہم
پیار کے پھول چنتے تھے گلشن سے ہم
آج اگر ہم ہی آپس میں لڑنے لگیں
سوچیے! کیا کہے گا زمانہ ہمیں

دریودھن اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ یدھشٹر کا مطالبہ ہے کہ انھیں اور ان کے چار بھائیوں کو پانی پت، سونی پت، اندر پرست، تل پت اور باغ پت کے علاقے دے دیئے جائیں تا کہ وہ باقی زندگی آرام سے گزار سکیں۔ لیکن دریودھن کسی طرح نہیں مانتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بقول پانی پت:

پھر رن وہ پڑا کہ توبہ توبہ
وہ خون بہا کہ توبہ توبہ
کچھ دور تھا مجھ سے گوکروکشیتر
آواز کے گونجنے میں کیا دیر
میں نے بھی سُنا وہ شور و غوغا
میدان سے جنگ کے جو اٹھا
بھارت کے تمام راجہ آئے
آئے اور اپنی فوج لائے
جب صبح ہوئی بدل گئے طور
میدان کا رنگ ہی تھا کچھ اور

ارجن نے دیکھا کہ مقابل میں اس کے اپنے بھائی ہیں تو انھوں نے لڑائی میں حصہ لینے سے انکار کر دیا ارجن کہتے ہیں:

نہیں نہیں یہ لڑائی مجھے نہیں منظور
یہی ہے جنگ! تو بدلو یہ جنگ کا دستور
بھلا میں کس سے لڑوں! سب عزیز ہیں میرے
اور ایسے بھائی ہمیشہ جو ساتھ ہیں کھیلے
وہ جن کی گود میں رکھا ہے میں نے اپنا سر
میں کیسے تیر چلاؤں گا بھیشم پتامہ پر
وہ گنگا پُترا، نہ چاہیں تو مر نہیں سکتے
ہیں ایسے ویر کسی سے وہ ڈر نہیں سکتے
گرو دردن سے سیکھی ہے تیر اندازی
اُمید مجھ سے کہ میں ان سے جیت لوں بازی

اس موقع پر کرشن جی ارجن کو وہ تلقین کرتے ہیں جسے گیتا کہا جاتا ہے اور جس کا شمار دنیا کی عظیم ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ کرشن کہتے ہیں:

گانڈیو سنبھالو، پارتھ اُٹھو
دویدھا کے بھنور سے آج نکلو
آیا ہے سمے، اٹھاؤ ہتھیار
چپ بیٹھ کے ظلم سہنا بے کار
ظالم سے لڑو وہ کوئی بھی ہو
رکھنی ہے وطن کی لاج تم کو
یہ جنگ نہیں ہے باہمی جنگ
دراصل یہ ہے اصول کی جنگ
یاں کوئی نہ باپ ہے نہ بھائی
ہے جھوٹ اُدھر، اِدھر سچائی
گرنے نہیں پائے گا یہ پرچم
گو جھوٹ کرے گا سعیٔ پیہم

ارجن نے ہتھیار اُٹھا لیے جنگ شروع ہوئی، جو اٹھارہ دن تک جاری رہی۔ بالآخر دریودھن مارے گئے اور پانڈوؤں کو فتح نصیب ہوئی۔

اس جنگ کے بعد تاریخ نمودار ہو کر اپنا تعارف ان الفاظ میں کراتی ہے:

''سلام اے ارضِ پانی پت!
ترے سینے میں ہیں اسرار وحدت کے
ترے ذروں پہ ہیں مرقوم افسانے شجاعت کے
میں ہوں تاریخ،

میں ہرگز نہیں اک ملک اور اک قوم کی میراث،
میں تو زندگی کی وسعتوں کو اپنے پہلو میں سمیٹے
وقت کے رہوار پر گرمِ سفر ہوں کتنی صدیوں سے

تاریخ حضرت شیخ شرف الدین ابوعلی شاہ قلندر کی عظمت کا ذکر کرتی ہے۔ جس پر پانی پت کہتا ہے:

ذکر کچھ اس طرح تو نے بو قلندر کا کیا
آج اے تاریخ تو نے سازِ دل کو چھولیا
سات صدیاں یک بیک آنکھوں سے اوجھل ہوگئیں
شدتِ جذبات سے پلکیں بھی بوجھل ہوگئیں
ہند کی عظمت کا منظر ہے نظر کے سامنے
اور دَورِ بو قلندر ہے نظر کے سامنے
ہے اجودھن یا کہ دلّی، کلیر اور اجمیر ہے
صوفیائے چشتیہ کی ہر جگہ توقیر ہے

حضرت بوعلی شاہ قلندر کی مدح کرتے کرتے رفعت سروش بعض عظیم صوفیائے کرام کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ یہاں سے موضوع بدل جاتا ہے اور تاریخ کہتی ہے:

مجھے نفرت رہی ہر دَور میں جنگ و جدل سے،
قتل و غارت سے
مگر سود و زیاں کا مسئلہ میرا نہیں،
یہ مسئلہ ہے ابنِ آدم کا
جسے اس کی ہوس نے ملک گیری کا دیا لالچ
ہوا وہ برسرِ پیکار اپنے ہم جلیسوں،
بھائی بہنوں سے

تاریخ کئی صدیوں کے اہم تاریخی واقعات بیان کر کے ہندوستان جنت نشاں کی خوبیاں بیان کرتی ہے۔ یہاں رفعت نے پچاس ساٹھ اشعار میں ہندوستان کا جغرافیہ اور یہاں کے حسین موسموں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے قدیم ہندوستان سے اپنی محبت اور وابستگی اور ساتھ ہی قدرتِ کلام کا اظہار کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

زندگی پھیلی ہوئی ہے قریہ قریہ گاؤں گاؤں
سرزمینِ ہند میں ہے موسموں کی دُھوپ چھاؤں
ہو اگر ذوقِ تماشہ ایک سے اک لاجواب
گردشِ ارض و سمانے جیسے کھولی ہو کتاب
زندگی کی لہر دوڑائے زمستاں کی ہوا
برف کی خلعت پہنتی ہے کہستاں کی فضا
گدگدے بستر کی لذت عیش کا سامان ہے
روئی کے موٹے لحافوں کی نرالی شان ہے
فصل لہراتی ہے کھا کر دُھوپ، گاتا ہے کسان
دُھوپ کی چادر بچھی ہے، دھوپ کا ہے سائبان

رفعت نے ہندوستان کی صدیوں کی تاریخ اختصار کے ساتھ دل نشین انداز میں بیان کردی ہے۔

اس کے بعد پانی پت کے میدان میں بابر، ابراہیم لودھی، ہیموں اکبر اور احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کی جنگوں کا انتہائی مؤثر انداز میں ذکر کیا ہے۔ آخر میں سرزمین پانی پت کا نام روشن کرنے والے اُردو کے پہلے معتبر نقاد اور صفِ اوّل کے شاعر مولانا الطاف حسین حالی کی سیاسی فکر، حب الوطنی، انسان دوستی اور شاعرانہ عظمت پر روشنی ڈالی ہے۔ رفعت کے لیے سرزمین ہند کا ہر ذرہ دیوتا ہے۔ وہ غیر معمولی سیکولر انسان ہیں۔ اسی لیے انھوں نے ہندوستان کے تاریخی واقعات تمام تعصّبات سے بلند ہوکر ایک غیر جانب دار دانشور اور حسّاس دل رکھنے والے شاعر کی حیثیت سے بیان کیے ہیں۔

یہ نظم ایسی ہے جس میں حقائق بھی ہیں اور تخیل کی رنگ آمیزی بھی۔ ابدی قدروں کی عکاسی بھی ہے اور فکر کی گہرائی اور گیرائی بھی۔

فکر و احساس کی سطح پر رفعت کی مثال ہندوستان کی دھرتی سے پھوٹے ہوئے ایک ایسے پودے کی سی ہے جس کے وجود میں دیس کی مٹی کی خوشبو، اس کے پانی کی نمو، اس کی ہواؤں کی سرمستی

اور اس کے موسموں کا ترنم ہوتا ہے۔ رفعت نے اس دیش کی مٹی، پانی، ہوا، پہاڑوں اور موسموں کے تناظر میں ہندوستان کی قدیم تاریخ اور تہذیب کو دیکھا ہے۔ تاریخ کے آتے جاتے قافلوں کی نیرنگی بار بار اپنے سب کچھ میں جوڑ کر، پھر اپنے نئے وجود میں تبدیل ہونے کا قوس وقزح کا روپ اور خود کو اس تمام کا اٹوٹ حصہ ماننے کا عرفان۔ یہ وہ منزل ہے جو آدمی کے وجود سے فاسد خون کو نکال کر باہر پھینک دیتی ہے۔ اور پھر انسانیت کی وہ اعلیٰ وارفع منزل آتی ہے جہاں رام، کرشن، گوتم، نانک، چشتی، بوعلی شاہ قلندر ایک ساتھ اس کے دل کی دھڑکن بن جاتے ہیں۔ ان دھڑکنوں سے شاعری مصرعۂ طرح پر کہی گئی اپنی منزل سے، بہت اوپر اُٹھ کر 'نوائے سروش' بن جاتی ہے۔

میرے نزدیک اس نظم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے اور جو رفعت سروش کے ایک حقیقی شاعر ہونے کا ثبوت ہے کہ انھوں نے تاریخ کو اپنا موضوع بنایا ہے، مضمون نہیں۔ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں اور انھوں نے اپنے آپ کو شاعر ہی رہنے دیا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ انھوں نے مورخ بننے کی کوشش نہیں کی۔ اگر وہ ایسا کرتے تو پھر حقائق پر مبنی یہ ایک ہلکی پھلکی نظم یا منظوم تاریخ ہو کر رہ جاتی۔ رفعت نے تاریخی واقعات کی جزئیات اور تاریخی استناد کے معاملات کو مورخ پر چھوڑ دیا ہے اور اپنی شاعرانہ بصیرت اور تخلیقی صلاحیت کو کام میں لاتے ہوئے تاریخ کے بین السطور کی سیر کرانے کی کوشش کی ہے۔ اس اعتبار سے اس نظم میں تاریخ اُن کی مخاطب ہے اور وقت وہ خود ہیں۔ یہ مسئلہ محض منظوم تاریخ لکھنے سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے اور اس میں اس طرح کے چیلنج ہیں جو منظوم داستان لکھنے کے مقابلے میں منظوم ڈرامہ لکھنے میں ہوتے ہیں، جس کے لیے شاعر کو اظہار کی آزادی کا استعمال بھی کرنا پڑتا ہے اور فارم کی وحدت کی حدوں کو بھی پار کرنا پڑتا ہے۔ عروض کی سطح پر بھی اور صنف کی سطح پر بھی۔ اس طرح فنکار 'جو کہہ سکے وہی کہہ پائے' کی مجبوری سے گزر کر 'جو کہنا چاہے وہی کہہ دے' کی کھلی فضا میں سانس لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور یہی وہ فنکارانہ رویہ ہے جو کسی رزمیہ یا مہا کاویہ کو جنم دیتا ہے۔ ان خصوصیات نے اس نظم کو قابلِ قدر سرمائے کی حیثیت دے دی ہے۔

——— ڈاکٹر خلیق انجم

جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی

یکم فروری ۱۹۹۷ء

پانی پت
(ایک طویل نظم)

پانی پت: اِک شہر ہوں پانی پت مرا نام
دل میں ہے ازل سے میرے کہرام
تاریخ کے دھول میں اَٹا ہوں
ہریانہ میں اِک طرف پڑا ہوں
تہذیب کے کارواں ہزاروں
تخریب کے کارواں ہزاروں
گزرے ہیں مسل کے میری چھاتی
ہر زخم ہے میرے دل میں باقی
زخموں سے مرے جو خوں بہا ہے
تاریخ کو اس نے بھی لکھا ہے
سنتا ہوں میں اب بھی ایک آواز
تہذیب کا ہورہا ہے آغاز

یدھشٹر: بھائیو! ہم ہیں اِک خون کے رُوپ رنگ
ہم نہیں چاہتے خون سے اپنے جنگ
ایک ہیں، ایک دادا کی سنتان ہیں
ہستنا پور کی آن ہیں شان ہیں
ایک آنگن میں کھیلے ہیں بچپن سے ہم

پیار کے پھول چنتے تھے گلشن سے ہم
اِک گرو نے ہی پڑھنا سکھایا ہمیں
زندگی کا قرینہ سلیقہ سکھایا ہمیں
تیر ، تلوار ، بھالا ، تبر اور گدا
ہر کھلونا ہے بچپن سے برتا ہوا
شِشیہ ہیں ہم گرو درون آچاریہ کے
چاند سورج گرادیں جو اِک بان سے
ہستنا پور کے شاہزادے ہیں ہم
اپنے پرکھوں کا رکھنا ہے ہم کو بھرم
آج اگر ہم ہی آپس میں لڑنے لگیں
سوچئے کیا کہے گا زمانہ ہمیں

دریودھن: بزدلی کا ہمیں طوق پہنائے گا
ہے جو بزدل وہ شتری نہ کہلائے گا
شاہزادوں کا شیوہ ہے مردانگی
یدھشٹر: اور آپس میں لڑنا ہے دیوانگی
دریودھن: کھلتے ہیں جنگ میں جوہر انسان کے
جنگ سے دوار کھلتے ہیں سمان کے
جنگ ہے اپنا سکّہ جمانے کا نام
جنگ ہے اپنی طاقت بڑھانے کا نام
ہے یہ للکار بھیم آئے لے کر گدا
ہم بھی دیکھیں کہ ہے کس قدر حوصلہ
تیر انداز ارجن نکل کر تو آئے

ہے جو ہمّت کمان اپنی بڑھ کر اٹھائے
آپ بھی بھالا اِک پھینک کر دیکھئے
سامنے ہوں کھڑا ، پھینکیے ، پھینکیے

یدھشٹر: کون کس سے لڑے! بھائی اِک بھائی سے!!
اور وہ بھی فقط سلطنت کے لیے
سلطنت ، بادشاہت مبارک تمھیں
سننا چاہو تو اِک بات تم سے کہیں

دریودھن: کہیے سچائی کے دیوتا ! بولیے
ہم سنیں گے ضرور ، اپنے لب کھولیے

یدھشٹر: ہم لڑائی نہیں چاہتے ہیں مگر

دریودھند: اس مگر میں چھپایا ہے کوئی اگر

یدھشٹر: ہاں ، اگر تم سنو غور سے مشورہ

دریودھند: مشورہ میں چھپا ہے کوئی فلسفہ!

یدھشٹر: تم ہو سو ، ساری دنیا مبارک تمھیں
پانچ ہیں ہم ، چاہئیں پانچ گاؤں ہمیں
پانی پت ، سونی پت اور اندر پرست
تین یہ ، اور تل پت اوراک باغپت

دریودھند: پانچ گاؤں تمھیں پیار سے دان دوں
اور تمھاری عنایت کا احسان لوں

یدھشٹر: دریودھن ! اپنا وعدہ کرو یاد تم

دریودھند: کیسا وعدہ ، ہوئے خود ہی برباد تم
ہار جائے جوئے میں جو پتنی کو بھی
عقل کی ہے کمی اس میں سو فیصدی

کیا بنے گا وہ راجہ جو عاقل نہیں
تم کسی طرح گدی کے قابل نہیں

یدھشٹر: دھاندلی ہے یہ، وعدہ خلافی ہے یہ
دریودھن: قید سے تم ہو آزاد، کافی ہے یہ
یدھشٹر: ہم نے بن باس کاٹا ہے تیرہ برس
اب بھی آتا نہیں تم کو ہم پر ترس
دریودھن: تم ہو اڑیل تو سن لو مرا فیصلہ
آ گیا وقت اب آخری جنگ کا
بے لڑے تم کو دوں گا نہ ہرگز زمیں
سوئی کی نوک کے بھی برابر نہیں
مسئلے کا اگر حل ہے تو جنگ ہے
یہ زمیں اب تمھارے لیے تنگ ہے
آؤ میدان میں جتنے ہو سورما
ہو کروکشیتر میں آمنا سامنا

پانی پت: پھر رن وہ پڑا کہ توبہ توبہ
وہ خون بہا کہ توبہ توبہ
کچھ دور تھا مجھ سے گو کروکشیتر
آواز کے گونجنے میں کیا دیر
میں نے بھی سنا وہ شور و غوغا
میدان سے جنگ کے جو اٹھا
بھارت کے تمام راجہ آئے
خود آئے اور اپنی فوج لائے

جب صبح ہوئی بدل گئے طور
میدان کا رنگ ہی تھا کچھ اور
سورج نے سنبھالے اپنے نیزے
خیموں سے تمام یودھا نکلے
صف آراء ہوئیں تمام فوجیں
دریا تھا کہ لے رہا تھا موجیں
ارجن نے نگاہ جب اُٹھائی
اور دیکھا کہ سامنے ہیں بھائی
جتنے تھے بزرگ ، سب مقابل
کہلاؤں گا کل میں ان کا قاتل!
جھنجھلایا کہ یہ لڑائی کیسی
ارجن نے وہیں کمان رکھ دی

ارجن: نہیں نہیں ، یہ لڑائی مجھے نہیں منظور
یہی ہے جنگ ! تو بدلو یہ جنگ کا دستور
بھلا میں کس سے لڑوں! سب عزیز ہیں میرے
اور ایسے بھائی ہمیشہ جو ساتھ میں کھیلے
وہ جن کی گود میں رکھا ہے میں نے اپنا سر
میں کیسے تیر چلاؤں گا بھیشم پتامہ پر
وہ گنگنا پتر ، نہ چاہیں تو مر نہیں سکتے
ہیں ایسے ویر کسی سے وہ ڈر نہیں سکتے
گرو درون سے سیکھی ہے تیر اندازی
اُمید مجھ سے کہ میں ان سے جیت لوں بازی!
میں ان کے سامنے کیسے اُٹھا سکوں گا دھنش
عجب گھڑی ہے کہاں آ گیا ہے آج منش

پانی پت: یہ سُن کے کرشن مسکرائے
ارجن کے وہی تو سارتھی تھے
گیتا کی تبھی ہوئی تھی رچنا
ارجن سے یہ کرشن نے کہا تھا

کرشن: گانڈیو سنبھالو ، پارتھ اُٹھو
دُویدھا کے بھنور سے آج نکلو
آیا ہے سمے ، اٹھاؤ ہتھیار
چپ بیٹھ کے ظلم سہنا بیکار
ظالم سے لڑو وہ کوئی بھی ہو
رکھنی ہے وطن کی لاج تم کو
یہ جنگ نہیں ہے باہمی جنگ
دراصل یہ ہے اصول کی جنگ
یاں کوئی نہ باپ ہے نہ بھائی
ہے جھوٹ اِدھر ، اُدھر سچائی
گرنے نہیں پائے گا یہ پرچم
گوجھوٹ کرے گا سعیٔ پیہم
کثرت سے نہ دشمنوں کے گھبراؤ
یہ وقتِ عمل ہے سامنے آؤ

پانی پت: ارجن کے کمان اٹھائی آخر
تہذیب کی زندگی کی خاطر
اور بھیم نے جب گدا چلایا

میدان پہ موت بن کے چھایا
تھے دونوں طرف مہان یودھا
گرشِشیہ اِدھر، گرو اُدھر تھا
یہ جنگ ہوئی اٹھارہ دن تک
آندھی سی چلی اٹھارہ دن تک
سرکٹ کے گرا جو دریودھن کا
پرچم ہوا پانڈووں کا اونچا
سچائی کا اِک نشان میں تھا
مجھ سے تھا محبتوں کا رشتہ
پانڈوں نے مجھے عزیز رکھا
تہذیب کے حسن سے سنوارا
اور مجھ کو ملی وہ نیک نامی
تاریخ نے دی مجھے سلامی

تاریخ: سلام اے ارضِ پانی پت!
ترے سینے میں ہیں اسرار وحدت کے
ترے ذرّوں پہ ہیں مرقوم افسانے شجاعت کے
میں ہوں تاریخ،
میں ہرگز نہیں اک ملک یا اِک قوم کی میراث،
میں تو زندگی کی وسعتوں کو اپنے پہلو میں سمیٹے،
وقت کے رہوار پر گرمِ سفر ہوں کتنی صدیوں سے
مری نظروں نے دیکھا ہے وہ عالم
جب بنی آدم نے اپنے بال و پر کھولے

اُڑا تہذیب کے شہپر لگا کر اس زمیں کے گوشے گوشے میں
عراق و شام کے صفحات پر لکھے فسانے اپنی عظمت کے
صداقت کی وہ کشتی تھی،
جو اتری جھوٹ کے طوفان میں،
پہنچی سرِ ساحل
کہ اس کا ناخدا تھا نوح سا خوددار پیغمبر
براہیمی حمیّت میں نے دیکھی ہے،
وہ سچائی کی قوّت تھی،
جو اُتری
بے خطر شعلوں کے صحرا میں
بنایا آگ کو گلزار —
اور ہر پھول پر لکھا —
صداقت کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے،
ملایا خاک میں نمرود کو،
اس کے غرور و خود فریبی کو
مرے صفحات پر ہیں نینوا، بابل،
مگر اِک داغ کی صورت
حیاتِ جاوداں کے خواب دیکھے مصر میں فرعون نے لیکن،
کہا یہ نیل کی موجوں نے —
ہر اک چیز فانی ہے،
نہیں ہے مادّیت کو بقا، بس روح زندہ ہے
اسی کا نام نیکی ہے، اسی کا نام سچائی
یہی سچائی موسیٰ کی عصا تھی، معجزہ جیسے،

ثمود و عاد کی اقوام کا انجام ہے میری نگاہوں میں
مرے صفحات پر مرقوم ہے یونان کی اور روم کی عظمت
زمینِ چین پر خاقان اور ایران میں کسریٰ،
سبھی پر ہے نظر میری
ہزاروں سال کی جہد و عمل کا ماحصل یہ ہے،
کہ جب انسان مادّیت پہ اُتر آیا،
غرور و تمکنت میں،
قتل و غارت،
بربریت اور فحاشی کو،
بنایا اس نے مسلک،
خوں بہایا اس زمیں پر بے گناہوں کا
تو اس کی خود فریبی کو،
صداقت نے دکھایا ایسا آئینہ،
کہ منہ کے بل گرا،
اب نام اس کا یاد آتا ہے حقارت سے
عمل صالح کیا جس نے،
رہا زندہ مرے صفحات کی خوش رنگ جنت میں
سلام اے ارضِ پانی پت،
کہ تو نے خیر و شر کے معرکے دیکھے
صدا جو کرشن کی تو نے سنی،
'گیتا' جسے کہیے،
عروجِ فکرِ انسانی
سراسر درسِ رُوحانی

یہ ہے تلقین گیتا کی
عمل کرنا،
مگر دل کو نہ ہو یہ فکر — کل انجام کیا ہوگا
وہ قوت جس کے ہاتھوں میں ہے کاروبار دنیا کا
وہی سوچے کہ اچھا کیا، بُرا کیا ہے
سلام اے ارضِ پانی پت!
ترے سینے میں ہیں اسرار وحدت کے
ترے ذرّوں پہ ہیں مرقوم افسانے شجاعت کے
ہواؤں میں تری ہیں موجزن نغمے محبت کے
مجھے ہے علم،
تیری خاک سے پیدا ہوئے،
ایسے قلندر، جن کی عظمت سے
فضا پاکیزہ ہے تیری
ہیں تیری گود میں آسودہ حضرت شیخ شرف الدین،
یعنی بوقلندر، کتنی صدیوں سے
مزار ان کا ہے گویا نور کا مرکز
جو آئے صدق دل سے نور کی سوغات لے جائے
وہ ہندو یا مسلماں ہو،
کسی مذہب کا ہو —
انسان ہو، دل سے دُعا مانگے
نہیں ممکن کہ خالی ہاتھ لوٹے کوئی بھی در سے قلندر کے
سُنا کچھ داستاں ان کی

پانی پت:

ذکر کچھ اس طرح تو نے بوقلندر کا کیا
آج اے تاریخ تو نے سازِ دل کو چھولیا
سات صدیاں یک بیک آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں
شدّتِ جذبات سے پلکیں بھی بوجھل ہو گئیں

ہند کی عظمت کا منظر ہے نظر کے سامنے
اور دورِ بوقلندر ہے نظر کے سامنے
ہے اوجودھن یا کہ دلّی، کلیر اور اجمیر ہے
صوفیائے چشتیہ کی ہر جگہ توقیر ہے
خانقاہیں ان بزرگوں کی ہیں یادرِ بارِ عام
تشنہ کاموں کا لگا ہے ایک میلہ صبح و شام
منبعِ فیضانِ رحمت صوفیائے چشتیہ
ان کا جو خادم بنا مخدوم دنیا میں ہوا
جو خدا سے لَو لگائے کیا اسے دنیا کی فکر
زندگی ہے اِک عبادت لب پہ ہو جب اس کا ذکر
دُور ہیں لہو و لعب سے بندگانِ پارسا
کتنی پاکیزہ مقدس خانقاہوں کی فضا
جھوٹ اور مکر وریا، غیبت، سبھی سے دُور ہیں
معرفت کے جام پی کر سب نشے میں چُور ہیں

بختیار کاکی حضرت خواجہ قطب الدین سا
مرشدِ کامل، فقیہہِ عصر دلّی کو ملا

شہر دلّی ، نور سے معمور تھی جس کی فضا
آئینے کو بادشاہوں نے مکدّر کر دیا
قتل و غارت، خون ریزی ہے حکومت کا مزاج
تاجِ شاہی کی حقیقت! جیسے ہے کانٹوں کا تاج
کیا عجب سلطان ہے، جو، کل وہ ہو جائے فقیر
کاروبارِ سلطنت والے ہیں کتنے بے ضمیر
ہر طرف غدّار ہیں اور عام ہے محسن کُشی
آدمیت سے گریزاں ہو چکا ہے آدمی
سلطنت کی چاہ میں انسان کتنا گر گیا
بھائی بھائی کا ہے قاتل ، اور بیٹا باپ کا
خلجی و بلبن ہوں یا شہزادگانِ ذی وقار
سب کے دل کی اِک صدا ہے، اقتدار و اقتدار
ایسے سلطانوں کے دل میں کیا رعایا کا ہو درد
جامِ نخوت پی کے جن کا ہو چکا ہے خون سرد
لیتی ہے تلوار ان کی اہلِ ایماں سے خراج
خانقاہوں میں مگر محفوظ ہے انساں کی لاج
حضرتِ کاکی کی عظمت کا ہے سکّہ چار سو
ہیں دو زانو صوفیائے وقت ان کے رُوبرو
اس کو کہیے ان کے باطن کی طہارت کا فسوں
وقت کے سلطان ان کے سامنے ہیں سر نگوں
اور ہے موجود دلّی میں نظامی خانقاہ
چاہتے ہیں لیں دُعائیں آ کے والیِ عالم پناہ
ہیں اسی دربار میں ہر وقت خسرو نغمہ زن
معرفت کے نور کی تابانیاں جلوہ فگن

شانِ استغنا کا عالم ! تکیہ برفضلِ خدا
مرحبا! یہ صوفیائے چشتیہ کا مرتبہ
ایک ہیں ان کی نظر میں ہندو مسلم، خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ بابرہمن رام رام
یہ فضا تھی ، یہ زمانہ تھا کہ جب بخشا گیا
مجھ کو شرف الدین، پیشانی پہ جس کی نور تھا

میں پانی پت ، مجھے ہے فخر فرزندِ قلندر پر
کہ جس کے فیض سے میں ہو گیا مہرولی کا ہمسر
امامِ بوحنیفہ سے نسب کا سلسلہ ان کا
خوشا میرے مقدر میں تھا یہ ایمان کا گوہر
وہ بی بی فاطمہ کے بطن سے جس دن ہوئے پیدا
مجھے ہے یاد، رقصاں تھا فضا میں نور کا پیکر
جلال الدین ہنسوی کے یہ خالہ زاد بھائی تھے
وراثت میں انھیں گویا ملے تھے صدق کے جوہر
وہ گہوارہ تھا علم و معرفت کا جس میں یہ جھولے
کہ بی بی فاطمہ تھیں حافظہ، رحمت سدا ان پر
فضا میری منور تھی ، جہاں میرا معطر تھا
کھلے تھے میرے آنگن میں علومِ دین کے دفتر
حدیث اور صرف و نحو، تفسیر اور علم فقہ یعنی
علوم ظاہری کے چُن لیے، جتنے ملے جوہر
چمکنا تھا اسے اب وسعتِ افلاکِ عظمت پر
وہ میری آنکھ کا قطرہ تھا لیکن بن گیا گوہر

علومِ باطنی کی پیاس نے جب کر دیا بیکل
تلاشِ رہبرِ کامل میں نکلے مضطرب ہو کر
نکل کر میری سرحد سے چلے وہ سوئے مہرولی
تو مسجد قوّت الاسلام کا ان کو ملا منبر
بہائے علم کے دریا، کیا سیراب دنیا کو
رہے بارہ برس وہ مسندِ پند و نصیحت پر
تڑپ دل کی انھیں پھر لے گئی دربارِ کا کی میں
تو قطب الدین سے درویش نے ڈالی نظر ان پر
نظر کیا تھی، منوّر ہو گیا باطن کا ہر گوشہ
نظر کیا تھی، کہ روشن ہو گیا معنی کا ہر دفتر
نظر کیا تھی کہ ان پر کھل گئے اسرار وحدت کے
نظر کیا تھی کہ ذرّہ بن گیا خورشید کا ہمسر
نیا عالم، نئی سنگت، نئے ماحول نے آخر
بنایا صحبتِ اہلِ طریقت کا انھیں خوگر
شہاب الدین سے عالم نے ان پر لطف فرمایا
ہوئے حضرت نظام الدین سے بھی آپ بہرہ ور
مگر بیتابیٔ دل تھی کہ بس بڑھتی ہی جاتی تھی
وہ رستہ اور تھا لے جا سکے جو ان کو منزل پر
کتابیں علم کی دولت سے مالا مال کرتی ہیں
مگر مجذوب تو تکیہ نہیں کرتے کتابوں پر
مقام ایسا بھی آتا ہے کہ خود کو بھول جاتے ہیں
مقامِ خود فراموشی ہر اک عالم سے بالاتر
وہ خود کو جذب کر دیتے ہیں انوارِ الٰہی میں

نظر آتا ہے بس دنیا کو ان کا ظاہری پیکر
مقامِ خود فراموشی پہ شرف الدین جب پہنچے
زمانے سے ہوئے بیزار خود سے بے خبر ہو کر
کتابیں پھینک دیں دریا میں اور برسوں ریاضت کی
گزارے جانے کتنے سال پانی میں کھڑے ہو کر
یہ عالم دیکھ کر مجذوب کا، رحمت کو جوش آیا
ریاضت دیکھ کر ان کی، فرشتے ہوئے ششدر
ندا آئی، ولایت تم کو پانی پت کی بخشی ہے
قلندر ہو گئے تم معرفت کی راہ پر چل کر
اُٹھو رُوحانیت کی روشنی دنیا میں پھیلاؤ
کوئی خدمت فلاحِ آدمیت سے نہیں بڑھ کر

بوعلی قلندر کی رُوح کو سرور آیا
روشنی محبت کی لے کے اپنے گھر لوٹا
میری خاک نے پائی ان کے نام سے شہرت
ان کو جب ملی عظمت، بڑھ گئی مری عزّت
بوعلی قلندر کا فیضِ عام جاری تھا
وقت کے سلاطیں پر ان کا رُعب طاری تھا
کشف اور کرامت کا دُور دُور شہرہ تھا
شہر شہر چرچا تھا ان کی بے نیازی کا
معترف کمالوں کا ان کے تھا علاء الدین
چاہتا تھا خدمت سے کچھ ملے اسے تسکین
دھاک تھی زمانے میں بوعلی قلندر کی

تھا سوال، جائے کون لے کے تحفۂ شاہی
سب امیر خائف تھے رعب سے قلندر کے
جن میں اتنی جرأت تھی وہ امیر خسرؔو تھے
خوب تھا وہ منظر بھی جب امیر خسرؔو آئے
اور حضورِ شرف الدین تحفۂ علائی لائے

امیر خسرو: شیخ شرف الدین قبلہ! اے طریقت کے امام
آپ کی سرکار میں دربارِ دہلی کا سلام
ارضِ پانی پت ہے یہ، شاہِ ولایت آپ ہیں
جس سے ہے سلطانِ دہلی کو عقیدت، آپ ہیں
شیخ شرف الدین: میں ہوں محبوبِ الٰہی کے درِ عظمت کی خاک
ذکرِ محبوب الٰہی سے زباں تیری ہے پاک
خسرو: شاہِ دہلی کی طرف سے نذر یہ کیجے قبول
شیخ: نذر لیں شاہوں کی، کیا یہ ہے فقیروں کا اصول!
خسرو: میں تو ہوں بس ایلچی، میرا نہیں کوئی قصور
اپنے مرشد کی رضا سے، ہوں یہاں حاضر حضور
شیخ: تم ہو وہ خسرو جو ہیڑی گو ہے اور شاعر بھی ہے!
ہے مصاحب شیخ کا، اس فن میں وہ ماہر بھی ہے
کچھ سناؤ، ہم بھی دیکھیں کیا ہے رنگِ شاعری
خسرو: عرض کرتا ہوں، مگر میں کیا ہوں! ننگ شاعری

غزل

اے کہ گوئی، ہیچ سختی چوں فراقِ یار نیست
گر امیدِ وصل باشد آں چناں دشوار نیست

عاشقاں را در جہاں یکساں نہ باشد روزگار
زانکہ ایں انگشتہا بر دستِ من ہموار نیست
خلق را بیداری باید بوز آبِ چشمِ من
ایں عجب کاں وقت می گوئم کہ کس بیدار نیست
چند می گوئی برو رنتار بند اے بت پرست
بر تنِ خسرو وکدامی رگ کہ آں زنار نیست

شیخ: مرحبا خسرو؟ کرشمہ ہے نظامی فیض کا
سوز و سازِ شاعری سے دل کو روشن کر دیا
خوب کہتے ہو، کہو گے خوب اور خوش جاؤ گے
واسطے سے اپنے مرشد کے مرادیں پاؤ گے

خسرو: آپ نے یہ کہہ کے ذرّے کو بنایا آفتاب
میری قسمت، آپ کی صحبت سے ہوں میں فیضیاب

شیخ: ہم بھی کچھ فکرِ سخن کرتے ہیں سن لو اِک غزل
بس یہ سمجھو، دل میں اپنے شاعری کا ہے خلل

غـزل

دیہم خسرواں برما فعل استر است
خسرو کسے کہ حلقہ و تجرید برسر است
سیمرغ دار اور نہفتم بقافِ عشق
گو عارف کہ منظرِ او عرشِ اکبر است
نخلِ کلست علمِ لدنیٔ بعارفاں
ایں عقل علم وحسنِ فردوس مقرر است
گفتم ز علم و عقل بہ ملکے دگر شوم
ملکم ز علم و عقل چوں دیدم فزوں تر است

درسِ شرف بنود بہ الواحِ ابجدی
لوحِ جمالِ دوست مرا در برابر است
(خسرو رونے لگتے ہیں)

شیخ: کیا سمجھ میں آ گیا رونے لگے جو اس قدر
خسرو: کچھ نہیں آیا سمجھ میں، روتا ہوں اس بات پر
شیخ: صاف گوئی اس ادائے خاص سے، اے مرحبا!
تم نے تو خسرو ہمارے دل پہ جادو کر دیا
خسرو: آفتابِ معرفت ہیں آپ، ہیں دانائے راز
میری خوش بختی، ہوا ہے آپ سے حاصل نیاز
اب اجازت دیجیے، تحفہ یہ کر لیجے قبول
شیخ: تم ہو باغِ چشتیہ کی شاخ کے رنگین پھول
چاہتے ہیں ہم کہ پانی پت رکو دو چار دن
آئے مہرولی سے تو یاں بھی رہو دو چار دن
خسرو: آپ کے ہر حکم کی تعمیل میرا فرض ہے
شیخ: تم ہو میرے پیر بھائی، حکم کیا ہے، عرض ہے

پانی پت: نوائے خسرو دہلی مرے ماحول میں گونجی
لکھی تاریخ گویا وقت نے مہر و محبت کی
سنائے شیخ شرف الدین نے اشعار وحدت کے
لبِ خسرو پہ آئے والہانہ عشق کے نغمے
عجب منظر تھا جب دونوں وہ کرتے تھے گل افشانی
وہ دریا معرفت کے تھے، یہ فکر و فن میں لاثانی
محبت ہی محبت تھی، لطافت ہی لطافت تھی

تصوّف کی مہک ہر سو مرے ماحول میں پھیلی
چلے دلّی کو جب خسرو، بھر آیا دل قلندر کا
لکھا حضرت نظام الدین کی خدمت میں اِک رقعہ
کہا خسرؔو سے، محبوبِ الٰہی کا اشارہ ہے
تو ہم نے رکھ لیا، سلطانِ دہلی کا جو تحفہ ہے
مگر اس کو لکھا ہے، تختِ شاہی پر نہ اترانا،
سدا کس کی رہی ہے شان، بن جاؤ گے افسانہ
"علاء الدین فوطہ دار، کو معلوم ہو جائے
کرے خلقِ خدا سے وہ بھلائی، سب کے کام آئے"
مگر تاریخ ہی بتلائے گی دنیا پہ کیا گزری
عمل کتنا کیا اس نے نصیحت پر قلندر کی

صوفیا میں شیخ شرف الدین ہیں زندہ مثال
آدمی خود کو مٹا دے، پھر بنے گا باکمال
عالمانہ، عارفانہ شان تھی جب تک جیے
کی ریاضت اور عبادت، اور یا لکھا کیے
'حکم نامہ' ان کی تصنیفات میں ہے بے مثال
جس میں ان کی پاک باطن شخصیت کا ہے جلال
سات سو چوبیس ہجری کو ہوئے واصل بہ حق
زندگی ان کی محبت کا ہے اِک روشن ورق
ان کا مرقد آج گویا ہے مری عظمت کا باب
میرے دامن میں کئی صدیوں سے ہیں وہ محوِ خواب

تاریخ:

خاکِ پانی پت تری عظمت کو رفعت کو سلام
تیری محفل میں سدا چھلکا کیے وحدت کے جام
خواجہ شرف الدین تو بیشک ترے فرزند تھے
فرض پورا کر کے تیری گود میں ہی سو گئے
تیری مٹی میں ہے صدیوں سے تصوّف کی مہک
خواجگانِ چشتیہ سے ہے تصرّف کی مہک
تیرے ہی دامن میں خوابیدہ ہیں شمس الاولیا
چل کے ترکستان سے آئے یہاں وہ باصفا
حضرتِ صابر نے کلیر سے انھیں بھیجا یہاں
معرفت کا بابِ تابندہ ہے ان کی داستاں
نام شمس الدین، ترکستان میں پیدا ہوئے
ہند میں آئے مگر تطہیر باطن کے لیے
صحبتِ گنجِ شکر ان کو میسّر آ گئی
نورِ حق سے ہوگئی معمور ان کی زندگی
مرشدِ کامل فریدالدین سے پایا بہت
حضرتِ گنج شکر نے بھی انھیں چاہا بہت
پھر ہوا ارشاد، تشنہ ہے تمھاری زندگی
حضرتِ مخدوم علاء الدین صابر کلیری،
ہیں تمھارے منتظر، جاؤ اجودھن سے وہاں
بیعتِ صابر سے ہو جاؤ گے اِک دن شادماں
'اسم' اِک ایسا انھیں مخدوم صابر سے ملا
جس نے ان کے شیشۂ دل کو مجلّی کر دیا
خدمتِ صابر میں گیارہ سال گزرے اس طرح
گرد اپنی شمع کے پروانہ رہوے جس طرح

تین دن گزرے وصالِ خواجۂ کلیر کو جب
کوچ کلیر سے کیا اور پہنچے پانی پت میں تب

پانی پت:
اور میرے ذرّے ذرّے نے کیا ان کو سلام
میرے دامن میں کیا اس پاک باطن نے قیام
خود نہیں آئے تھے صابر کی وصیت لائی تھی
اور مرے ہی پاس گزری ان کی باقی زندگی
سلسلہ رشد و ہدایت کا یہاں جاری رہا
سلسلہ ان کے فیض و برکت کا یہاں جاری رہا
سات سو سولہ سنِ ہجری میں پائی تھی وفات
آج بھی پہنچا رہی ہے فیض لیکن ان کی ذات
تھے وہ شمس الاولیاء، پایا لقب ''مشکل کشا''
صوفیوں میں کس قدر اونچا ہے ان کا مرتبہ

تاریخ:
میں کہ ہوں تاریخ، دیکھے میں نے یہ سب ماہ و سال
آفتابِ علم و عرفاں کا نہیں ہوتا زوال
جاوداں ہے تیری عظمت، بے خزاں تیری بہار
ارضِ پانی پت ترا پاکیزہ شہروں میں شمار
شہر کی پاکیزگی شاہوں کے محلوں سے نہیں
تخم سے نیکی کے بیشک پاک ہوتی ہے زمیں
ہیں مبارک شہر وہ، صوفی جہاں آ کر بسے
اور فضا میں گونج اٹھے وحدانیت کے فلسفے
ہے مرے صفحات پر مرقوم تاریخِ حیات
وقت کی تسبیح کے دانے ہیں سارے واقعات

زندگی سرچشمہ ایسا جس کے ہیں دھارے ہزار
ایک ہی منزل سبھی کی، راستے ہیں بے شمار
تذکرہ دو مختلف دھاروں کا کرنا ہے یہاں
دورِ وسطیٰ کی ذرا تصویر کرنی ہے عیاں

دلّی وقنوج میں، پنجاب وراجستھان میں
خانہ جنگی کی وبا پھیلی ہے ہندوستان میں
دور جے چندوں کا ہے ٹھہرے جو غدّارِ وطن
ان کی خصلت میں ہیں شامل، فتنہ وشر، مکروفن
ہے فضا مسموم گھر کی، دشمنی اور بیر سے
ہے رقابت باہمی، امداد مانگی غیر سے

ہے یہ پس منظر جب آئے قافلے اسلام کے
غزنی وقندھار وکابل اور عرب سے شام سے
ان میں کچھ تھے جنگجو، کچھ صاحبِ کشف وکمال
ہے مرے اوراق میں محفوظ ان دونوں کا حال
جنگجو وہ تھے جو آئے تھے طلب میں مال کی
لیکن ان کے ساتھ تھے کچھ پاک باطن، متّقی
جنگجو دامِ ہوس میں خود ہی پھنس کر رہ گئے
سیم وزر کی، چاہ کی دلدل میں دھنس کر رہ گئے

قتل وغارت، بربریت، الاماں والحذر
جم گئے ہیں خون کے قطرے مرے اوراق پر

اور ان قطرات کی تفسیر ہے کتنی کثیف
باپ کا بیٹا ہے دشمن، بھائی کا بھائی حریف
سلطنت کا زعم سب کو، دولت وثروت کی چاہ
ان کی عظمت کے کھنڈر ہیں بے ثباتی کے گواہ

جو مگر روحانیت کی شمع لے کر آئے تھے
دولتِ فقر و قناعت ساتھ اپنے لائے تھے
ہند کی مٹی سے آئی ان کو الفت کی مہک
ویر و گوتم کے گلستاں سے صداقت کی مہک
پاسباں ان کی فقط اِک عظمتِ کردار تھی
روح ان کی معرفت کے کیف سے سرشار تھی
علم کی دولت سے بے شک ہو چکے تھے بہرہ ور
باطنی فیضان گویا تھا ریاضت کا ثمر
وہ جہاں بیٹھے، وہیں اِک انجمن بنتی گئی
انجمن اہلِ طریقت کا وطن بنتی گئی
دِلّی واجمیر، اجودھن، پانی پت لاہور میں
اور بدایوں، کلیر و ملتان اور ناگوار میں
نام کس کس کے گناؤں ہر جگہ تھی یہ بہار
طالبانِ حق چلے آئے قطار اندر قطار
صوفیائے پاک باطن محرمِ اسرار تھے
خانقاہیں تھیں کہ فیضِ عام کے دربار تھے
ہندو مسلم، پارسی، شاہ و گدا، پیر و جواں
صدق دل سے جو بھی آتا فیض پاتا تھا یہاں

بے غرض ہاتھوں میں گر ہو خانقاہوں کا نظام
یہ روایت آج بھی زندہ ہے با صد احترام
اتحادِ باہمی ، یک جہتیٔ قومی یہاں
خانقاہوں میں اخوّت کا ہے پرچم زرفشاں
مادیت کے دوراہے پر کھڑی ہے زندگی
معنویت آج ان کی بڑھ گئی ہے اور بھی
ارضِ پانی پت ترے سینے میں نورِ معرفت
خیر و شر کے دور میں تو مرکزِ روحانیت

پانی پت: بہت ممنون ہوں تاریخ!
تُو نے آئینہ تہذیب کا دکھلا دیا مجھ کو
کیا مسرور مجھ کو،
دل کو فرحت بخش دی تو نے

مجھے بھی فخر ہے،
روحانیت کے گلستاں کا پھول ہوں میں بھی
بتاؤں کیا تجھے تاریخ!
جب بھی خیر و شر کا ذکر آتا ہے
تو میرے دل سے اُٹھتا ہے دُھواں جیسے
مرے انفاس کرتے ہیں فغاں جیسے
ہر اک ذرّہ چیخ جاتا ہے میرا،
روح و جاں کی اُڑ رہی ہوں دھجیاں جیسے
ہر اک سو خون کے سیلاب اُمنڈ آتے ہیں،

جن میں تیرتے ہیں بے گنہ انساں
کسی کا سر نہیں ہوتا،
کسی کے جسم کے چیتھڑے ہواؤں میں بکھرتے ہیں
کسی کے ہاتھ غائب،
اور کسی کا پاؤں کٹ کر دُور جا پڑتا ہے،
منزل کے تصوّر میں
بگولہ بن کے ہستی ناچتی ہے آدمیت کی
نظر آتے ہیں ہر سو جب مظاہر بربریت کے
سماعت پر مری اِک شور چھا جاتا ہے،
تلواروں کے ٹکرانے کا،
توپوں کے دہانوں سے اُگلتی آگ کے شعلے بھڑکنے کا
جھلس دیتے ہیں جسم و جاں کو یہ شعلے
سروں میں بھون دیتے ہیں دماغوں کو
مجھے یاد آتی ہیں جنگیں،
ہوئیں جب بھی وہ برپا،
بن گیا آنگن مرا،
میدان محشر کا
کئی سو سال گزرے،
پر یہ چیخیں اور چنگھاڑیں،
یہ توپوں کی گرج،
تیغوں کی جھنکاریں
مرے اعصاب پر طاری رہیں شاید قیامت تک
یہ کس کا توپ خانہ ہے!

گرجتا ہے تو ہاتھی چیختے چنگھاڑتے،
اور روندتے اپنی ہی فوجوں کو
پلٹ جاتے ہیں مسکن کی طرف اپنے
یہ بُزدل—
چلتے پھرتے کوہ پیکر، دیو قامت،
اپنے مالک کو کچلتے ہیں
یہ کس کا تیر ہے جو زنزناتا ہے ہوا میں،
اور پہنچتا ہے نشانے تک
جری یہ کون ہے جو اپنے دشمن کو شکستِ فاش دیتا ہے
سمندر میں لہو کے ناؤ کھیتا ہے

بتا تو ہی بتا تاریخ!
تجھ کو کیا ملا اس خون کے سیلاب سے،
اس قتل و غارت سے
میں امن و آشتی کے نشے میں سرشار تھا،
اور معرفت کے گیت گاتا تھا،
یہ خونی بھیڑیے کیوں میرے میدانوں میں در آئے،
بتا تاریخ تجھ کو کیا ہوا حاصل!!

تاریخ: مجھے نفرت رہی ہر دور میں جنگ و جدل سے،
قتل و غارت سے
مگر سود و زیاں کا مسئلہ میرا نہیں،
یہ مسئلہ ہے ابنِ آدم کا،
جسے اس کی ہوس نے ملک گیری کا دیا لالچ

ہوا وہ برسرِ پیکار اپنے ہم جلیسوں،
بھائی بہنوں سے
میں وہ لوحِ حقیقت ہوں،
کہ جس پر وقت لکھ دیتا ہے اِک اِک بات،
سچ کی روشنائی سے
نہیں ممکن کوئی جھٹلا سکے مجھ کو
مرا خالق ہے انساں،
اور میں ہوں اس کا آئینہ
طرفداری کسی کی میں نہیں کرتی،
مگر مجبور ہوں میں اپنی فطرت سے
جہاں بھی ظلم ہوتا ہے،
مری آنکھوں میں آ جاتے ہیں اکثر خون کے آنسو

پانی پت: مری حالت کو بھی دیکھو
مرے سینے زخموں میں بھی اکثر ٹیس ہوتی ہے
مرے سینے میں وہ ناسور ہیں،
جن کا مداوا ہو نہیں سکتا

تاریخ: فقط تو ہی نہیں،
دنیا میں تجھ جیسے بہت ہیں،
جن کے سینے میں،
دھنسے ہیں جنگ کے خنجر
نکلنا ان کا ممکن ہی نہیں،
پہچان ہیں ظلم و تشدد کی
مرے اوراق ایسے تذکروں سے ہو گئے چھلنی

مگر ہے زندگی کی تلخ سچائی،
کہ اس کی شوخیٔ تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
یہ دنیا ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہے لیکن
قبیلے جب بنے،
تو ہر قبیلے میں ہوئے ہابیل اور قابیل بھی پیدا
بنا جنگ وجدل کی پڑ گئی،
اور ہو گیا انسان اپنے بھائی کے ہی خون کا پیاسا
ہر اک یگ میں 'مہابھارت' مری آنکھوں نے دیکھا ہے
مرے اوراق پر باقی ہیں اس کے خون کے دھبّے
مگر ہر خیر و شر کی جنگ کا انجام ہے میری نگاہوں میں
بالآخر خیر ہی کی جیت ہوتی ہے
ترے پہلو میں پانی پت
ہوئے پیوست جنگوں کے کئی نشتر
تباہی تو نے بھی دیکھی ہے،
میں بھی اس کی شاہد ہوں
مگر وہ جبر ہے حالات کا،
جس سے مفر ممکن نہیں ہوتا

پانی پت: مرے میدان کی پہلی لڑائی، کا یہ منظر ہے
مغل فوجیں اُتر آئیں کہستاں سے
مسلّط جنگ کر دی،
ڈوب کر جب خون کے دریا سے اُبھرے،
فتح اُن کی تھی
یہ بیرونی تسلّط کا تھا عبرت ناک نظارہ

تاریخ: ہوا — بیشک ہوا ایسا،
مگر تھا یہ پرانا کھیل،
جو اک بار پھر کھیلا گیا میدان میں تیرے
بیاں کرنے دے مجھ کو باہری حملوں کا پس منظر

خطۂ ہندوستاں جغرافیہ کی اِک اکائی
دستِ قدرت نے بڑی محنت سے یہ جنت بنائی
اِک طرف کوہِ ہمالہ جس کا دامن پُر بہار
اِک خزانہ ہے عجائب کا مقدس کوہسار
شرق سے تا غرب فطرت کی کھلی ہے اِک کتاب
اس کی عظمت ہے مسلّم، آئے کتنے انقلاب
تاج سر پر برف کا پہنے کھڑا ہے شان سے
ہے پہاڑوں کا یہ راجہ، صاف ظاہر آن سے
آئیں جب بادل تو برسیں اس کا دامن چوم کر
تہہ سے اُٹھیں گنگناتے، شوخ چشمے جھوم کر
چار سمتوں میں بہادے دولتِ آبِ رواں
لہلہائیں سندھ اور گنگ وجمن کی وادیاں

دوسری جانب ہے بحرِ ہند سا ساگر عظیم
ہے بہت مشکل، ادھر سے آسکے کوئی غنیم
تہہ نشیں ہیں لولو و مرجان اور موتی ہزار
ہو نہیں سکتا کبھی پوشیدہ دولت کا شمار
جوش میں ساگر ہو تب اُڑتے ہیں بادل کے جہاز

اور ہے ان بادلوں پر ارضِ ہندوستاں کو ناز
مینہ برستا ہے تو لو دیتی ہے مٹّی پیار کی
دل کو چھولیتی ہے ننھی کونپلوں کی راگنی
ساگر و کہسار کے ہے بیچ یہ ارضِ حسیں
ایسی جنت ہے کہ ثانی اس کا دنیا میں نہیں
صبح بکھراتی ہے سونا، سُرخ مخمل کی ہے شام
دوپہر پھولوں کی محفل، رات ہے خوشبو کا نام

زندگی پھیلی ہوئی ہے قریہ قریہ، گاؤں گاؤں
سرزمینِ ہند میں ہے موسموں کی دُھوپ چھاؤں
ہو اگر ذوقِ تماشا، ایک سے اِک لاجواب
گردشِ ارضِ وسمانے جیسے کھولی ہو کتاب
زندگی کی لہر دوڑائے زمستاں کی ہوا
برف کی خلعت پہنتی ہے کہستاں کی فضا
گدگدے بستر کی لذّت عیش کا سامان ہے
روئی کے موٹے لحافوں کی نرالی شان ہے
کھیت ہو، کھلیان ہو، یا جھونپڑا ہو یا محل
سردیوں کی دُھوپ گویا ایک نعمت بے بدل
فصل لہراتی ہے کھاکر دُھوپ، گاتا ہے کسان
دُھوپ کی چادر بچھی ہے، دُھوپ کا ہے سائبان
اور گرمی، دُھوپ کا اِک چلچلاتا رُوپ ہے
موسمِ ہندوستاں کا چہچہاتا رُوپ ہے
برف پگھلی، کوہساروں میں چڑھے دریا تمام

ہر طرف ہونے لگا ہے تیرنے کا اہتمام
ململ اور ریشم کے کپڑے پھر ہوئے ہیں زیب تن
دن ڈھلا اور گھر سے نکلے سیرِ گل کو گل بدن
خس کے پنکھے، ہر طرف چھڑکاؤ، کیا کیا اہتمام
پھول بیلے کے پہن کر آئی ہے گرمی کی شام

کٹ گئی ہے فصل تو رونق ہے اب کھلیان میں
بوریاں گیہوں کی آ کر بھر گئیں دالان میں
تھے پریشاں لو سے، اب چلنے لگی پُروا ہوا
کم ہوئی گرمی تو موسم آ گیا برسات کا
آسماں پر بادلوں کی بن گئی ہے چھاؤنی
بوندا باندی ہو رہی ہے، دھوپ سے راحت ملی
آم کے باغوں میں کوئل کوکتی ہے بار بار
پڑ گئے پیڑوں میں جھولے، آئی گیتوں کی بہار
اتنی بارش! اتنی بارش ہے کہ جل تھل ہو گیا
گھر ٹپکتا ہے کسی کا، گر گیا ہے جھونپڑا
پر یہی بارش ضمانت کل کی خوشحالی کی ہے
آس اور اُمید باغِ ہند کے مالی کی ہے
رک گئی بوچھار تو کاندھے پہ ہل رکھے کسان
چل پڑے کھیتوں تو کو، ہے بیلوں کی جوڑی ان کی شان
سردی گرمی اور برکھا، شان ہندوستان کی
ہیں یہی رنگینیاں پہچان ہندوستان کی
اور اک موسم بسنتی بھی دکھاتا ہے جھلک

جام کتنا ہی سنبھالو ، پھر بھی جاتا چھلک
کھیت سرسوں کے جو کھلتے ہیں تو آتی ہے بہار
'پھول گندوا' اپنے جوڑے میں سجاتی ہے بہار
پیلے پیلے بانے پہنے پھر رہی ہیں لڑکیاں
ہیں دوپٹے بھی بسنتی اور بسنتی چوڑیاں

موسموں کی اتنی رنگینی کہاں دنیا میں اور
دستِ قدرت کی یہ فیاضی کہاں دنیا میں اور
دور تک پھیلے ہوئے سرسبز میداں ہیں یہاں
ہو ، کا منظر ہو فقط ، ایسے بیاباں ہیں یہاں
وہ گھنے جنگل جہاں دن پر گماں ہو رات کا
ہاتھیوں کے جھنڈ واں ، اس سمت شیروں کی گپھا
ریگ زاروں میں بگولوں کا نظارہ دل فریب
لالہ زاروں میں گلوں کا ہے شرارہ دل فریب
ندیاں چاندی کی ہیں ، سونا اُگلتی ہے زمیں
خاک کے ذرّے ہیں یاں لعلِ بدخشاں سے حسیں
جنتِ اہلِ نظر ہیں گل بہ داماں وادیاں
چاند تاروں سے بھرا رہتا ہے اکثر آسماں
الغرض ہندوستان دنیا میں ہے اپنی مثال
دل نواز و روح پرور ، دلکشا اس کا جمال

حسن کی یہ دولتِ نایاب دشمن بن گئی
روزِ اوّل سے رہی اس پر نظر اغیار کی
نسلِ آدم تھی یہاں آباد قرنوں سے مگر
روشنی اب تک نہیں ڈالی گئی اس قوم پر

ہے مری نظروں میں بھی اس دور کا دھندلا نشاں
باہری لوگوں کے حملوں کی ہے لمبی داستاں
آئے وسطِ ایشیا سے جب یہاں پر آریہ
مختلف تھا ان کے طرزِ زندگی کا زاویہ
ہوگئے مسحور وہ ہندوستاں کو دیکھ کر
اس زمیں کو دیکھ کر اس آسماں کو دیکھ کر
اصل باشندوں پہ غلبہ پاکے راجہ بن گئے
زندگی کردی گئی دُشوار ان کے واسطے
رفتہ رفتہ بن گئے مالک وہ سارے دیس کے
ہیں مرے اوراق پر مرقوم ان کے فلسفے
آریہ ہندوستان میں اِک نئی تہذیب لائے
اپنی عظمت، اپنی سطوت کے نئے مندر بنائے
اُپنشد اور وید ان کے فکر کی معراج ہیں
کل بھی اُتنے ہی مقدّس تھے وہ جتنے آج ہیں
ویر و گوتم نے مہذّب کردیا اس قوم کو
پھینک دو تلوار کو، روحانی قوت پر جیو
روزِ اوّل سے ہے بھوکا مال وزر کا آدمی
گرد پیسے کے ہمیشہ گھومتی ہے زندگی
ہند کی دولت کی شہرت ہوگئی دنیا میں جب
ہوگئے مشتاق اس کے مصر ویونان و عرب

فاتحِ اقوام عالم تھا سکندر سا جواں
بڑھ کے وہ یونان سے اِک روز آپہنچا یہاں

رن پڑا ، پورس لڑا ، ہارا مگر اس شان سے
لوٹ ہی جانا پڑا فاتح کو ہندوستان سے
زخم جو مغلوبیت کے تھے وہ آخر بھر گئے
نقش باقی رہ گئے یونان کی تہذیب کے
اُس طرف فکر ارسطو ، اِس طرف چانکیہ تھا
اتحادِ مشرق و مغرب کا دروازہ کھلا
رزم سے جب بزم میں آئے گلے ملنے لگے
پھول دو تہذیبوں کے مل کر خود بخود کھلنے لگے

ہند ہے سونے کی چڑیا ، ہر طرف مشہور تھا
جس میں ہمّت ہو وہ لوٹے ، وقت کا دستور تھا
آئے وسطِ ایشیا سے پہلے شک اور پھر کشان
جنگجو قوموں کے نرغے میں پھنسا ہندوستاں
حملہ آور ہی نہیں ، قابض ہوئے بھارت پہ وہ
ہوگئے آخر مسلّط پیار کی جنت پہ وہ
خون بہنے پر اُتر جاتا ہے فاتح کا نشہ
شانتی کے فلسفے نے رام ان کو کرلیا
بودھ مذہب کا ہوا پیرو جو تھا راجہ کنشک
امنِ عالم کا پیامی بن گیا راجہ کنشک
اِک نیا نقشہ بنا ، تہذیب پر آیا نکھار
خون میں ڈوبے چمن میں آگئی تازہ بہار
حملہ آور مغربی سرحد سے آتے ہی رہے
ہند والے ہنستے ہنستے زخم کھاتے ہی رہے

مادرِ ہندوستاں کا دل کشادہ ہے بہت
اس کو اُلفت ابنِ آدم سے زیادہ ہے بہت
گود میں جو آ کے بیٹھا اس کو اپنا یا سدا
ایکتا میں اتنی نیرنگی ، اسی کا ہے صلہ

جب محمد ابن قاسم سندھ کی وادی میں آئے
راجہ داہر نے انھیں تلوار کے جوہر دکھائے
وہ کوئی راجہ نہیں تھے ، اِک سپہ سالار تھے
ہند میں آئے نہ تھے وہ ملک گیری کے لیے
وہ عرب سے آئے تھے لے کر پیام اسلام کا
ہند کی محفل میں چھلکایا وہ جام اسلام کا
جس میں تھا رنگِ محبت ، اور وحدت کا نشہ
اتحادِ ہندو و مسلم کی عظمت کا نشہ
حملہ آور تو گئے ، باقی رہا پیغامِ نور
ایکتا کے جام جب چھلکے تو پھر آیا سُرور

پانی پت: یہ داستاں تو شاید بہت ہی لمبی ہے
میں سُن رہا ہوں بہت غور سے ، مگر تاریخ!
سوال اُٹھتا ہے رہ رہ کے ذہن میں میرے
کہ جتنی قومیں یہاں آئیں ، سب بہادر تھیں
وہ آئیں زور پہ تلوار کے ، ہوئیں فاتح
مگر جب آ کے بسیں سرزمینِ بھارت میں
تو زنگ خوردہ ہوئیں کیسے ان کی تلواریں
بہادری کا فقط نام رہ گیا لیکن

بچی نہ اتنی بھی ہمت ، اٹھا سکیں تلوار
نکل کے ہند کی سرحد سے حملہ آور ہوں
کسی بھی ملک پہ ، اور مملکت کو اپنی بڑھائیں
کہا ہے تم نے کہ دستور تھا زمانے کا
بڑھا کے ہاتھ اٹھا لے جو ، جام تھا اس کا
اُسی کی مینا ، خم اس کا ، اسی کا میخانہ
اسی کی بھینس تھی ، لاٹھی تھی جس کے ہاتھوں میں
اسی کا ملک تھا ، قوت تھی جس کے بازو میں
ہر ایک قوم کا لیکن مزاج یوں بدلا
کہ رکھ کے بھول گئے اپنی اپنی تلواریں
وہ آج ہو گئے مفتوح ، کل تھے جو فاتح
مگر یہ کیوں ہوا ؟ کس طرح ہو سکا ممکن،
کہ نسل شیر کی تھی اور بن گئے بکری؟

تاریخ: تمھارے ذہن میں جتنے سوال اُٹھے ہیں
جواب ان کا ہے بس ایک "عیش سے جینا"
ملے جو مفت میں روٹی تو کیوں ہلائیں ہاتھ
میسر آئے جو دولت بغیر محنت کے
تو کیوں اُٹھائے کوئی مار دھاڑ کی زحمت
وہ ملکِ غیر میں کیوں جائے سونت کر تلوار
جو عیش کوش ہیں وہ جنگ جو نہیں ہوتے
زمین اپنی اُگلتی ہو جب زرو جوہر
زمینِ غیر پہ ڈالیں نظر ، تو کیوں آخر
کمان جنگ کی سر پہ اگر کڑکنے لگے
وہ جنگ باز کو کرتے ہیں رام دولت سے

ہمیں بھی کھانے دو اور خود بھی کھاؤ ، عیش کرو
ہمیں بھی جینے دو اور خود بھی اس ادا سے جیو
مناؤ عیش کہ دنیا ہے عیش کا بازار
یہ تجزیہ ہے مرا ، میں نے دیکھی ہے دُنیا
اصول عیش کا یہ آج تک نہیں بدلا

پانی پت: تو نے اے تاریخ ! دل کا بوجھ ہلکا کردیا
کیا ہوا کیسے ہوا ، سب کچھ سمجھ میں آ گیا
بز دلی غالب جو آجائے تو ہوتی ہے شکست
کیا لڑیں گی جنگ وہ قومیں جو ہوں عشرت پرست

تاریخ: زندگی کرنے کا لیکن ایک پہلو اور ہے
سب کو جو مسحور کرتا ہے وہ جادو اور ہے
جب فنونِ جنگ سے نسبت نہ ہو تو زندگی
چاہتی ہے رقص و نغمہ ، شاعری ، صورت گری
آدمی کرتا ہے پیدا فکر و فن کا اک جہاں
ہیں اجنتا اور ایلورا اس کی عظمت کے نشاں
کتنی لاٹیں ، کتنے ہیں استوپ ، مندر بے شمار
مسجدیں اور تاج ، دورِ امن کی ہیں یادگار
شاعری کرتی ہے باتیں بادلوں سے اس طرح
ایک عاشق پیار کا پیغام بھیجے جس طرح
اور شکنتل جیسے کرداروں کا ہوتا ہے نزول
فلسفہ اور علم و حکمت ، امن کے گلشن کے پھول

اِک عجب پہلو ہے جس کا خوف رہتا ہے سدا
جس سے رُک جاتا ہے آخر فکر و فن کا ارتقا
سازشیں ہوتی ہیں ، آپس میں جو ٹکرائیں مفاد
ہوتا ہے انجام اس کا خانہ جنگی اور فساد
میں نے دیکھا ، ہند میں ایسے بہت آئے مقام
ہوگیا انسان کا آرام سے جینا حرام
دوست ہوں جب آستیں کے سانپ، کس کا اعتبار
بھائی بھائی جب لڑیں ، خطرے میں ہو قومی وقار

وقت اِک آیا بڑی قوت نہ تھی کوئی یہاں
عظمتِ ہندوستاں کے دھندلے دھندلے تھے نشاں
چھوٹے چھوٹے راج تھے نفرت کی دیواروں کے بیچ
نام کا رشتہ تھا راجہ اور اور سرداروں کے بیچ
مغربی ہندوستاں میں تھا بہت ہی انتشار
تاک میں بیٹھے تھے افغانی اُدھر سرحد کے پار
چاندی سونا چاہیے تھا بچّۂ افغان کو
دیکھ کر کمزور ، لوٹا خوب ہندوستان کو
غزنوی محمودؔ نے حملوں پہ جب حملے کیے
مندروں کو توڑ ڈالا مال و دولت کے لیے
ملک گیری کی ہوس تھی اور نہ ذوقِ اقتدار
غزنوی آتا تھا کرنے قتل و غارت ، لوٹ مار
موت نے کھینچی بالآخر اس کے گھوڑے کی لگام
ہے مرے صفحات میں غاصب ، لٹیرا اس کا نام

وقت کا پہیہ کسی صورت کھسکتا ہی رہا
راجپوتوں کی حکومت کا زمانہ آ گیا
راجپوتی سورماؤں کی نرالی شان تھی
شان سے بھی کچھ زیادہ راجپوتی آن تھی
آن کی خاطر لٹا دیتے تھے اپنی جان کو
ایسے حاکم کم ملے ہیں ملک ہندوستان کو
تختِ دہلی پر تھا قابض پرتھوی راجِ چوہان
خوب صورت ، نیک سیرت اور سجیلا نوجواں
اُس طرف قنوج میں جے چند کی تھی سلطنت
وہ بھی تھا عالی نسب ، ذی شان ، والا تمکنت
دخترِ جے چند تھی سنجو گتا اتنی حسیں
چومتا تھا چاند اس کافر حسینہ کی جبیں
اس کے دل میں تھی بسی تصویر پرتھوی راج کی
آئی جب قنوج میں اس کے سوئمبر کی گھڑی
تھا عجب منظر کہ جیسے آئے گا اب انقلاب
سُرخ حرفوں میں لکھا ہے وقت نے میرا یہ باب

جے چند: ○ دیش کے سارے راجہ آئے ، آئے سارے راجکمار
سب کا ہے سمان ، ہمارے راج بھون میں آئی بہار
آپ سبھی کو ہم نے بلایا ، لیکن پرتھوی راج چوہان
کیسے آ سکتا ہے یہاں پر ، وہ تو ہمارا ہے دربان
دیکھیے وہ ہے مورتی اس کی ، دوار پہ ہے چپ چاپ کھڑا
اس کے علاوہ اس مورت کی اور نہیں ہے کوئی جگہ

تاریخ:

لے کے آئی ہاتھ میں جے مالا جب سنجوگتا
جس نے دیکھا اس کی جانب ، دیکھتا ہی رہ گیا
اس کی نظریں ڈھونڈتی تھیں اپنے عاشق کو مگر
مورتی جیسے ہی اس کو دوار پر آئی نظر
وہ بڑھی تیزی سے اس کی سمت جے مالا لیے
سارے راجہ اس کی صورت دیکھتے ہی رہ گئے
ہر طرف دربار میں اِک کھلبلی سی مچ گئی
اور پرتھوی راج کی گردن میں جے مالا پڑی
دوار کے باہر تھا وہ ، سنجوگتا کو لے اڑا
اس کا چیتک ایسے دوڑا ، جوں ہوا کا دیوتا
دلّی و قنوج کی یہ روح فرسا دشمنی
دن بدن بڑھتی گئی ، بڑھتی گئی ، بڑھتی گئی
دلّی کی طاقت بہت ، قنوج پھر کمزور تھا
سامنا کیسے کرے جے چند پرتھوی راج کا
کیسے زک پہنچائے اس کو، کس طرح لے انتقام
خاک میں کیسے ملائے اپنے دشمن کا وہ نام

عام تھے جھگڑے شمالی ہند کے راجاؤں میں
زندگی بے حال تھی ہر شہر میں ، ہر گاؤں میں
غور میں شاہِ شہاب الدین اُدھر سرحد کے پار
تھا خراسانی حکومت کے مظالم کا شکار
تھا خزانہ اس کا خالی ، ملک کی حالت تباہ
آخرش ہندوستاں پر اس نے بھی ڈالی نگاہ

حملہ آور غزنوی کی طرح بھارت پر ہوا
لڑنے والا کون تھا ! میدان بالکل صاف تھا
پہلے پیشاور کو ، اس کے بعد لوٹا پونچھ کو
خونی ہاتھوں سے حقارت کے نچوڑا پونچھ کو
اور پھر تو جیسے اس کو پڑ گئی دولت کی چاٹ
فتح مندی کا نشہ تھا ، شہرت و عزّت کی چاٹ
اس کے حملوں سے ہوا بے حال ہندوستان پھر
اس کے فوجوں نے کیا پامال ہندوستان پھر
دُور تھی دلی مگر پہنچی جو حملوں کی خبر
راجہ پرتھوی راج کی آنکھوں میں خون آیا اُتر
وہ بڑھا دلّی سے ، اور پھر رن ترائن میں پڑا
شیرِ ہندوستان اور افغان کا تھا سامنا
حملہ آور ، جاں بچاکر بھاگ تو نکلا مگر
تازہ تر فوجوں کو پھر لایا وہ اس میدان پر
وقت ایسا تھا کہ ملتے سارے راجہ ہند کے
اور لڑتے راجہ پرتھوی راج کے جھنڈے تلے
سوچا پرجے چند نے ، آیا ہے وقتِ انتقام
گر کیا غوری نے پرتھوی راج کا قصّہ تمام
تو بدیسی لوٹ کر لے جائے گا مال و منال
اور پھر دلّی مری ہوجائے گی بے قیل و قال

رن پڑا ، اس بار پرتھوی راج کچھ کمزور تھا
ہارکر میدان اس کو چھوڑ جانا ہی پڑا

فاتحِ دلّی ، شہاب الدین باصد اہتمام
رُک گیا دلّی میں ، اس کے ساتھ تھے اس کے غلام
سرحدیں مضبوط کیں ، دلّی سے جب جانے لگا
درجہ قطب الدین ایبک کو دیا سلطان کا
والیٔ دلّی بنا القصہ غوریؔ کا غلام
راجپوتوں کے لیے بیشک تھا عبرت کا مقام
تھی جو آپس کی کدورت رنگ لاکر ہی رہی
سرزمین ہند کے سرکو جھکاکر ہی رہی
ہے مرے صفحات میں جے چند غدارِ وطن
دشمنِ آزادیٔ انساں ، گنہگارِ وطن

ہند میں یہ تھی مسلمانوں کی پہلی سلطنت
وہ یہاں رہنے لگے باعزّت وباتمکنت
آج جب کرتی ہوں میں اس سانحہ کا تجزیہ
دل یہ کہتا ہے عظیم الشان تھا یہ واقعہ
جو مسلماں آئے وہ اس دیس میں ہی بس گئے
کھل کے تہذیبیں ملیں ، پیدا ہوئے امکاں نئے
دولتِ ہندوستاں ، ہندوستاں ہی میں رہی
مال وزر کی لوٹ بالآخر فسانہ بن گئی
تھا عوامی سطح پر بیشک ثقافت کا ملن
ساتھ لہرانے لگے جب کوثر و گنگ و جمن
اتحادِ فکر و دانش کی نئی راہیں کھلیں
اتصالِ رنگ و رامش کی نئی راہیں کھلیں

دو زبانوں کے ملن سے ہندوی پیدا ہوئی
اور اِک دن پھر وہی اُردو بنی ، ہندی بنی
صوفیوں نے تفرقوں کی ساری دیواریں گرائیں
مل کے ویدانت اور تصوّف نے نئی شمعیں جلائیں

باہمی جھگڑے مگر انسان کی فطرت میں ہیں
کچھ زیادہ ہی یہ ہندوستاں کی قسمت میں ہیں
میکدے میں مے گساری کے بھی کچھ آداب ہیں
بزم جاں میں بیقراری کے بھی کچھ آداب ہیں
میکدے میں جایئے تو ضبط کا یارا بھی ہو
ظرف جتنی دے اجازت صرف اتنی ہی پیو
مے کشی کا ہے تقاضہ ، جام مت چھلکایئے
جرعہ جرعہ ، رفتہ رفتہ نوشِ جاں فرمایئے

یک بیک آقا عطا کردے جو ان کو تخت و تاج
مدّتوں ملتے نہیں ہیں پھر غلاموں کے مزاج
دورِ سلطانی رہا صدیوں بغاوت کا شکار
قتل و غارت ، جعل سازی ، حیلہ جوئی ، لوٹ مار
مستقل تھی سلطنت کے واسطے اِک کھینچ تان
ہاتھ میں سب کے رہی تیغ و سناں تیر اور کمان

پانی پت: تم مجھے دکھلاچکی ہوں آئینہ اس دور کا
سرزمینِ ہند پر بیشک یہ مشکل وقت تھا

ہر طرف غدّار تھے اور عام تھی محسن کُشی
آدمیت سے گریزاں ہوچکا تھا آدمی
بلبن و خلجی ہوں یا شہزادگانِ ذی وقار
سب کے دل کی اِک صدا تھی اقتدار و اقتدار
تاریخ: آندھیاں حرص و ہوس کی ہر طرف چلتی رہیں
اہلِ ثروت کے دلوں میں سازشیں پلتی رہیں
سلطنت کی سرحدیں بڑھتی گئیں بڑھتی گئیں
ندیاں تخریب کی چڑھتی گئیں چڑھتی گئیں
معرکے سب یاد ہیں مجھ کو علاء الدین کے
کچھ بھی کرسکتا تھا تختِ سلطنت کے واسطے
قتل دھوکے سے غیاث الدین خلجی کو کیا
تھا وہ شاہِ وقت اور اس کا خسر، اس کا چچا
حملہ آور، ہن، ہوئے تو ان کے سر کٹوا دیے
اور دیواروں میں اپنے قلعہ کی چُنوا دیے
ہے 'سری فورٹ' آج بھی ان سرکٹوں کی یادگار
یاں جو وسطِ ایشیا سے آئے کرنے لُوٹ مار
اور محمد ابن تغلق کی نرالی شان تھی
لے گیا وہ شہرِ دلّی کو اُٹھاکر دیو گری
پھر ہوا واپس، بنایا اپنا قطعہ، اپنا شہر
دور اس کا باعثِ رحمت بھی تھا اور دورِ قہر

جب توانا پیڑ کو جڑ سے اکھاڑا جائے گا
اور نامانوس مٹّی میں لگایا جائے گا

ہے بہت دُشوار بار آور دو بارہ ہو سکے
پیڑ جو دلّی سے اکھڑے ، بیشتر مرجھا گئے
عقل مندی ، بے وقوفی دونوں اس پر ختم تھیں
وہ عجب کردار تھا اس کا کوئی ثانی نہیں
ایک حالت پر نہیں رہتی کبھی یہ زندگی
ہو ترقی یا تنزل ، ہے تغیر لازمی
رشک تھا دہلی پہ سب کو ، تھی وہ معراجِ کمال
بے عمل جب ہوگئے سلطان ، تو آیا زوال
سرحدیں سمٹیں ، حکومت مختصر ہوتی گئی
سلطنت کمزور تر ، کمزور تر ہوتی گئی
تھے امیرانِ وطن کو عیش کے ساماں بہم
جام دے کر ہاتھ میں ، کردے کوئی سر بھی قلم
ہند میں وارد ہوا جب فتنۂ تیمور لنگ
شیر ترکستان سے کرتا بھلایاں کون جنگ
کون تھا تیمور ! اِک سفّاک قاتل ، جنگجو
نیم وحشی ، قتل و غارت ، بربریت جس کی خو ،
روند کر آیا تھا پائے جبر سے بغداد کو
علم و دانش ، فکر و فن کی جنتِ آباد کو
ناخنِ وحشت سے یوں تہذیب کی کھودیں تہیں
کشورِ ہندوستاں کی کھوکھلی کردیں جڑیں
کرکے وہ پنجاب کو تاراج جب واپس گیا
زندگی کے ساز کا ہر تار تھا ٹوٹا ہوا

تھی صدی وہ چودھویں ہر سمت خانہ جنگیاں
چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا نام تھا ہندوستاں

سیدوں کے ہاتھ آئی سلطنت دہلی کی جب
تھی حکومت اِک نمائش ، بادشاہت اِک لقب

پانی پت: بس کر اب ، سنتے سنتے تھک گیا یہ داستاں
میرے دل کے زخم اب دینے لگے ہیں پھر دھواں
یاد کیا تجھ کو کوئی قصہ محبت کا نہیں
کیا تری کشکول میں لمحہ مسرت کا نہیں

تاریخ: بادشاہی داستانوں میں محبت کا گزر!
ملک گیری کی ہوس تھی یا تلاشِ مال وزر
اور عوامی زندگی پامال تھی ، بے حال تھی
بے زری اور بے نوائی جان کا جنجال تھی
وقت کہتا تھا کہ پھر اِک انقلاب آنے کو ہے
کشورِ ہندوستاں پر پھر شباب آنے کو ہے
اس سے پہلے آرہے تھے زلزلوں پر زلزلے
سیدوں کے بعد طبلِ جنگ پھر بجنے لگے
جونپور سے فوج لے کر چل پڑا محمود شاہ
اور چلی پنجاب سے بہلول لودی کی سپاہ
وائی پنجاب تھا افغان ، سرعت سے بڑھا
رن پڑا ، بہلول لودی ، کامراں ثابت ہوا
تھا بہت شائستہ ، خوش اخلاق اور سادہ مزاج
زیب دیتا تھا اُسے دربارِ دہلی ، تخت و تاج
بخش کر افغان سرداروں کو صوبوں کا نظام
اس نے تھامی اپنے ہاتھوں میں حکومت کی زمام
باغیوں کے سرکچل کر ، کی رعایا پر نظر
اس کی فیاضی کا قائل تھا ہر اک فردِ بشر

موت تو آتی ہے سب کو ، کیا گدا ، کیا بادشاہ
نیکیاں مرتی نہیں ہیں ، وقت ہے اس کا گواہ
میں سدا کہتی ہوں ، تھا بہلول شاہِ نیک نام
پیکر اخلاص تھا وہ ، اس کی عظمت کو سلام
ایک نعمت ہے اگر اولاد بھی ہو خوش خصال
خوبیٔ قسمت ، پسر بہلول کا تھا بے مثال
اہلِ دانش نے کیا اس دَور کا جب تجزیہ
نقشِ ثانی نقشِ اوّل سے بھی کچھ بہتر رہا
باپ کی مسند پہ جب بیٹھا سکندر سا جواں
باپ سے نکلا زیادہ نیک ، عادل ، مہرباں
تھی سکندر کی طبیعت میں قناعت اس قدر
اس نے ڈالی ہی نہیں اپنے پڑوسی پر نظر
سرحدیں مضبوط تھیں ، لڑنا نہ تھا اس کا شعار
زندگی تھی پرسکوں اور سب کی عزّت برقرار
دور خوش بختی ہے یہ ، امن و اماں کا دَور ہے
دورِ اسکندر بہارِ بے خزاں کا دَور ہے
پروں کے گھر میں شیطاں پارہا تھا پرورش
بیٹے ابراہیم کی برعکس تھی بالکل روش
باپ دادا کی وراثت کے وہ لائق ہی نہ تھا
بعد لیکن باپ کے ، وہ تخت کا وارث ہوا
تھا بہادر وہ ، مگر ناعاقبت اندیش تھا
بے خبر تھا اس سے وہ ، خطرہ جو کل درپیش تھا

دولت و ثروت اگر مل جائے محنت کے بغیر
سلطنت حاصل ہو کوشش اور ریاضت کے بغیر
دل میں آتی ہے بدی ، نیت میں آتا ہے فتور
ذہن کو ماؤف کردیتا ہے شاہی کا غرور
شاہ تھا ، لیکن وزیروں پر نہیں تھا اعتبار
اس سے بدظن ہوگئے سب صاحبانِ ذی وقار
بدسلیقہ ، بدزبان و بدمزاج و تند خو،
سامنے جو اس کے جائے ، کھوئے اپنی آبرو
سازشوں نے سر اُبھارا ، شورشیں بڑھنے لگیں
ندیاں غیظ و غضب کی ہر طرف چڑھنے لگیں
راجپوتانے کے راجہ اس کے دشمن ہوگئے
اور کئی افغان صوبیدار بدظن ہوگئے
چوٹ کھاکر سب وفا پیشہ ، دغا دینے لگے
'جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے'
بادشاہی کا نشہ ہو جن میں ، طاقت کا غرور
وقت کردیتا ہے ایسے سارے شیشے چور چور
والیٔ پنجاب دولت خان لودی خوش نہ تھا
ایک خط اس نے ظہیر الدین بابر کو لکھا
تم کرو دہلی پہ حملہ ، ہم تمھارے ساتھ ہیں
راجپوتوں نے بھی لکھا ہم تمھارے ساتھ ہیں
شہر پانی پت ! نہ پوچھو ، آگئے ہیں ہم کہاں
اب تمھارے آستاں تک آئے گی یہ داستاں
وقت بتلائے گا تم کو شاہ بابر کون تھا
کیوں وہ ترکستان سے ہندوستاں تک آگیا

پانی پت: بابری حملوں کا پس منظر بتا کر،
تم نے تازہ کر دیا ہر سانحہ
قتل و غارت کے مناظر کا تصور بھی ہے کتنا خوفناک
آج جب میں جی رہا ہوں سکھ سے، اطمینان سے
آج بھی اس داستاں میں آتے ہی بابر کا نام
میرے تن کا ریشہ ریشہ کانپ اُٹھا خوف سے
اس کی توپوں کی گرج یاد آ گئی
اُڑ گئے ہوش حواس

تاریخ: خود شناسی کے لیے لیکن ضروری ہے،
کہ دیکھے وقت کا تو آئینہ
فرد ہو یا کوئی قوم،
راہبر ہو راہبر یا راہزن،
جو بھی گزرے زندگی کی راہ سے
وقت سب کا ہم سفر،
وقت اچھا یا بُرا ہوتا نہیں
وقت تو اعمال کا ہے آئینہ
وقت اِک زندہ کتاب،
وقت خیر و شر کا رکھتا ہے حساب،
وقت کے ایوان میں بجتا ہی رہتا ہے رباب
وقت گر دیتا ہے زخم،
وقت ہی مرہم بھی ہے،
وقت اِک لمحہ بھی،

وقت اِک عالم بھی ہے،
وقت تیرے بھی قریں ہے،
وقت سے نظریں ملا،
وقت کی آواز کو،
گوشِ دل سے سُن ذرا،
وقت: ارضِ پانی پت!
تری حُرمت نظر میں ہے مری
تیرا ہر ذرّہ امینِ داستانِ انقلاب
کیوں ہے خائف اس قدر،
جو ہو چکا سو ہو چکا
ہر خزاں کے بعد آتی ہے بہار
ہے یہ فطرت کا اصول
تیرے دروازے پہ آ کر جورُ کا تھا قافلہ
معرکہ آرائیوں اور قتل و خونریزی کے بعد،
کامرانی کے نرالے دَور میں داخل ہوا
اور پھر لمحہ بہ لمحہ،
شاہراہِ شوق پر بڑھتا گیا، بڑھتا گیا

میں بتاؤں کیا تجھے،
دوڑتا ہوں لے میں پیچھے کی طرف
عیسوی پندرہ سو چار
تو مرے کانوں سے سُن
گونجتی ہے دامنِ کہسار میں،

شاہِ بابر کی صدا

بابر: پہاڑی آبشاروں اور چشموں کا یہ گہوارہ
چہکتے مرغزاروں، لالہ زاروں،
اور پھلوں کے جھومتے باغوں کی یہ جنت
ہوائیں کیف افزا اور فرحت بخش ہے پانی
کہستاں پر کھڑے اشجار کرتے ہیں نگہبانی
یہ کابل ہے،
اسے حاصل کیا ہے ہم اپنے زورِ بازو سے
ہمارے خواب کی تعبیر کی یہ اک جھلک ہے،
نقش اوّل ہے یہ شاہی کے تصوّر کا
نہیں ہیں میرزا،
ہم ہیں امیرِ کابل،
اور زیرِ نگیں ہے مملکت یہ کوہساروں کی
یہ افغانستان بس تمہید ہے،
ہندوستاں کو فتح کرنے کی

مرزا جہانگیر: برادر محترم!
کابل تو ہے اک نقطۂ وسطی،
خراسان اور ہندوستان،
دونوں سے برابر فاصلہ اس کا

بابر: یہ دونوں ہیں ہماری منزلیں،
اور دل میں خواہش ہے
کہ ہو ماہِ سمرقند اِک ہتھیلی پر ہماری،

دوسری پرولی کا سورج

جہانگیر مرزا: عزائم آپ کے اونچے ہمالہ سے،
عطا کی ہے خدا نے آپ کو وہ جرأت وطاقت،
کہ ہر اک مرحلہ کو سر کیا ہے،
عزم وہمّت ،استقامت سے

بابر: برادر! جانِ بابر!
ہم سمجھتے ہیں خراسان اور ہندوستان
دونوں پر ہمارا حق برابر ہے
کہ دونوں تھے،
ہمارے جدّ امجد حضرتِ تیمور کے زیر نگیں،
ہم ان کے وارث ہیں
ہمارا فرض ہے،
اپنی وراثت کو چھڑائیں پنجۂ اغیار سے،
دنیا کو بتلا دیں
ابھی زندہ ہے اور زندہ رہے گی شانِ تیموری
ہمیں سب بھائیوں کو دشمنوں سے مل کے لڑنا ہے
رہیں گے متحد تو فتح کا پرچم اُڑائیں گے
اگر ہم لڑ پڑے آپس میں تو ذلّت اٹھائیں گے
بہادر جنگ کے میدان میں جوہر دکھاتے ہیں
ضرورت آ پڑے تو خون کے دریا بہاتے ہیں
ہمارے جدِ امجد فاتحِ پنجاب تھے،
اور آج ہم اعلان کرتے ہیں
کہ جب تک پھر نہ کرلیں فتح ہم پنجاب کو،

آرام سے ہرگز نہ بیٹھیں گے

جہانگیر مرزا: مناسب ہے،

بابر: ہمارا حکم ہے— کابل میں تم ٹھہرو
سوئے پنجاب ہم یلغار کرتے ہیں

وقت: عیسوی پندرہ سو پانچ
پہلا حملہ جب کیا بابر نے ہندوستان پر
آ گیا کابل سے پیشاور وہ دراتا ہوا
جارحانہ شان سے آگے بڑھا،
تیغ کے جوہر دکھاتا،
لوٹتا مالِ غنیمت،
اور ستم ڈھاتا ہوا
حملہ آور وہ ہوا کوہاٹ پر
اور پھر بنگش پہ کی یلغار
پھیلائی وہ دہشت،
تھرتھرا اُٹھے عوام
وہ بہادر وارثِ تیمور تھا،
ظلم کرنا، شیوۂ مردانگی تھا،
قتل و غارت ایک کھیل
سخت گیری اس قدر،
فوج میں اس کی ہوا جو غیر حاضر،
کاٹ ڈالی اس کی ناک،

اور گھمایا اس کو لشکر میں،
کہ لیں سب لوگ عبرت کا سبق

کر رہا تھا ہند میں وہ معرکہ آرائیاں
اور اُدھر کابل میں سازش تھی،
اُلٹ کر اس کا تخت،
اس کے بھائی کو بنا دیں حکمراں
بھائی لیکن بھائی تھا
کر دیا سازش کو اس نے بے نقاب،
اور بابر طیش میں،
چل پڑا اپنے مرکز کی طرف
یوں ملی پنجاب کو اس کے مظالم سے نجات
عارضی،
خطرۂ بابر تو سر پہ اس کے منڈلاتا رہا

پانی پت: معاذ اللہ! یہ تھا نقشِ اوّل ظلم بابر کا!!
وقت: مقدّر کا مگر وہ شاہ تھا، بیشک سکندر تھا
گیا ہندوستاں سے لوٹ کر، لیکن وہ پھر آیا
اور اگلی بار جب آیا تو وہ با کرّوفر آیا
تاریخ: بہت اُلجھی ہوئی ہے داستاں بابر کے حملوں کی
بہادر تھا
مگر دو کشتیوں میں پاؤں تھا اس کا
خراساں اک طرف،

اور اِک طرف ہندوستاں،
دونوں سے اس کو پیار تھا بے حد
ادا کرنی پڑی اس بے وقوفی کی بڑی قیمت
سُنا اس نے،
خراساں میں ہوائیں چل رہی ہیں خانہ جنگی کی
تو کابل سے روانہ ہو گیا وہ اپنی قسمت آزمانے کو
بڑا سب سے حریف اس کا تھا شیبانی
فریبی، فتنہ پرور،
جنگ کے میدان کا شاطر
یہی وہ دور تھا جب شاہِ اسمٰعیل صفوی،
والیٔ ایران تھا، اور ایسی قوت تھا
کہ جس کو زیر کرنا کارِ مرداں تھا
ہوا یوں —
اس سے شیبانی جب اُلجھا،
منہ کی کھائی اور ہوا پسپا،
تو بابر نے غنیمت جان کر موقعہ
چلی اک شاطرانہ چال،
اور اسمٰعیل صفوی سے کیا سودا،
اگر ایران دے امداد،
اور تختِ سمرقند اس کو مل جائے
وہ اسمٰعیل کی یہ شرط مانے گا
کہ پہنے گا لباسِ شیعی،
اور اپنی حکومت میں

وہ شیعت کی اشاعت کے لیے آسانیاں دے گا

یہ دو عملی سیاست ہوگئی ناکام،
اور انجام عبرت ناک تھا اس کا
خراسانی بھی ناخوش ہوگئے،
ایرانی بھی ناخوش
ملا اور مل کے آخر چھن گیا پھر تختِ تیموری
اور اُلٹے پاؤں لوٹ آیا وہ کابل کو
اٹھائیں کلفتیں کتنی،
ہوا ترکوں میں بھی رُسوا
خراساں کی طرف سے اس نے آخر بند کر لی آنکھ،
اور ٹھہری نظر اب ہند پر اس کی
جہاں کی سلطنت کمزور تھی اور لوگ تھے کاہل

بہت کچھ کھویا بابر نے،
مگر اِک چیز ایسی پائی جس سے بن گیا فاتح
یہ دیکھا ترک شہزادے نے جب،
ہے آتشیں اسلحہ سے لشکر لیس صفوی کا
سمجھ میں آ گیا اس کی، یہی ہے راز قوت کا
عمل اس نے کیا فوراً
رکھا استاد علی ثانی کو اپنا ملازم توپچی تھا وہ
اور آخر بن گیا اس کا بھی ایسا توپ خانہ
تھا جو لا ثانی

یہی وہ توپ خانہ تھا،
مخالف لشکروں پر آگ برسائی تھی جس نے،
اور اکھاڑے ہاتھیوں کے پاؤں،
پانی پت کے میداں میں

پانی پت: مجھے ہے یاد وہ لمحہ،
ادھر تھیں آگ برساتی ہوئی توپیں،
اُدھر چنگھاڑتے ہاتھی
قیامت کا تھا وہ منظر،
پلٹ کر ہاتھیوں نے اپنے لشکر ہی کو جب روندا،
کسی کے سر کو کچلا،
اور کسی کی پسلیاں توڑیں،
سرِ میداں پڑی تھیں ہر طرف کچلی ہوئی لاشیں

تاریخ: ترے میدان میں تو آخری تھا معرکہ، لیکن
یہاں تک آتے آتے شاہِ بابر نے،
کئی حملے کیے پنجاب پر،
جس کو سمجھتا تھا وراثت جدِّ امجد کی
مری کشکول میں پندرہ سو انیس عیسوی وہ سال ہے جس میں
قدم دوبارہ اٹھے سوئے ہندوستان بابر کے
عداوت سلطنت سے تھی
عوامِ ہند سے اس کو محبت تھی
بہت قصے ہیں ایسے،
جب نہ روندا اس نے کھیتوں کو

نہ لوٹا قافلوں کو،
بے گنہ لوگوں سے پیش آیا مروّت سے
سمجھتا تھا کہ ہے پنجاب اس کا،
جس پہ قبضہ غاصبانہ کرلیا تھا شاہِ دہلی نے

یہ تھی ہندوستاں پر دوسری یورش
اِدھر حملہ کیا یوسف زئی پر،
اور اُدھر دربارِ دہلی کی طرف اِک ایلچی بھیجا،
لکھا خط میں:

بابر: والیٔ ہندوستاں کو شاہ کابل کا سلام
رقعۂ اخلاص ہے یہ، دوستی کا ہے پیام
ہے ہمارا اِک بہادر کی طرف روئے سخن
جس کی عظمت کی ہے شاہد وادیٔ گنگ وجمن
جو سخاوت کا ہے دریا، وقت کا نوشیرواں
زرفشاں ہے جس کے دم سے پرچمِ ہندوستاں
ہم ظہیر الدین بابر وارثِ تیمور ہیں
کچھ دنوں سے مابدولت اس لیے رنجور ہیں
جدّ امجد کی وراثت پر ہے قبضہ غیر کا
سب کے حق میں ہے ہمارے لب پہ کلمہ خیر کا
ہم بہادر ہیں مگر ہم جنگ کے جویا نہیں
بے سبب یلغار کردیں اپنا یہ شیوہ نہیں
ارضِ پنجاب اصل میں جاگیر ہے تیمور کی
آلِ تیموری کا ہی اس پر تسلّط تھی کبھی

غاصبانہ اس پہ قبضہ شاہِ دہلی نے کیا
ملک گیری کی ہوس تھی ، وقت کا یہ پھیر تھا
آپ سے پہلے جو تھے ہندوستاں کے تاجدار
دَور میں ان کے ہوا پنجاب آفت کا شکار
دست کش اب صوبۂ پنجاب سے ہوجائیں آپ
اہلِ دانش ، امن پرور، صلح جو کہلائیں آپ
گر ہماری پیشکش کو آپ نے ٹھکرا دیا
جانتے ہیں آپ ، غاصب کی سزا ہوتی ہے کیا
خونِ تیموری میں اب بھی ہے وہی جوش وخروش
حاکمانِ دہر کے جس نے اڑا رکھے تھے ہوش
وقت کا ہے یہ تقاضہ دوست بن کر ہم جئیں
دشمنی کے چاک اخلاص و تدبر سے سئیں
آپ کو دلی مبارک ، پر ہمیں پنجاب دیں
مسئلہ ہے صاف ، اس کو گفتگو سے طے کریں
گر اٹھی تلوار ، تو ٹھہریں گے ذمّہ دار آپ
ہیں حکومت کے نشے میں آج تک سرشار آپ

تاریخ: لے کے بابر کا یہ رقعہ ملا مرشد ایلچی،
جب سوئے دہلی چلا
راستے میں والئ پنجاب دولت خاں لودی مل گیا
اس نے رقعہ پڑھ کے ڈالی ایلچی پر اک نظر،
اور متانت سے کہا

دولت خاں: تم کو شاید یہ نہیں معلوم ابراہیم لودی کون ہے!

شاہ ابنِ شاہ ہے، اور اس قدر مغرور ہے
کانپتے ہیں اس کے آگے اس کے صوبیدار بھی
دست بستہ رہتے ہیں سارے وزیر
آدمی کو وہ سمجھتا ہے فقیر
شاہِ بابر اس کی نظروں میں لٹیرا ہے فقط
اور نفرت ہے اسے تیمور سے
وہ نشے میں چور رہتا ہے سرِ دربار بھی
دیکھ کر رقعہ، اسے آئے گا طیش،
قتل کردے گا تمھیں،

ملا مرشد: اس نے گر ایسا کیا،
شاہ بابر اس کو دیں گے وہ سزا،
تخت تو کیا چیز ہے، جائے گا اپنی جان سے

دولت خاں: ملا مرشد؟ تم فقط ہو ایلچی،
جاں اپنی کیوں گنواتے ہو — مری مانو اگر،
اِک قدم لاہور سے آگے نہ جاؤ،
خیریت ہے بس اسی میں،
سوئے کابل لوٹ جاؤ

تاریخ: رقعہ ابراہیم لودی تک نہ پہنچا،
راستے میں ختم یہ قصہ ہوا،
اور بابر جب علی مسجد سے گزرا،
بیچ میں تھی یہ مہم
مخبروں نے دی بغاوت کی خبر
مسئلہ سنگین تھا،

چھوڑ کر سب کچھ یہیں،
اس کو کابل کی طرف جانا پڑا،
ہو گیا ناکام ہندوستان پر بابر کا حملہ دوسرا
تیسرا حملہ کیا پھر اگلے سال
پہلے وہ 'بیجور' پہنچا،
اور پھر پرچم کو لہراتا ہوا
فاتحانہ شان سے آگے بڑھا،
قصد تھا لاہور کا
فتح کر کے وہ سیالکوٹ اور سیّد پور کو
بڑھ نہ پایا تھا ابھی آگے، کہ آئی یہ خبر،
بیگ ارغن والی قندھار نے،
چھاپے مارے سرحدِ کابل پہ اور کی لوٹ مار
طیش میں بابر ہوا بے اختیار
کوچ کابل کو کیا
تیسرا حملہ بھی آخر بے نتیجہ ہی رہا،
لے رہی تھی قدرت اس کا امتحاں پر امتحاں،
وہ مگر بابر تھا،
اس کا عزم راسخ اور ہمّت تھی جواں

ہے مرے اوراق میں بابر کا ہر اک معرکہ
ہر محاذِ جنگ تھا اس کے لیے اک تجربہ
تجربہ ناکام بھی ہوں گر تو ہوتے ہیں اہم
اور بابر ساجری تھا صاحبِ سیف و قلم

ہر قدم کو تولتا تھا وقت کی میزان میں
پاؤں رکھتا تھا جما کر جنگ کے میدان میں
فتنۂ قندھار اِک کانٹا تھا اس کے پاؤں کا
راستہ ہموار آخر پیش قدمی کا کیا
ہو رہے تھے ہند کے حالات بھی کچھ سازگار
سرکشی تھی ہر طرف ، اور بڑھ رہا تھا انتشار
جانتا تھا ہند میں غدار بستے ہیں بہت
مخلصوں کے شہر میں مکار بستے ہیں بہت
دہلی و لاہور میں پہلے بھی تھی کچھ کھینچ تان
لڑ پڑا آپس میں آخر لودیوں کا خاندان
اور دولت خان نے ابراہیم لودی کے خلاف
والیٔ پنجاب نے سرکار دہلی کے خلاف
کی طلب امداد بابر سے ، وہ راضی ہوگیا
لے کے یہ پیغام کابل کو ولاور خاں چلا

دلاور خاں: ولاور خاں ہوں ، دولت خان لودی کا میں بیٹا ہوں
حضورِ شاہ کابل نذر ہندوستاں سے لایا ہوں

بابر: ہم اپنے دوست کے بیٹے کا استقبال کرتے ہیں
خدا کی ان پہ رحمت ، کہیے دولت خان کیسے ہیں

دلاور: وہ خود تو ٹھیک ہیں ، پر ملک کے حالات ہیں بدتر
بھروسہ کر نہیں سکتے ہیں ابراہیم لودی پر

بابر: بیاں = ذرا تفصیل سے کچھ ، ماجرا کیا ہے
اچانک اس قدر ناراضگی ! آخر ہوا کیا ہے

دلاور: نکمّا ہے ، بہت مغرور ہے اور بدزباں ایسا
سرِ دربار امیرانِ وطن کو کرتا ہے رُسوا
سبھی افغان سردار اب بغاوت پر ہیں آمادہ
کوئی دن میں بکھر جانے کو ہے دلّی کا شیرازہ
اُدھر بڑھتی چلی جاتی ہے طاقت راجپوتوں کی
ہے شاہِ وقت سے بدظن جمعیت راجپوتوں کی
یہی ہے وقت حملہ کردیا جائے جو دلّی پر
قیامت بن کے چھا جائیں گے ابراہیم لودی پر

بابر: مناسب ہے، خیال اچھا ہے، لیکن جب عمل ہوگا
بنایا جائے گا کس شخص کو سلطان دلّی کا؟

دلاور: ہمارے آپ آقا ہیں ، پرستار آپ کے ہم ہیں
میں یہ پیغام لایا ہوں وفادار آپ کے ہم ہیں
وہ جس کو آپ چاہیں گے ، بنے گا والیٔ دلّی

بابر: بنیں دلّی کے ہم سلطان ، یہ خواہش نہیں اپنی
ہماری آرزو یہ ہے رہے خوش حال ہندستان

دلاور: بنادیں آپ عالم خان کو پھر دلّی کا سلطان
وہ ابراہیم لودی کا چچا ہے ، نیک انساں ہے
بھتیجے سے وہ نالاں ہے، مظالم سے پریشاں ہے

بابر: کسے کیا دیں گے اور کیا دے سکیں گے، کچھ نہیں کہتے
خیالوں کی حسیں جنت میں ہم بالکل نہیں رہتے

مدد کو آپ کی تیار ہیں ، چلئے ، ہم آتے ہیں
بھروسے پر خدا کے اپنی قسمت آزماتے ہیں

تاریخ: یہ سن پندرہ سو چوبیس عیسوی کی بات ہے،
جب شاہ بابر نے،
کیا ہندوستاں پر چوتھا حملہ پوری قوت سے
چلا کابل سے، اور بڑھتا گیا، بڑھتا گیا،
طوفان کی صورت
جو آیا راستے میں اس کو غارت کر دیا اس نے
کیا جہلم کو پار—
اور پھر چناب آیا تو اس کے تیز دھارے میں بھی
کشتی ڈال دی اپنی
رُکا لاہور سے کچھ فاصلے پر ساتھ فوجوں کے
مگر جا کر ہوا معلوم نقشہ اور ہی کچھ ہے
پڑی ہے گھیرا ڈالے فوج ابراہیم لودی کی
بہادر خان لودی اور مبارک خان لودی،
اور کئی افغان ہیں سردار فوجوں کے
پر اس کے دوست دولت خان لودی اور دلاور خاں،
نہیں لاہور میں موجود
دونوں بھاگ نکلے ہیں
وہ بابر تھا، اسے ڈرنا نہ آتا تھا
کوئی ہو سامنے، وہ اپنی قوت آزماتا تھا
وہ جھپٹا شیر کی صورت
اِدھر مارا—
اُدھر کاٹا—
کہیں بن کر گرا بجلی

مخالف فوج گھبرائی،
لڑی — لیکن،
مقدر میں تھی ابراہیم کی فوجوں کی پسپائی
ہوئے سب منتشر جتنے بچے تلوار سے اس کی،
چھپے لاہور میں جا کر
کیا بابر نے پھر لاہور پر قبضہ
پرانا خواب تھا اس کا
یہ جنگی مصلحت تھی — شہر کو اس نے جلا ڈالا
جو دشمن تھے، انھیں یکسر مٹا ڈالا
بڑھا کچھ اور نیچے کی طرف —
دیپال پور پہنچا
وہاں کی فوج کو بھی قتل کر ڈالا
ہوا دیپال پور اس کا
یہاں دونوں ملے اس کو،
دلاور خاں اور اس کا باپ دولت خان لودھی بھی
قلق تھا ان کو، بابر نے کیا لاہور پر قبضہ
دلاور خاں خوشامد کا سنہرا جال لے کر پہنچا تھا کابل
یہ دولت خان کی اک چال تھی،
لیکن نتیجہ ہو گیا اُلٹا
وا اپنی جنتِ لاہور کو آخر گنوا بیٹھا
کیا بابر سے پھر دھوکا
نہ باز آیا وہ غداری سے،
لیکن چوٹ کھائی اور ہوا رسوا

جو ہوں غدّار فطرت، ان سے امید وفا کیسی
نہ آئے شرم جب ان کو تو آنکھوں میں حیا کیسی
بساطِ جنگ پر شطرنج کی جو چال چلتے ہیں
کبھی وہ جیت جاتے ہیں، کبھی وہ مات کھاتے ہیں
غلط تھی چال دولت خان کی،
وہ پٹ گیا اپنے ہی پیدل سے
دلاور خاں نے پردہ فاش کر ڈالا
جو کل تھا والئ پنجاب دولت خان،
اب خائف تھا وہ اتنا
کہ جا کر ہو گیا روپوش کہساروں کے جنگل میں

جو مفتوحہ علاقے تھے،
وہ جاگیروں کی صورت،
دے دیے اپنے وفاداروں کو بابر نے
بساطِ جنگ کا نقشہ کچھ ایسا تھا،
اگر درکار ہے پنجاب،
تو شہ دینی ہوگی شاہ دہلی کو
یہ سیدھی جنگ تھی بابر کی، ابراہیم لودی سے
بہت مشکل مقام آیا
اسے جانا پڑا کابل
تقاضہ وقت کا یہ تھا،
کہ لائے فوج تازہ دم
گیا جب شیر جنگل سے، تو گیدڑ پھر نکل آئے

بڑھی ہمت جو دولت خان لودی کی
تو بابر کے حریفوں کو کیا پسپا
پھر ابراہیم لودی کی طرف لپکا
شکست فاش کھائی اور ہوا رُسوا

وقت: میں وقت ہوں، حرکت اور عمل ہے میرا مزاج
ہر ایک شخص کا ہر گام ہم سفر ہوں میں
مری نظر میں ہر اک قوم کا عروج و زوال
کہ لوحِ زیست پہ اک حرفِ معتبر ہوں میں

وہ ہو بدخشاں، سمرقند، کابل و لاہور
کہیں بھی تھک کے نہ بیٹھا وہ شاہ بابر تھا
ہر ایک فتح نئی جنگ کی تھی اِک تمہید
وہ اپنے وقت کا دارا نہیں، سکندر تھا

رُکا جو رزم گہہِ زندگی میں اِک لمحہ
دو چند ہوگئی رفتار فتح و نصرت کی
وہ باغیوں کے لیے تیغِ تیز تھا، لیکن
وہ قدر کرتا تھا سچائی اور شجاعت کی

بلند حوصلہ ہوتے ہیں سر بلند سدا
وہ سرنگوں ہی رہے جن کی ذہنیت تھی پست
قدم زمین پہ جن کے ہوں، آسماں پہ نظر
صدائیں فخر سے دیتے ہیں ان کو تاج و تخت

میں ہم رکاب تھا بابر کے، جب گیا کابل
ہزار حادثے آئے سلام کرنے کو
دبائے فتنے بدخشاں کے اس نے سُرعت سے
نہیں گیا تھا مگر واں قیام کرنے کو
محاذِ ہند کی تیاریوں میں تھا مشغول
کہ پہنچا دلّی سے باحالِ زار عالم خاں
بتایا اس نے کہ پھر منتشر ہوا پنجاب
فضا ہے شعلہ فشاں، زندگی ہے سرگرداں

گواہ میں ہوں، کہ بابر نے صدقِ دل سے کہا
مدد کریں گے، مگر ہم معاہدہ کرلیں
کہ بعد فتح بنیں آپ دلّی کے سلطان
تمام صوبۂ پنجاب آپ ہم کو دیں

معاہدہ ہوا، بابر نے حکم جاری کیا
اور اس کی فوج بھی عالم کے ہمرکاب ہوئی
نبھاتا کیسے وہ بابر کے ساتھ عہدِ وفا
جو کرچکا تھا خود اپنے وطن سے غدّاری

تاریخ:
مرے صفحات پر مرقوم ہیں غدّاریاں سب کی
وہ عالم خاں ہو دولت خان لودی یا دلاور خاں
سبھی نے شاہ بابر سے ملایا ہاتھ،
اور سب کا یہ منشا تھا

که بابر پنجہ کش سلطان سے ہو،
اور ابراہیم لودی سا جری ہٹ جائے رستے سے
انھیں مل جائے تاج و تخت دہلی،
اور وہ بابر کی جھولی میں،
زر و سیم و جواہر ڈال دیں،
احسان کی قیمت ادا کر دیں
اگر ممکن ہو اس کو قتل کر ڈالیں
ستم یہ تھا—
یہ سب آپس میں بھی دست و گریباں تھے
ظہیر الدین بابر نے دکھایا ان کو آئینہ
کہ تم نااہل، ناکارہ ہو، کاہل اور بزدل ہو
نہ اپنی بات پر قائم،
نہ ہے پاسِ وفا تم کو
بالآخر سر سے اونچا ہو گیا پانی،
چلا پندرہ سو چھبیس عیسوی میں شاہِ بابر
سوئے ہندوستان کابل سے
بڑھا طوفان کی صورت،
نہ دریا روک پائے اس کی طغیانی
پہاڑوں نے جھکائے سر،
زمیں نے اس بہادر کے قدم چومے
ہٹیں اس طرح سے افواج دولت خان لودی کی
کہ جیسے کائی پھٹ جائے
وہ دولت خان لودی جس نے دو تلواریں باندھی تھیں کمر میں،
سر قلم کرنے کو بابر کا

ذلیل وخوار ہو کر گڑگڑایا،

اور معافی کا ہوا طالب

بابر: ہمارے سامنے حاضر کرو مغرور بوڑھے کو
بنا تھا حاکمِ پنجاب ، اس کو کھینچ کر لاؤ
گلے میں ڈال کر آئے وہ اپنی دونوں شمشیریں
نہ آئے تو پہنادو پاؤں میں لوہے کی زنجیریں
جھکو گھٹنوں کے بل، اچھا! اکڑ اب بھی ہے کچھ باقی
زبردستی جھکادو اس کو ، کھینچو ٹانگ اِک اس کی
بتاؤ خود ہی دولت خان ! تم کو کیا سزا دیں ہم
گھسٹوائیں سرِ بازار یا گردن اُڑادیں ہم

دولت خاں: یہ خادم رحم کا طالب ہے، قدموں میں جگہ دیجے
اگر پھر بھی ہو گستاخی تو گردن کو اُڑا دیجے

بابر: وہ ہم ہیں جس نے تم کو باپ سمجھا، اتنی عزت دی
عطا کیں تم کو جاگیریں ، حکومت اور دولت دی
وہ ہم ہیں جس نے تم کو ہی نہیں، سارے قبیلے کو
بچایا ظلم سے بلوچیوں کے ، فتنہ گر تھے جو
وہ ہم ہیں جس نے ابراہیم لودی کی غلامی سے
تمھیں آزاد کروایا تھا ، اور معہ بال بچّوں کے
وہ ہم ہیں جس نے تم پر انتہا کردی عنایت کی
مگر تم نے ہمارے سائے میں رہ کر بغاوت کی
ہمارے قتل کی خاطر لیے پھرتے تھے تلواریں
اسی سازش میں ہم چاہیں تو تم کو قتل کروادیں

کسی صورت بدلتی ہی نہیں انسان کی خصلت
بدلتی ہی نہیں عادت ، بدلتی ہی نہیں فطرت
کیا ہے ہم نے جاں بخشی کا وعدہ ، خیریت جانو
نہ بخشیں گے مگر ہم سلطنت تم جیسے شیطاں کو
جوان کی ذاتی جاگیریں ہیں بیشک ان کو دیدی جائیں
مگر باقی جو ہیں املاک ، فوراً ضبط کرلی جائیں

تاریخ:
مرحلہ دُشوار تھا ، بابر نے سرکرہی لیا
جیت کر پنجاب گویا حوصلہ اس کا بڑھا
حملہ آور تھا وہ ، رُکنا اس کے حق میں تھا شکست
تھا اسے معلوم ، رُک کر ہمتیں ہوتی ہیں پست
بڑھ چلا تھا جارحانہ اب وہ دلی کی طرف
والیٔ ہندوستاں کا اس کو پانا تھا شرف
واسطہ اس کو تھا ہندوستان کی اقلیم سے
لوہا لینا تھا اسے سلطان ابراہیم سے

اور ابراہیم لودی جاگ اُٹھا تھا خواب سے
وہ نکل آیا تھا آخر عیش کے گرداب سے
عظمتِ دہلی تھا وہ اور خود بہادر نوجواں
اس کی فوجیں تھیں کہ انسانوں کا اک سیلِ رواں
وہ بڑھا منزل بہ منزل ، آ کے پانی پت رُکا
اس نے جب دیکھا ، اُدھر بابر کا لشکر ہے کھڑا
اس طرف لاکھوں سپاہی ، اُس طرف بارہ ہزار
اور پھر لودی کے ہاتھی ، کوہِ پیکر ، بے شمار

زعم ابراہیم لودی کو تھا کہ وہ کثرت میں ہے
اور اُدھر بابر تھکا ، ماندہ ، اقلیت میں ہے
متحد ہو گر اقلیت ، تو ہارے ! کیا مجال!
درحقیقت جنگ پانی پت ہے اس کی اک مثال
ایک ہفتہ تک رہیں فوجیں مقابل میں کھڑی
کچھ نہ تھا معلوم کب آجائے لڑنے کی گھڑی
مورچہ بندی میں بابر نے کیا تھا وہ کمال
فوج کو پھیلا دیا تھا ، جیسے نامعلوم جال
اور توپوں کو کیا تھا اس طرح آراستہ
آدمی کیا ، مست ہاتھی چھوڑ بیٹھیں حوصلہ
فوج کے دائیں طرف کچھ خندقیں کھودی گئیں
بائیں جانب شہر پانی پت کی تعمیرات تھیں
اس طرح محفوظ دونوں میمنہ اور میسرہ
صاف ظاہر تھا کہ ہے بابر کو جنگی تجربہ
اتنی کم تعداد تھی اور جیت کا دل میں یقیں
گر نہ ہو خود اعتمادی تو کبھی ممکن نہیں
بیسویں اپریل سن چھبیں کی شب آگئی
چھپ گیا سورج فضاؤں پر سیاہی چھا گئی
آؤ اس عالم میں دیکھیں ، شاہِ بابر ہے کہاں
اپنے خیمہ میں فروکش ہے وہ پیرِ نوجواں

بابر: کس زباں سے شکر تیرا ہو ادا ربِّ جلیل
میرے جانی دشمنوں کو کردیا تو نے ذلیل

میں ترا ناچیز بندہ ، پا کے تیرا آسرا
اپنے آبائی وطن سے چل کے یاں تک آ گیا
اب مری منزل ہے دلّی اور اس کا تخت وتاج
مجھ کو اب لینا ہے ابراہیم لودی سے خراج
راز یہ مجھ پر کھلا آ کر ، کہ ہندوستان میں،
بغض ونفرت اور عداوت کی ہیں کچھ گہری جڑیں
کس قدر زرخیز ہے یہ ملک ہے دولت کی کان
بہتی ہیں چاندی کی ندیاں، بستیاں ہیں عالی شان
پتّیاں سونا لٹائیں ، پھول گوہر بار ہیں
لہلہاتے کھیت خوش حالی کے سبزہ زار ہیں
موسمِ برسات ہے جنت کی رنگینی کا نام
گوشِ دل سے گر سنیں ، ہر ذرّہ کرتا ہے کلام
ہے ہر اک دولت یہاں ، لیکن نہیں حبِ وطن
باغباں لالچ میں آ کر بیچ دیتے ہیں چمن
ہر قدم ، ہر موڑ پر ، ہر راہ میں غدّار ہیں
کاٹنے کو بھائیوں کی گردنیں تیّار ہیں
ایک عالم خاں نہیں ، کچھ اور بھی مکّار ہیں
ہم سے مل کر بے وفائی کے لیے تیار ہیں

ملاّ مذہب ، جن کا مذہب ہے فقط مکرو ریا
اور آرائش ، کہ جس نے ہم سے یہ سودا کیا
''ہم کہ ہیں وابستۂ دربارِ دہلی آج کل
کارِ سلطانی میں لیکن ڈالتے ہیں ہم خلل

آپ سے لیکن ابھی سے کرتے ہیں عہدِ وفا
آپ سے پائیں گے ہم ذوقِ اطاعت کا صلہ"
مہرباں ہم پر ہوا ہے جانے کیوں سنگرام سنگھ
ہو جو ممکن نام اس کا رکھ دیں ہم بدنام سنگھ
اس کی خواہش تھی لڑائی میں ہمارا ساتھ دے
اور ظاہر ہے کہ ہم سے بعد میں سودا کرے
غیر کی شرکت محاذِ جنگ میں ہے ناگوار
شیر جنگل میں اکیلے کرتا ہے اپنا شکار

میں ترا بندہ ہوں یارب! تو ہے ربّ العالمین
فتح میں اس جنگ میں پاؤں گا ہے مجھ کو یقین
خدمتِ ہندوستاں کا گر مجھے موقع ملا
میں یہ سمجھوں گا، کہ ہے یہ میری محنت کا صلہ
اپنے خوابوں کا چمن اس کو بنانا ہے مجھے
گوشے گوشے کو بہ ہر عنواں سجانا ہے مجھے
تفرقوں کو بھول کر، سب جوشِ الفت سے ملیں
دوستی اور پیار کے غنچے سرِ گلشن کھلیں
دوردورہ ہو محبت کا تمنا ہے یہی
کام آجائے بنی آدم کے میری زندگی
رات ڈھلتی جارہی ہے صبح کے آثار ہیں
تیرگی سے شوخ کرنیں برسرِ پیکار ہیں
سامنے ہے جنگ کا میدان، میدانِ عمل
اک سپاہی کے لیے ہے یہ دبستانِ عمل

ارضِ پانی پت! تری عظمت کو رفعت کو سلام
ہیں تری آغوش میں آسودہ کتنے نیک نام
ہے تصوّف کی مہک تجھ میں، ترا دامن ہے پاک
اے خوشا ہے میرے قدموں کو میسر تیری خاک
تیری حرمت کو بچاؤں ، ہے یہ میری آرزو
جانے کب سے میرا دل ہے تجھ سے گرمِ گفتگو
اے خداوندِ محبت مجھ کو قوت ہو عطا
رزم گہ میں ہو نہ جائے پست میرا حوصلہ

تاریخ:
حوصلہ بابر کا تھا جیسے ہمالہ کی چٹان
اس میں تھی چیتے کی تیزی اور شیرِ نر کی شان
رات کے خیمے سے نکلا سرخ چہرہ آفتاب
تیر کرنوں کے چلے، اُلٹی اندھیرے کی نقاب
اور پھر آ ہی گئی وہ صبح ، صبحِ انقلاب
بطن میں جو وقت کے کھاتی رہی تھی پیچ و تاب
لودیوں کی فوج بے ترتیب سی اک بھیڑ تھی
جھومتی وہ ہاتھیوں کے ساتھ جب آگے بڑھی
بابری فوجوں نے اس انداز سے یلغار کی
فوج ہندوستان کی منہ دیکھتی ہی رہ گئی
دائیں بائیں سے کیے حملوں پہ حملے پے بہ پے
کیا کریں! کیسے لڑیں! افغان کر پائے نہ طے
تھے بڑی تعداد میں افغان ، لیکن پھنس گئے
گھِر گئے آپس میں اور اِک دوسرے میں دھنس گئے

اور جب توپیں بڑھی ہیں آگ برساتی ہوئی
جنگ کے میدان میں گویا قیامت آ گئی
رفتہ رفتہ آ گئے نرغے میں سب افغان جب
ٹوٹ کر حملہ کیا ترکوں نے باغیض و غضب
دیکھتے ہی دیکھتے لاشوں سے میداں پٹ گیا
سورما کام آئے اور سلطان کا سر کٹ گیا
جنگِ پانی پت کا تھا میدان اب بابر کے ہاتھ
فوج کی تعداد کم تھی ، ہاں مگر قسمت تھی ساتھ
وقت نے بابر کا پرچم اور کچھ اُونچا کیا
کل جو تھا اِک حملہ آور آج وہ فاتح بنا

وقت: ملوکیت کا تھا وہ دَور،
جنگ اِک کھیل تھا راجاؤں کا اور بادشاہوں کا
مگر یہ جنگ پانی پت، نہ تھی اِک عام جنگ،
اس جنگ نے تاریخ کا رُخ موڑ کر،
تہذیبِ نو کی طرح ڈالی تھی
دیا اِک درسِ عبرت راجپوتوں کو،
کہ غدّاری وطن سے خودکشی کا پیش خیمہ ہے
سلاطیں کو دِکھایا آئینہ،
انجام غفلت کا، رعونت کا،
نئی تہذیب نے انگڑائی لی،
آئیں بہاریں رقص کرتی صحنِ گلشن میں
مگر اس کو مغل تہذیب کہہ دینا غلط ہوگا
مغل تو بربریت کے تھے پروردہ

وہ اپنی فتح کے مینار لاشوں سے بناتے تھے،
انھیں تو ملک گیری کی ہوس تھی،
سلطنت کو جیتنا معراج تھی ان کی

اُدھر دہلی میں صدیوں سے،
سلاطیں صرف حاکم تھے
انھیں ہندوستاں کی رُوح سے وابستگی کم تھی
کہ روحِ ہند تو سوئی رہی صدیوں
قدم پتھرا گئے تھے رقص کے،
گونگی تھی موسیقی
ہنر معدوم تھے اصنام سازی کے
گپھائیں تھیں نظر انداز،
ان کی اہمیت اور ان کی عظمت تھی جہانِ نو سے پوشیدہ
رِشی، منیوں کی عظمت،
ان کی تخلیقات، ان کا علم
سب اک خواب تھا جیسے

مگر بابر نے ہندوستان کو جب غور سے دیکھا،
کھلا اس پر،
اگر ہندوستاں کو فتح کرنا ہے،
تو دریاؤں، پہاڑوں اور زمینوں کو نہیں
اس ملک کے افراد کے دل جیتنے ہوں گے
ہمیں یہ جاننا ہوگا کہ ہندوستاں کی عظمت کا سبب کیا ہے

ہزاروں سال کی تاریخ سے کیا درس لینا ہے؟
یہاں کے علم سے اور فلسفے سے سیکھنا ہوگا،
ریاضت کس طرح بیگانہ کر دیتی ہے دُنیا کی محبت سے
قناعت کس طرح مغلوب کر لیتی ہے لالچ کو،
ہوس کو، زر پرستی کو
مذاہب اور عقائد مختلف ہو کر بھی آپس میں گلے ملتے ہیں آخر کیوں؟
یہ ربطِ باہمی کیا ہے؟
یہی رُوحانیت ہے، اور یہی وہ اسمِ اعظم ہے،
ہزاروں سال سے اس ملک میں شیر و شکر ہیں فلسفے سارے
ہمیں ان سے الگ رہ کر نہیں،
مل کر،
نئی تہذیب کی تخلیق کرنی ہے
بساطِ نو بچھانی ہے نئے انداز سے، لیکن
قدیم اقدار سے اس طرح ہم آہنگ ہونا ہے
بساطِ نو ہو چنگیزی نہ تیموری،
اُبھر کر رُوحِ ہندوستاں بھی آئے،
شاعری میں، رقص و موسیقی میں، تعمیرات میں،
تہذیب کے ہر ایک شعبے میں
ثقافت کا نیا منظر نظر آئے
مساجد اور شوالے اُس کی عظمت کے مظاہر ہوں،
کہ جو معبود ہے سب کا
عقائد کا کریں سب احترام،
اِک دوسرے کے ہوں شریکِ غم

غرض پیدا کریں ہم مملکت میں اِک نیا عالم
نیا اِک تجربہ حاصل ہوا ہے ہم کو ہندستان میں آ کر
کہ فاتح بن کے جینا باعثِ عزت تو ہے، لیکن،
اگر اس ملک کا خادم کہے دُنیا ہمیں،
تو فخر ہوگا اپنی قسمت پر
ہمیں یک جہتی و اخلاص کی دُنیا بنانی ہے
عمارت اِک نئی اس ملک کی ہی خاک سے ہم کو اُٹھانی ہے

تاریخ: میں ہوں تاریخ
میری زندگی اوراقِ کہنہ سے عبارت ہے
جہاں بھی ذکر غدّاروں کا آیا ہے،
وہاں اوراق زخمی ہیں
تعصب اور فریبِ دوستی کے تذکرے ناسور ہیں،
جن سے لہو رستا ہے صدیوں سے
لکھے بابر نے اوراقِ شجاعت،
آدمیت کی حسیں اقدار کو پھولوں کی صورت اس نے مہکایا
لکھا ایثار کا ایسا ورق اس نے،
ہمایوں کو جو موت آنی تھی
اس کو سلب کر کے نذر کر دی اس نے جاں اپنی
ہمایوں صاحبِ کردار تھا، اخلاص اس کا جوہرِ ذاتی،
وہ بابر کا تھا وارث اور سخاوت میں تھا لاثانی
عطا کیں بھائیوں کو اس نے جاگیریں
مگر ان بھائیوں نے اس کے حق میں بو دیئے کانٹے
وہ آخر آ گیا نرغے میں شیرِ شاہ سوری کے

بہ صد مشکل بچا کر جان وہ ایران کو بھاگا
زمانہ کیسے کیسے گل کھلاتا ہے
مرے اوراق شاہد ہیں
جو نیک انسان ہوں، وقت ان کو اکثر آزماتا ہے
فسانہ مختصر اک بیچ میں آیا،
کہ شیرِ شاہ سوری نے،
لکھا اک باب ہمت اور شجاعت کا
ہمایوں کو ہرا کر امتیازی شان پائی بادشاہوں میں
نظامِ سلطنت کی طرح نو ڈالی
مگر تھا دَور اس کا مختصر، نااہل تھے وارث
جو پایا تھا گنوا بیٹھے

لہو رِستا ہے زخموں سے مرے اوراق کے، جن پر یہ لکھا ہے،
وہ بھائی تھے کہ دشمن جو تماشہ دیکھتے تھے،
اپنے بھائی، اپنے محسن کا! ہمایوں کا،
کہ وہ بن کر بھکاری شاہِ ایراں کے یہاں پہنچا!!
مگر طہماسپ صفوی صاحبِ دل، صاحبِ کردار تھا، اس نے،
لگایا میہماں کو اپنے سینے سے
رکھا زخموں پہ مرہم،
عزت و توقیر بخشی،
فوج بھی ہمراہ کر دی جنگ کی خاطر
ہمایوں اپنی قسمت آزمائے،
غاصبوں سے سلطنت چھینے

طویل افسانہ ہے جہدو عمل کا،
مختصر یوں ہے،
کہ سوری بادشاہوں سے ہمایوں نے لیا لوہا
وہ جو کچھ کھو چکا تھا بھائیوں کے فتنہ و شر کی بدولت،
اب اسے حاصل کیا طہماسپ صفوی کی اعانت سے،
ہمایوں تھا، یہ اس کی خوش نصیبی تھی،

مسرّت کے مگر لمحات کم ہوتے ہیں دُنیا میں
بساطِ سلطنت تھی منتشر،
شیرازہ بندی ہو نہ پائی تھی
اچانک آ گیا پیغام اجل کا،
اور ہمایوں چھوڑ کر سب کچھ
اُٹھا اس بزمِ خاکی سے
حریفانِ مغل تھے تاک میں،
یلغار کی موقع غنیمت جان کر، لیکن،
لیے اکبر کو پہلو میں ہوا سینہ سپر بیرم
یہ پس منظر ہے پانی پت کی جنگِ دوم کا سولہ سو چھپّن میں

وقت: فخر ہے مجھ کو کہ لب پر ذکر ہے اکبر کا آج
پیش کرتی ہے جسے دُنیا عقیدت سے خراج
ہند کی زرخیز مٹّی سے اُٹھا اس کا خمیر
تھا وہ دریا دِل، خرد افروز اور روشن ضمیر
بخت کا مارا ہمایوں، شیر شہ سے ہار کر
ڈھونڈنے کوئی سہارا پھر رہا تھا دربدر

بھائیوں نے کی دغا ، احباب نے ٹھکرا دیا
نیکیوں کا مل رہا تھا شاہ کو اچھا صلہ!
اس مصیبت کے سفر میں ساتھ تھے کچھ جاں نثار
ان وفاداروں میں بیرم خاں کا بیشک تھا شمار
تھا وہ ایرانی ، مگر بابر کا تھا وہ ہم رکاب
تین پشتوں تک رہا خدمت میں سب کی باریاب
تیغ زن تھا، عقل و دانش میں تھا یکتائے جہاں
اس کی خواہش تھی، ہمایوں چھوڑ دے ہندوستاں
شاہِ ایراں کی نجابت پر تھا اس کو اعتماد
تھا یقیں، پائیں گے شاہنشاہ واں اپنی مراد
عالمِ صحرانوردی ، بدنصیبی ، ہم قدم
آسماں پر گھر کے آیا یک بیک ابرِ کرم
کارواں ٹھہرا ہوا تھا سندھ میں، ٹھٹھ کے قریب
جاگ اُٹھے واں نصیرالدیں ہمایوں کے نصیب
والیٔ ہندوستاں ، عالی نسب پیدا ہوا
جس کی پیشانی پہ رب نے اکبرِ اعظم لکھا
باپ نے بیٹے کو چھوڑا منتشر لشکر کے پاس
اس سفر نے کر دیا تھا اور بھی سب کو اُداس
قافلہ آگے بڑھا، گردش میں گزرے ماہ و سال
ہر کمالے را زوالے ، ہر زوالے را کمال
جس کو قسمت لے گئی تھی دُور ہندوستان سے
آیا دلّی میں ہمایوں فاتحانہ شان سے

خاکِ دہلی نے اسے اعزاز بخشا تھا، مگر
موت تھی نزدیک، آئی یک بیک پر تول کر
بخت جس کا اوج پر تھا، بام سے نیچے گرا
موت نے اس فاتحِ ہندوستاں کو جا لیا
آج اس کا مقبرہ ہے دہر میں اپنی مثال
تاج کا وہ نقشِ اوّل، فن ہے جس کا لازوال

سلطنت کمزور تھی، کمسن تھا اس کا تاجدار
تھا اتالیق اس کا بیرم خان جیسا جاں نثار
باغیوں نے اس طرح ہر سمت سے یلغار کی
آسمانِ مغلیہ پر دُھند سی اک چھا گئی
اکبرِ اعظم تھا کمسن، تھا مگر بالغ نظر
اس نے بیرم خاں کی عزّت میں نہ چھوڑی تھی کسر

اکبر: خان بابا!
آپ والد کی طرح ہیں محترم
آپ نے رکھا شہنشاہِ ہمایوں کی وصیت کا بھرم
دُور ہیں دلّی سے، ہم،
کی ہے رسمِ تاج پوشی، اور محاذِ جنگ پر!
آپ جیسے نیک دل انساں زمانے میں ہیں کم

بیرم خاں: مجھ کو شرمندہ نہ = ، تھا یہ فرضِ منصبی
وقت کا یہ تھا تقاضہ،
ایک دن کی دیر بھی،

تھی خلافِ مصلحت
شکر ہے اللہ کا
آپ کل تک تھے ولی عہدِ حکومت، اور آج،
آپ ہیں ظلِّ الٰہی، میں ہوں خادم آپ کا

اکبر: یہ نہ کہیے، آپ ہیں میرے بزرگ
خان بابا، خان خاناں ہیں، سپہ سالار ہیں
آپ ہیں مختارِ کل،

بیرم خاں: ناتواں کاندھوں پہ میرے اور یہ بارِ گراں!

اکبر: آپ ہیں پیرِ جواں

بیرم خاں: ہم ہیں ہر لحہ محاذِ جنگ پر،
ہر طرف سے ملک پر یلغار ہے
فتنۂ تازہ ہے ہیموں، وہ نمائندہ ہے عادل شاہ کا
فتح کر کے آگرہ کو،
اور پھر دلّی میں پسپا کر کے تردی بیگ کو
بڑھ رہا ہے وہ ہماری ہی طرف
ہاتھ پر یوں ہاتھ رکھ کر ہم نہ بیٹھیں گے یہاں سرہند میں
ہے بہادر وہ کہ جو سبقت کرے مردانہ وار
آپ ہیں اس مملکت کے تاجدار
جنگ میں بڑھتا ہے شاہوں کا وقار
ہے ہمارے ساتھ بیشک رحمتِ پروردگار

اکبر: خان بابا! آپ کے ہر مشورے پر ہے سرِ تسلیم خم،
ہم لڑیں گے بے دریغ
عظمتِ تیمور و بابر کی قسم،

بیرم خاں: ہے مناسب خاں زماں سبقت کریں،
ایک دستہ فوج لے کر،
ہم سے کچھ آگے بڑھیں

وقت: اور پھر رن پڑا
پانی پت میں ہوا آمنا سامنا دونوں افواج کا
فوجِ ہیموں کی تعداد اِک لاکھ تھی،
اور ہاتھی ہزاروں کی تعداد میں
اکبری فوج تعداد میں تھی بہت کم، مگر،
حوصلے تھے بلند
سر ہتھیلی پر لے کر چلا تھا ہر اِک نوجواں،
وہ سپاہی جنھیں واسطہ کچھ نہ تھا سلطنت سے
نہ کچھ فائدہ جنگ سے،
پیٹ کی آگ لائی تھی جن کو یہاں
حکمرانوں کی خاطر لڑے اور مرے،
ملک گیری کا پھر کھیل کھیلا گیا
خون سے اِک ورق اور لکھا گیا،
پانی پت! تیری تاریخ کا
کچھ بتا،
تیرے دل پر اثر کیا ہوا دوسری جنگ کا

پانی پت: ابھی نہ گرد بھی بیٹھی تھی میرے میداں کی
ابھی تو گھوڑوں کی ٹاپوں کی گونج تھی باقی
ابھی فضاؤں میں چنگھاڑ ہاتھیوں کی تھی
ابھی تو کانوں میں آواز زلزلوں کی تھی

لہو میں ڈوبا ہوا تھا ابھی ہر اِک منظر
ہزاروں خون کے دھبّے تھے میرے دامن پر
سسک رہی تھیں تہہِ خاک کس قدر لاشیں
بھٹکتی پھرتی تھیں میدانِ حشر میں رُوحیں
کہ صرف تیس برس بعد میرے سینے پر
چڑھ آیا جوشِ رعونت میں ہیموں کا لشکر

اِدھر سے اکبر و بیرم کا کارواں آیا
بہ صد خروش ، بہ صد ہمّتِ جواں آیا
پھر اس کے بعد جو پہلے ہوا تھا، اب بھی ہوا
محاذِ جنگ میں دوزخ کا ایک باب کھلا
لہو میں ڈوب کے اُبھریں ہزار تلواریں
دِلوں میں ، سینوں میں ٹوٹیں ہزار تلواریں

نشے میں جنگ کے ہر ایک شخص پاگل تھا
مرے نصیب میں لاشوں کا ایک جنگل تھا
سپاہی اِک نہیں مرتا ہے اس کی موت کے ساتھ
کبھی وہ مرتے ہیں، ہوتا ہے جن پہ اس کا ہاتھ
یتیم ہوتا ہے اِک کنبہ ، خاندان تباہ
اور اس تباہی کا ہوتا ہے آسمان گواہ

ہوا جو موت کا بازار گرم، ہوش نہ تھا
کہ شہسوار ہے کون اور کون ہے پیادہ

اگرچہ ہیموں تھا پہنے ہوئے زرہ بکتر
کسی کا تیر لگا اس کی آنکھ میں جاکر
گرا وہ ہاتھی سے اور گر کے ہوگیا بے بس
پھر اس کے قتل میں بیرم نے کی نہ پیش و پس
بس ایک وار میں تن سے جدا کیا سر کو
ہٹائے راہ کے کانٹے، مٹا دیا شر کو
یہ فتح اکبرِ اعظم کو اتنی راس آئی
کہ اس نے ہند کی تاریخ میں جگہ پائی
مگر یہ جنگ مرے سینے میں تھی اک خنجر
وہ زخم کھائے ہیں، اُٹھتی ہے ٹیس رہ رہ کر

تاریخ:
فتح اکبر کی نہ تھی، یہ فتحِ بیرم خاں کی تھی
شاہِ تیموری کو جس نے جنگ کی ترغیب دی
فتح نے پھر وقت کا یہ فیصلہ دہرا دیا
بن چکا ہے ہند کی تقدیر دورِ مغلیہ
طفل تھا اکبر، بڑھاتا گر نہ بیرم حوصلہ
فیصلہ کچھ اور ہوتا پانی پت میں جنگ کا
اس سے پہلے بھی ہمایوں کی رفاقت اس نے کی
صاحبِ کردار تھا، بے لوث خدمت اس نے کی
مغلیہ تاریخ بیرم خاں کی ہے احسان مند
تربیت میں اس کی اکبر کا ہوا رُتبہ بلند

پانی پت میں اک نیا بابِ شجاعت کھل گیا
پرچمِ اخلاص و تہذیب و مروّت کھل گیا

عہدِ زرّیں ہند کا بیشک ہے عہدِ اکبری
اِک نئی تاریخ شاہنشاہ اکبر نے لکھی
وحدتِ اقوام کا جو درس اکبر نے دیا
بن گیا ہے آج وہ تہذیبِ نو کا فلسفہ
زندگی کو اس نے بخشا ایسا آئینِ عمل
سامنے جس کے قدامت کی ہوئیں شمعیں خجل
شاہ تھا وہ، سلطنت کی اس نے بھی توسیع کی
دل سے دل مل جائیں، ایسی آرزو اکبر کی تھی
علم و فن کی جنتیں آباد کیں دربار میں
نورتن ایسے ، مورّخ جن کو لاثانی کہیں
علم و فضل و فلسفہ، موسیقی و صورت گری
دسترس میں زندگی کی ہر ادا ہر جہت تھی
مشعلوں سے مشعلیں جلتی رہیں تہذیب کی
کتنی نسلیں پھولتی پھلتی رہیں تہذیب کی
کارواں در کارواں بڑھتا رہا یہ سلسلہ
فخرِ تاریخِ جہاں ہے خاندانِ مغلیہ
بعد اکبر تھا جہانگیر ایسا شاہِ ذی وقار
نقشِ عظمت جس کے ہیں ہندوستاں میں بیشمار
تھا وہ شاہنشاہ ، اپنے وقت کا نوشیرواں
عدل اور انصاف میں اس کا بھلا ثانی کہاں

اور پھر شاہِ جہاں کا پرچم عظمت کھلا
بابِ اخلاص و نشاطِ و حشمت و شوکت کھلا

تاج ہے اس کی محبت کی وہ نادر یادگار
سنگ مرمر کی رگوں میں جس کا دل ہے بیقرار

اور اورنگ زیب جیسا بادشاہِ خوش خصال
عزم و ہمت میں ہمالہ ، باوقار وپُر جلال
اس نے شاہی کرّ وفر کو کوئی اہمیت نہ دی
سر بہ سر تھی اِک عبادت اس کی ذاتی زندگی
ہندو و مسلم نظر میں اس کی بیشک ایک تھے
تھے معزز وہ کہ جو تھے صلح جو اور نیک تھے
یوں تو شاہنشاہ تھا ، کھاتا تھا وہ اکلِ حلال
ہند کی تاریخ میں ہے بے نظیر و بے مثال

ہر زوالے راکمالے ، ہر کمالے را زوال
صادق آئی خاندانِ مغلیہ پر یہ مثال
دورِ اورنگ زیب تھا معراجِ شاہانِ مغل
آخرش آئی خزاں سوئے دبستانِ مغل
منتشر ہونے لگے اجزائے ملک و مملکت
خانہ جنگی سے ہوا برہم نظامِ سلطنت
شاہزادوں کو ہوا لاحق تعیش کا مرض
زنگ آلودہ ہوئی تلوار بابر الغرض
اکبر و شاہِ جہاں کی رہ گئی بس داستاں
تختِ دہلی پر مزیّن ہوگئیں کٹھ پتلیاں

ہیں تو دفتر میں مرے گیارہ شہنشاہوں کے نام
رفتہ رفتہ ہوگئے تھے سب امیروں کے غلام

بعد اورنگ زیب آخر ڈیڑھ سو ہی سال میں
خواب ہوکر رہ گئیں مغلوں کی ساری عظمتیں
عیش کوشی کی بدولت کیا بچا تھا خون میں
نام تھا ، وہ دفن ہوکر رہ گیا رنگون میں

تھا بہادر شاہ اوّل قابل و دانا، مگر
وقت نے اس کو دیا تھا نام ، شاہِ بے خبر،
پھر جہاندار شاہ جب غرقِ مئے عشرت ہوا
حکم سے فرخ سیر کے قتل کروایا گیا
زیب تختِ مغلیہ فرخ سیر تھا لاکلام
ہاتھ میں تھی 'سیدوں' کے بادشاہت کی لگام
واسطے ، ان بھائیوں کے بادشاہت کھیل تھا
تخت پر اِس کو بٹھایا ، اُس کا سر کٹوا دیا
جب محمد شاہ تخت و تاج پر قابض ہوا
اس نے سیّد بھائیوں کا قلع قمع کردیا
تختِ طاؤسِ رعونت کا نشہ ایسا چڑھا
اس نے دادِ عیش دی اتنی ، رنگیلا بن گیا

اوج پر جب رنگ رلیاں تھیں محمد شاہ کی
سوئے دہلی شاہِ ایراں نے نظر ناگاہ کی
تھا محمد شاہ خود ہی سازشوں کے جال میں
آیا نادر شاہ ، آخر رن پڑا کرنال میں
ہوچکی تھیں پہلے ہی ناکارہ افواجِ مغل
نادری تلوار اب سر پر گری بن کر اجل

اور نادرشاہ نے پھر فتح دہلی کو کیا
صلح کرلی شاہ سے ، تاوان بھی اس سے لیا
'تختِ طاؤس' اور جو کچھ لے سکا وہ لے گیا
بادشاہِ وقت کو وہ درسِ عبرت دے گیا

دلّی والوں کا کیا نادر نے ایسا قتلِ عام
کانپتے تھے خوف سے سنتے ہی بچّے اس کا نام
نادری حملے نے لوٹا شاہِ دہلی کا بھرم
کھل گیا سب پر کہ مغلوں میں ہے باقی کتنا دم
سازشوں کا جال پھیلا ، باغیوں نے سر اٹھائے
سیکڑوں نے پر نکالے ، مرہٹے دہلی تک آئے
عالمی تہذیب میں یہ بارہا دیکھا گیا
ظالموں کو دستِ قدرت خود ہی دیتا ہے سزا
وقت نے آخر لیا نادر سے ایسا انتقام
کردیا اِک معتمد نے کام ہی اس کا تمام
تھا جو قاتل بے گناہوں کا ، ہوا اس کا بھی قتل
جس کے سر تھا خون ہزاروں کا ، ہوا اس کا بھی قتل

اس کا اِک جرنیل احمد شاہ ابدالی اٹھا
خودغرض ، بے رحم ، شاطر ، قوم سے افغان تھا
سونت کر تلوار وہ بھی ہند کی جانب بڑھا
پے بہ پے حملے کیے تاراج شہروں کو کیا
صوبۂ پنجاب پر ٹوٹا وہ بن کر اِک عذاب
دہلی و متھرا میں چھیڑا بربریت کا رباب

جس طرف گزرا، اڑادی اس نے بازاروں میں خاک
پانچویں حملے کا پس منظر بہت ہے شرمناک

دور احمد شاہ تھا اور ہر طرف تھیں سازشیں
مرہٹوں نے بھی یہ سوچا، کیوں نہ ہم دلّی چلیں
سر روہیلوں نے اٹھایا، اور خطرہ بڑھ گیا
مرہٹوں سے شاہ تب امداد کا طالب ہوا
مرہٹی فوجوں نے روہیلوں کو کو پسپا کردیا
شاہِ دہلی کو مگر بالکل نکما کردیا
ہند میں یہ خانہ جنگی کے مناظر دیکھ کر
حملہ آور شاہِ ابدالی ہوا با کروفر
تھپتھپایا شاہِ دہلی کو بڑھائے حوصلے
'آپ شاہنشاہ ہیں' باغی ہیں بیشک مرہٹے
ہم تمھارے دوست ہیں، مل جائیں افغان اور مغل
کرکے پسپا مرہٹوں کو، مسئلے کرلیں گے حل
'شاہ عالم دوم' تھا بس نام کا ہی بادشاہ
اس نے سوچا، مرہٹے ہوجائیں گے لڑکر تباہ
متحد فوجیں بڑھیں اور پانی پت میں رن پڑا
مرہٹوں کا اور ابدالی کا یہ ٹکراؤ تھا
مرہٹوں کی ساری قوت پارہ پارہ ہوگئی
اور ابدالی کی عظمت آشکارا ہوگئی
اِک نئی تاریخ پانی پت میں پھر لکھی گئی
بعد دو سو سال کے آندھی چلی پھر خون کی

آخری حملہ تھا ابدالی کا واپس جب گیا
موت اس کی منتظر تھی ، دفن کابل میں ہوا
پانی پت کی جنگ مغلوں کو ہمیشہ راس آئی
ابتلا کا دور تھا ، پھر بھی انھوں نے فتح پائی

پانی پت:

یہ جنگیں،
یہ غارت گری کے تماشے،
مجھے مت دکھاؤ
مجھے مت سناؤ یہ خونیں افسانے
بہت تھک گیا ہوں یہ سب سنتے سنتے
مجھے ایسا لگتا ہے شاید،
اُبلنے لگیں گے مری خاک سے بے گناہوں کے لاشے
یہ تاریخ کا کوڑھ ہے میرے سینے پہ قائم،
کریدو نہ یوں میرے زخموں کو،
ٹیسیں اٹھیں، تلملاؤں، تڑپتا رہوں میں
بچا ہے جو تاریخ میں، اس کو عبرت کی خاطر،
سناؤ انھیں، جن کے دل میں ابھی ملک گیری کی حرص وہوس ہے
ہزاروں برس کی مری زندگی ہے،
یہ دو چار دن جن کو جنگ وجدل سے ہے نسبت،
انھیں کاٹ کر میرے اعمال نامے سے لے جاؤ،
رکھ دو عجائب گھروں میں
جہاں جنگ بازوں کے رتھ،
تیر، تلوار، نیزے سجائے گئے ہیں

جہاں تختِ طاؤس اوندھے پڑے ہیں
مجھے اس جہنم سے آزاد کردو
ابھی تذکرے فخر سے تم نے جن کے کیے ہیں
وہ اغیار تھے،
روندنے آئے تھے میری چھاتی
کوئی جنگ جو اس زمیں سے نہ اُٹھا،
نہ پیدا ہوا ہے کوئی کنس دھرتی پہ میری
نہ غدّار کوئی،
نہ جے چند، صادق، نہ ہی میر جعفر
مشیت نے پیدا کیے یاں سخنور
مری خاک سے آدمیت کے پیکر اُٹھے ہیں،
خدا کے وہ بندے،
جنھیں علم و عرفاں کی دولت ملی تھی
مری سرزمیں پر،
مذاہب گلے مل کے گاتے ہیں وحدت کے نغمے
مجھے سوچنے دو،
اُگے ہیں مری خاک سے کیسے کیسے محبت کے پودے
کہ پھل پھول جن کے،
محبت کی خوشبو زمانے میں پھیلا رہے ہیں

مجھے یاد آیا، 'قلندر' کے پہلو میں سویا ہوا ہے
وہ عالم، وہ شاعر، مصنّف، مورّخ،
محبِّ وطن، محسنِ آدمیت،
کہ جس نے خزاں میں نیا گیت گایا،

بہارِ چمن کا

نئی طرز میں ساز چھیڑا سخن کا،
نفاست سے بدلا نظام انجمن کا،
مجھے یاد آتا ہے لختِ جگر اپنا — الطاف حالؔی
جو اک استعارہ ہے حلم و شرافت کا، حبِ وطن کا

وقت: مرحبا! خوب تجھے حالؔی کی یاد آئی ہے
واقعی صاحبِ کردار تھا الطاف حسین
ہے مجھے یاد، زمانہ تھا بہت کج رفتار
جادۂ حق کا طلب گار تھا الطاف حسین

مجھ سے کتراتے تھے اور آنکھ چراتے تھے لوگ
اس نے سمجھا تھا مگر، میرا تقاضہ کیا ہے
وہ اندھیرے میں نئی شمعِ وفا لے کے چلا
پڑھ لیا اس نے، مرے ماتھے پہ لکھا کیا ہے

مصلحت کا مرے مسلک میں نہیں کوئی جواز
میں سفر میں ہوں ازل سے، کہیں منزل نہ قیام
میں کہ ہوں وقت، مرے ساتھ جو چل پڑتا ہے
کامیابی اسے کرتی ہے بہ ہر گام سلام

اپنے مخرج پہ ٹھہرتا نہیں دریا کوئی
شوقِ منزل اسے لے جاتا ہے میدانوں میں
طلبِ علم میں حالؔی بھی وطن سے نکلا
زندگی لے گئی تہذیب کے میخانوں میں

جستجو تھی نئی دنیائے سخن کی اس کو
لے گیا شوق اسے دلّی ولاہور و دکن
علم کی پیاس ہے ایسی کہ بجھائے نہ بجھے
کچھ سکوں اس کو ملا پی کے مئے حبّ وطن

غالبؔ و شیفتہ کے ساتھ جو پی ، کہنہ تھی
نشے میں جھوم گیا عشق ہوا ساقی سے
رہ کے دلی میں اسے صحبتِ یاراں راس آئی
مدحِ ساقی میں بہت دفترِ عظمت لکھے

بزم لاہور میں آزاد کی صحبت پائی
نیچرل رنگ بھی مولانا پہ کیا خوب کھلا
اِک نئی طرز کی بنیاد رکھی حالی نے
میں ہوں شاہد کہ ملا ان کو ذہانت کا صلہ

قوم کا درد ملا صحبتِ سرسیّد سے
ہوکے سرشارِ غمِ عشق ، مسدّس ، لکھی
شاعری ایسی کہ الہام ہوا ہو جیسے
آخر آخر ہوئے شمس العلماء بھی حالی

نظم نو ہوکہ غزل ، نقد و نظر یا تاریخ
آشیانہ ہے ہر اِک شاخ پہ اس بلبل کا
زندہ جاوید ہوا لکھ گئے حیاتِ جاوید،
الغرض قافلہ سالار ادب کا ٹھہرا

تیری نسبت سے زمانے میں ہوا وہ مشہور
پانی پت تجھ کو مبارک ترا فرزند عظیم
تیری مٹی کا تھا جو قرض ادا اس نے کیا
حق نے بخشا تھا اسے سوزِ سخن ، ذوقِ سلیم

تاریخ:
اس میں تاریخی حقائق ہیں یقیناً شامل
میرے اوراق پہ تو حالی ہے اِک حرفِ جلی
میں کہ شاہد ہوں بدلتی ہوئی تہذیبوں کی
جب تغیر کی ہوا چلتی ہے گلزاروں میں
اور طوفاں میں اکھڑ جاتے ہیں جڑ سے پودے
ٹوٹی شاخیں کہیں جم جاتی ہیں صحراؤں میں
جڑ پکڑ لیتی ہیں ، پھر برگ و ثمر آتے ہیں
پھول کھلتے ہیں نئی مٹی کی رنگت لے کر
پھیل جاتے ہیں نئی فکر کے گلشن ، نئے باغ
علم و دانش کی روایات کے جلتے ہیں چراغ
نسبی طور سے انصاری تھے الطاف حسین
خاندان آیا مدینے سے یہ پانی پت تک
ابو ایوب کی اولاد میں تھے میرک شاہ
علم پرور تھے ، سخاوت میں تھے یکتائے جہاں
حق نے بخشی تھی انھیں سلطنتِ ملک ہرات

شاہ کا بیٹا بھی ہو شاہ ، ضروری تو نہیں
واردِ ہند ہوئے ان کے پسر ، خواجہ ملک
دورِ بلبن تھا ، ہوئی قدر یہاں خواجہ کی
ان کو املاک عطا کی گئی پانی پت میں
نور شامل تھا مدینے کی فضا کا جس میں

وقت چلتا رہا ، چلتا رہا ، صدیاں گزریں
منتقل ہوتا رہا نور نئی نسلوں میں
اور اٹھارہ سو سینتیس میں وہ لمحہ آیا
خواجہ ایزد کے یہاں بارشِ انوار ہوئی
وہی لمحہ کہ تولد ہوئے الطاؔف حسین
فکر و فن نے نئے انداز سے انگڑائی لی
علم و عرفان کی کرن جاگ اُٹھی ہو جیسے
اِک نئی صبح کا اعلان ہوا ہو جیسے
یہی الطاف تھا اِک روز بنا جو حالی
تھا قیامت کا زمانہ جو ملا حالؔی کو
منتشر قوم کا شیرازہ تھا ، ملّت بے حال
تین سو سال حکومت کے گزر جانے پر
راکھ کا ڈھیر تھا اب شعلۂ تیموری بھی
شاعرِ قوم کے احساس کو مہمیز ہوئی
اور حالؔی نے نیا نغمہ بڑے درد کے ساتھ،
وقت کے ساز پہ چھیڑا تو فضا چونک گئی
نیا نغمہ تھا ، نئی لے تھی ، نئی تھی آواز
اِک نئے دَور کا حالؔی نے کیا تھا آغاز

یوں جھنجھوڑا سے اٹھارہ سو ستاون نے
دل کو رنجور کیا ، رُوح کو مجروح کیا
نغمہ جو دل سے اُٹھا ، بامِ فلک تک پہنچا
اس کے حصّے میں تھا تنظیمِ چمن کی کرنا

آبیاری نئے اندازِ سخن کی کرنا
شمعِ اُردو کو ہواؤں سے بچائے رکھنا
قوم کے درد کو سینے میں جگائے رکھنا
زخمِ تہذیب کی وہ بخیہ گری کرتا تھا
دیکھ کر دلی کو وہ نوحہ گری کرتا تھا

وقت کے لب پہ سدا رہتی ہے تعریف اس کی
میرے اوراق میں تو حالؔی ہے اِک حرفِ جلی

پانی پت:
مرے وجود کا اِک جزو تھا وہ دانشور
جیا وہ اسی برس ، شہر شہر وہ گھوما
کیا تھا ذوقِ تجسّس نے اس کو آوارہ
وہ ایک طائرِ شیریں مقال خوش پرواز
تلاشِ گلشنِ بے خار میں تھا سرگرداں
تمام عمر اُڑا نیلگوں فضاؤں میں
ہوئی جو شام تو لوٹ آیا آشیانے میں
مرے وجود کا حصّہ ، سما گیا مجھ میں

میں اب بھی حالؔی کے قدموں کی چاپ سنتا ہوں
گمان ہوتا ہے ایسا ، وہ اب بھی زندہ ہے
حسین قدروں کی صورت میں ہے نمود اس کی
اور اس کا سوزِ دروں ، جذبۂ خلوص و وفا
اُتر گیا ہے نئی نسل کے رگ و پے میں
وہ ایسے وقت میں اٹھا تھا بزمِ ہستی سے

بدل رہا تھا کہ جس وقت میکدے کا نظام
پیو لہو میں ملاکر ، مچا تھا یہ کہرام
نگاہِ ساقی کے تیور کچھ ایسے بدلے تھے
کہ تشنہ کاموں کو دینے لگا تھا زہر کے جام
ہوس پرستوں نے چھیڑا تھا جنگ کا وہ رباب
کہ جس کے تاروں سے چنگاریاں سی پھوٹتی تھیں
رچی پھر اہلِ جنوں نے 'نئی مہابھارت'
فلک سے دستِ قضا نے گرائے ایسے بم
دہل دہل گئی چھاتی زمینِ کہنہ کی
ہر ایک زخم بنا پھر لہو کا سرچشمہ
ازل سے جنگ وجدل سے ہے آشنائی مجھے
گزر چکی ہے جو مجھ پر، کسے نہیں معلوم
مرے حواس نے اِک بار پھر سُنی آہٹ
کہ موت رقص میں ہے، زلزلوں کی یورش ہے
میں ایک گوشہ زمیں کا ، زمیں کا لختِ جگر
ہر ایک زخم زمیں کا ہے میرے دل کا زخم
کہیں بھی قتل ہوا ، خوں مرے گلو سے بہا
کہیں بھی ظلم ہوا ، ٹیس میرے دل میں اٹھی
کہیں بھی جبر ہوا ، میں نے احتجاج کیا

مری حدود ہیں جغرافیے کی دستاویز
حصار ہے یہ تمدّن کا کتنا مصنوعی
پر اس حصار سے ہے ماورا مرا احساس
مری حدیں جنھیں اہلِ خرد نے کھینچا ہے

میں ان کو توڑ کے پھیلا، وہاں وہاں پہنچا
جہاں جہاں مری آواز بن سکے مرہم
جہاں جہاں مری قدریں جلا سکیں مشعل
ہوس کی آندھیاں چلتی رہیں لیے بارود،
بکھیرتی رہیں شعلے زمیں کے گلشن میں
اور ایسے وقت میں محسوس یہ کیا میں نے
مری حدود میں اب ہے تمام روئے زمیں،
تمام روزے زمیں، جس پہ جنگ جاری ہے
تمام روزے زمیں رزمِ گاہِ پانی پت
زمیں کا درد سمیٹا ہے میں نے پہلو میں
کہ میں ہوں صرف محبت کا، آشتی کا امیں

وقت: تو اِک شہر نہیں، ایک استعارہ ہے
برائے امن و مساوات جہدِ پیہم کا
زمین آج ہے شعلوں کا اِک گھنا جنگل
یہاں کوئی نہیں محفوظ، سب ہیں نرغے میں
حصار کھینچا ہے تخریب کے خداؤں نے
ہوس میں زر کی، لگائی ہے داؤں پر ہر چیز
خلوص، دوستی، انصاف، عزّت و ناموس
ہے آدمی کی ترقی، ترقیٔ معکوس
صدی یہ بیسویں، تہذیب کی صدی ہے مگر
اِسی صدی میں ہی تہذیب کا زوال ہوا
اسی صدی میں ہوئی ہیں ہزار ایجادات
کہ جن سے مل گئی انساں کو گم شدہ جنت
خیال سے بھی پرے ہیں وہ نعمتیں جن پر

تسلّط اور تصرّف ہے ابنِ آدم کا
مگر خرابیٔ اہلِ خرد کو کیا کہیے
ہوس میں ڈھال لیا ہے ہر اک ضرورت کو
غرض اور اپنی غرض کے حصول پر ہے نظر
یہ رسم عام ہوئی ہے تمام ملکوں میں
یہ رسم عام ہوئی ہے تمام قوموں میں
یہ رسم عام ہوئی ہے تمام طبقوں میں
میں وقت ہوں، مری آنکھوں کے سامنے ہے کل
ہوس کا جال ابھی اور بھی گھنا ہوگا
اندھیرا اتنا بڑھے گا کہ چھائیں گے بادل
فقط فلک پہ نہیں، ذہن کے اُفق پر بھی
خود اپنی عقل سے اُلجھے گا آدمی اتنا
ملے گی راہ نہ کوئی قدم اُٹھانے کو
ہوا بچے گی زمیں پر نہ سانس لینے کو
تو استعارہ ہے انساں کی جہدِ پیہم کا
ترا وجود اندھیرے میں اِک کرن کی طرح
ہے آرزو تو یہی، یہ کرن بنے سورج
مفر میں کر نہیں سکتا مگر حقیقت سے
میں آج عالمِ حیرت میں ہوں، بہ صد تخریب،
بہ صد ہجوم تباہی، بہ صد جراحتِ دل،
نہ جانے کیسے زمیں اب بھی سانس لیتی ہے
ہزار زخم بدن پر ہیں آدمیت کے
لہو میں کیسے مگر اپنے ناؤ کھیلتی ہے

○○

غزل نامہ

•

زبانِ شر زبانِ دل و نظر ہے سروش
غزل کو شعورشِ ہستی کی ترجماں کہیے

●

غزل ایک ایسی لطیف، طاقتور، حسین اور ہمہ گیر صنفِ سخن ہے جس کے احسان سے کوئی سخنور عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ اس کے ساتھ ہزاروں سال پرانی فارسی شاعری کی روایت ہے۔ سینکڑوں سال سے شعرائے اُردو اس کے گیسو سنوارنے میں مصروف ہیں اور اب تو اس صنفِ سخن نے ہندوستان کی کئی اور زبانوں سے بھی اپنا لوہا منوالیا ہے۔ غزل کے ایک شعر میں نہ جانے کتنے معانی اور فکرِ شاعر کے کتنے پہلوؤں کو اپنے اندر سمولینے کی قوت ہے۔ غزل کی اس ہمہ گیری نے اسے ایک لازوال صنفِ سخن بنادیا جو اپنے بنیادی حسن کو برقرار رکھتے ہوئے وقت کے نئے نئے سانچوں میں ڈھلنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ نام نہاد مخالفینِ غزل بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے کیونکہ ان کی نظموں کی رگوں میں بھی غزل کا خون ہے۔ اُردو کا کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جس نے ابتدا غزل گوئی سے نہ کی ہو اور جس نے الفاظ کا برتنا اور انھیں اوزانِ شعر میں ڈھالنا غزل سے نہ سیکھا ہو۔

دراصل وقت اور حالات کے تقاضے شاعر کے قلم کی سمت اور رفتار طے کرتے ہیں اور کسی شاعر کے بارے میں گل افشانی کرتے وقت تنقید کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ شاعر نے کب اور کن حالات میں اپنا تخلیقی سفر شروع کیا اور وہ کن راستوں سے گزرا۔

میری شاعری کی ابتدا بھی غزل سے ہوئی اور مئی ۱۹۳۸ء میں پہلا شعر کہا:

اگر گل دِکھاتا ہے آثارِ نکہت
تو کرتا ہے : تشدد نمایاں

اسی سال اپنے وطن نگینہ میں پہلا طرحی مشاعرہ پڑھا جس کا ایک شعر یاد ہے:

زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہے برگِ افتادہ
بڑھائی تھی کسی دن زیبِ صحنِ گلستاں میں نے

تقریباً چار سال تک میں نے قصبہ کے طرحی مشاعروں میں غزلیں پڑھیں اور پھر بجائے غزل کے نظم کہنے لگا۔ مشقِ سخن کے اس دَور کی غزلیں میرے شعری مجموعوں میں شامل نہیں ہیں۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۵ء تک دہلی میں قیام کے دوران میں نے صرف ایک غزل کہی، اور بمبئی کے تیرہ سال کے قیام کے دوران مشکل سے چار پانچ غزلیں۔ پھر ۱۹۵۸ء میں دہلی آنے کے بعد اس شہر کے روایتی مزاج اور غزل میں رچی ہوئی ادبی فضا نے مجھے آہستہ آہستہ غزل گوئی کی طرف مائل کیا اور گزشتہ پچاس سال میں کئی سو غزلیں کہیں جو اس غزل نامہ میں شامل ہیں:

رفعت سروش
۲۸/مارچ ۲۰۰۸ء

وادئ غزل

ناشر
نورنگ کتاب گھر، نئی دہلی
اشاعت:
۱۹۸۱ء

•

انتساب

صبیحہ کے نام

مندر تو بن گیا تھا مگر مورتی نہ تھی
دِل تو دھڑک رہا تھا مگر زندگی نہ تھی
جب تک بہار بن کے نہ آئی تھیں تم یہاں
گھر تھا، مگر سکون نہ تھا، دلکشی نہ تھی

رفعت سروش

رفعت سروشؔ اُردو زبان و ادب کے مقبول اور ہر دلعزیز شاعر ہیں، بنیادی طور پر نظم نگار ہیں، آزاد نظمیں بھی لکھی ہیں اور منظوم تمثیلیں بھی، بعض رومانی کرداروں کو بھی موضوع بنایا ہے اور اُن کے ذریعہ تہذیبی اور معاشرتی سچائیوں کو عوامی احساس اور جذبے سے قریب تر کیا ہے، اُن کی چند ڈرامائی نظمیں جدید نظم میں اضافہ ہیں۔

رفعت سروشؔ نے ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق کے بعض بنیادی امتیازی رجحانات کے گہرے اثرات قبول کئے ہیں، جہاں تک مجھے علم ہے وہ اِن تحریکوں کے سرگرم رکن بھی رہے ہیں۔ بلاشبہ وہ ایک بہتر سوچنے والے شاعر ہیں، اُن کے کلام میں اقدار کا بہتر احساس ملتا ہے اور تہذیبی اور تمدنی میلانات کا اچھا شعور جھلکتا ہے۔ ترقی پسند ادبی تنقید کی حلقہ بندی نے بعض دوسرے نظم نگاروں کی طرح رفعت سروشؔ کو بھی کسی حد تک نظر انداز کیا ہے یہ افسوس کی بات ہے۔ ترقی پسند تحریک کی وجہ سے غور و فکر اور بہتر سوچ کی جو نئی راہ پیدا ہوئی اُس پر بہت کم شعرا نے قدم جمائے۔ رفعت سروشؔ اس راہ پر اپنے احساسِ زمانہ اور اپنی سماجی اور معاشرتی فکر کے ساتھ بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ اُن کی غزلوں کا مجموعہ شائع ہو رہا ہے۔ غزلوں کے بعض اشعار میں اُن بنیادی خیالات کی چند کرنیں نظر آتی ہیں جو مختصر اور طویل نظموں میں زیادہ واضح اور زیادہ روشن ہیں۔ غزل کی تکنیک تو صرف چند کرنوں کی تیز اور مدھم لکیروں اور بجلیوں کی بعض لہروں کو برداشت کر سکتی ہے۔ رفعت سروشؔ کو اس بات کا بخوبی احساس ہے لہٰذا اُن کی غزلیں بنیادی نظریات اور خیالات کی نمائندگی کرتے ہوئے غزل کی نزاکتوں کو مجروح نہیں کرتیں۔

"ترقی پسند تحریک سے متاثر ہونے کے باوجود اُنھوں نے غزل کے دامن کو بچائے رکھا، تیز اور تیز تر لہجے اور نعرہ بازی سے دُور رہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ کلاسیکی شاعری — اور اُردو

شاعری کی اعلیٰ روایات سے اُن کے ذہن کا ایک رشتہ قائم ہے، علامات اور استعارات کے معاملے میں اُن کا ذہن کلاسیکیت کی طرف لپکتا ہے اور نئے تجربوں میں کلاسیکی اور روایتی علامتوں اور استعاروں سے نئی معنویت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

رفعت سروشؔ کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اپنے دور کے مختلف تیور اور اپنے عہد کی تحریکوں سے کسی نہ کسی سطح پر کوئی ذہنی رشتہ رکھتے ہیں۔ جدید اُردو شاعری کے بدلتے ہوئے رجحانات اور میلانات کی جھلکیاں کلام میں موجود ہیں۔

کہیں یہ انداز ملتا ہے:

بیانِ غم کے لیے، شرحِ آرزو کے لیے
کہاں سے لاؤں زباں، اُن سے گفتگو کے لیے
وہ پھول ہوں کہ ستارے شرر ہوں یا غنچے
ترس رہے ہیں سبھی تجھ سے گفتگو کے لیے

اُس شوخ کی محفل میں کیا عالمِ زنداں تھا
ہر سمت نگاہوں کی زنجیر نظر آئی

شبنم، شراب، شعر، شفق، صبحِ نوبہار
کیا کیا رکھے ہیں دل نے تری دلکشی کے نام

میرؔ اور غالبؔ کی روایات سے ذہنی رشتے کی پہچان فوراً ہو جاتی ہے، یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کلاسیکی روایات کو قیمتی تصور کرتا ہے۔ تغزل کی کلاسیکی چاشنی سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔

اور کہیں یہ انداز ہے:

ٹوٹا چھپر، ٹوٹے بانس   گھر کی اُکھڑی اُکھڑی سانس

اپنے گھر، اپنی دھرتی کی آس لیے بوباس لیے
جنگل جنگل گھوم رہا ہوں جنم جنم کی پیاس لیے

شب کے سناٹے میں ڈوبی ہوئی آواز ہوں میں
اس اندھیرے کے سمندر سے نکالو مجھ کو

اُس کی آنکھیں پیچھے ہیں چلتا ہے وہ اُلٹے پاؤں
نئے سفر پر نکلا تھا، جا پہنچا پُرکھوں کے گاؤں

یہ زندگی کا دشت، یہ محرومیوں کی دُھوپ
بیٹھیں کہاں کہ سایۂ دیوار بھی نہیں

یہ نئے تازہ تجربے ہیں، جدید اُردو شاعری کی نئی جہتوں سے قریب — سو یہ اشعار بھی خوبصورت ہیں اور متاثر کرتے ہیں۔ شاعر کے تخلیقی ذہن کی کئی جہتیں سامنے آجاتی ہیں۔ نفسیاتی تبدیلی کے ساتھ فنّی سلیقہ مندی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ رفعت سروش کی ذہنی تربیت کلاسیکی اور روایتی ماحول میں ہوئی ہے لہٰذا بدلتے ہوئے تیور اور نفسیاتی تبدیلی کے باوجود وہ کلاسیکی اور روایتی آہنگ سے قریب رہتے ہیں اور تغزل کے حسن کو قیمتی تصور کرتے ہیں۔

بنیادی طور پر اُن کا ذہن رُومانی ہے، عشق و محبت کے تجربے ہوں یا تنہائی کا احساس، روایتی تجربوں میں اپنے احساس اور جذبے کی تصویروں کی پہچان ہو یا شکست و ریخت کی زندگی کے المناک تجربے، وہ اپنی رُومانیت کا اظہار کسی نہ کسی طرح ضرور کرتے ہیں، ایسی رومانیت میں بڑی کشادگی ہوتی ہے۔ تخلیقی ذہن کے عمل سے یہ رومانیت زیادہ پُرکشش بن جاتی ہے۔ شاعر آزادانہ طور پر زندگی کے نقوش منتخب کرتا ہے۔ تحیّر کے احساس کے ساتھ پُراسراریت بھی رہتی ہے، منطقی اور، بعد الطبیعات تجربوں کے رنگ بھی ملتے ہیں۔ لمحاتی تجربوں کی لذت بھی ملتی ہے۔ رومانیت تو سچائیوں کو دیکھنے اور محسوس کرنے کا ایک رویّہ ہے اور یہ رویّہ اُس وقت جاذبِ نظر بن جاتا ہے جب ذات کے مرکز پر ہر شے سمٹ آتی ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ذات کے گرد تمام سچائیاں گھومنے لگتی ہیں، فنکار آزادانہ طور پر بعض سچائیوں اور حقیقتوں کو منتخب کرتا ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار اُن کے کلام کی خصوصیات اُجاگر کرتے ہیں:

کیوں میرے لب پہ آئی غمِ آگہی کی بات
گستاخیٔ خرد کی سزا ہے تمام عمر!

سمٹے تو مشتِ خاک ہے یہ آدمی کی ذات
بکھرے تو پھر یہ عرصۂ لیل و نہار کیا

یہ شور، یہ ہنگامہ، اس محشرِ دنیا میں
اِک عمر سے بہتر ہے اِک لمحۂ تنہائی

جو دیکھیے تو بگولہ ہے ریگِ آوارہ
جو سوچیے تو یہی آبروئے صحرا ہے

رہبر ملے، رفیق ملے، ہم سفر ملے
لیکن تلاش جس کی ہے وہ راہزن کہاں

اپنے دلِ تباہ کا مجھ کو نہ کچھ ملال تھا
تیرے خیال نے مگر رات رُلا رُلا دیا

اِک دل دردآشنا، ایک نگاہِ بے قرار
ایک وفا شعار کو میرے خدا یہ کیا دیا!

تجربوں میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں ہے، ایک آزاد اور کھلا ہوا ذہن ہے جو اپنے غمِ آگہی کو جانتا ہے شکست وریخت کی اس زندگی کے دُکھ اور درد کو پہچانتا ہے، کلاسیکی افکار وخیالات کی روشنی میں نئے مابعد الطبیعاتی روّیے کو اُجاگر کرتا ہے گھٹن اور معاشرے کی ناآسودگی کو اپنی ذات کے تجربوں کی حسیت عطا کرتا ہے۔ رفعت سروش کی غزلیں نئے تجربوں کی جانے کتنی جہتوں کو ایک ساتھ نمایاں کرتی ہیں۔ مجھے یقین ہے ان کا یہ مجموعہ مقبول ہوگا۔

——پروفیسر شکیل الرحمٰن
کل پتی نواس، بہار یونیورسٹی

۲۶/اپریل ۱۹۸۰ء

○

مری صبحِ درد کی دلکشی ، مری شامِ غم کی ملاحتیں
ترے ذہن سے بھی ہیں ماورا مری زندگی کی لطافتیں

اُسے وقفِ دیر وحرم نہ کہہ جو سمجھ سکے تو سمجھ اُسے
کہ ہر ایک ذرّہ دو جہاں پہ رقم ہیں اس کی حکایتیں

تری بزمِ عیش ونشاط میں یہ شکستہ جام مرے لیے!
سرِ بزم کشتۂ ناز پر یہ نوازشیں یہ عنایتیں !

نہ سمجھ سکا تو مری غزل مری لغزشوں کو معاف کر
کہ شعورِ خام پہ بار ہیں مری شاعری کی نزاکتیں

مرے دوست کیا تجھے یاد ہے کہ سروشؔ پیکرِ غم نہ تھا
تری دلکشی میں سما گئیں مری صبحِ زیست کی راحتیں

(۱۹۴۴ء)

○

بڑی آرزو ہے کوئی مری انجمن میں آئے
مرے سازِ بے صدا کا کوئی تار گنگنائے

مرے دِل کی خلوتوں میں وہ عجب ادا سے آئے
کبھی بجلیاں سی تڑپیں، کبھی پھول مسکرائے

مرے عالمِ نظر میں ابھی رقص کر رہے ہیں
ترے عارضوں کے جلوے ترے گیسوؤں کے سائے

یہ حیات کیسے گزرے بڑی کشمکش ہے اے دل!
نہ کوئی خوشی میسر، نہ الم ہی راس آئے

تری یاد میں شبِ غم بڑے لطف سے گزاری
کبھی تجھ سے گفتگو کی، کبھی شعر گنگنائے

یہ جمود میکدے میں، یہ سکوت، یہ اداسی!
وہ شرابِ تیز ساقی کہ قرار ہی نہ آئے

بڑی دُھوم ہے جہاں میں ترے شوخ زمزموں کی
کوئی نغمۂ بہاراں کہ سروشؔ مسکرائے

(۱۹۴۶ء)

○

یہ فضا جنوں پرور ، یہ اُداس تنہائی
رہ گئیں تمنائیں لے کے ایک انگڑائی
پھر کسی کی یاد آئی ، پھر کسی کی یاد آئی
یہ مرے تصور میں کسی کی زلف لہرائی
زندگی کے ہنگامے کیا ہوئے خدا جانے
اب غمِ محبت ہے اور سکونِ تنہائی
پا کے سب کو بیگانہ کچھ سنبھل چلا تھا دل
سُن کے نالۂ بلبل چوٹ پھر اُبھر آئی
تم سروشؔ کیا جانو سوزِ عاشقی کیا ہے
تم غمِ محبت کے صرف اِک تماشائی
(۱۹۴۶ء)

○

پھول اب کہاں ! لیکن ، زخم مسکرائے ہیں
پرسشِ محبت کو آج وہ بھی آئے ہیں
دِل ہے کتنا دیوانہ جی رہا ہے وعدوں پر
یہ نہیں سمجھ پاتا آپ پھر پرائے ہیں
رات ان فضاؤں میں اشکبار تھا میں بھی
تم نے جن فضاؤں میں میرے گیت گائے ہیں
جب بھی تھک کے بیٹھا ہوں زندگی کی راہوں میں
اُن کی شوخ نظروں نے حوصلے بڑھائے ہیں
آج جن اداؤں پر اِک جمود طاری ہے
ہاں اُنھیں اداؤں نے حشر بھی اُٹھائے ہیں
میری خلوتِ غم میں عمر بھر کی دولت ہے
کچھ حسین یادیں ہیں ، کچھ لطیف سائے ہیں
یہ سروشؔ ہے لیکن کیوں ہے اتنا افسردہ
اس کے شوخ نغموں نے مردہ دل جگائے ہیں
(فروری ۱۹۴۹ء)

○

تو جلالِ نغمۂ کُن ، کہ جمالِ نورِ وحدت
نہ عیاں ہوئی کسی پر تیری ذات کی حقیقت
مجھے آدمی ہے پیارا وہ کوئی ہو اور کہیں ہو
میں اسیر زلفِ مشرق نہ شکارِ مغربیت
تو ملول کیوں ہے آخر جو سسک رہے ہیں تارے
یہی کربِ آسماں ہے نئی صبح کی علامت
یہی تشنگی کا عالم ، یہی شورشیں ہیں ساقی!
تو بگڑ اٹھیں نہ میکش ، تری زندگی سلامت
تجھے فکر کیسے ٹوٹیں زروسیم کے یہ زنداں
میں سنا رہا ہوں کب سے تجھے نغمۂ بغاوت

(۱۹۴۹ء)

○

عجیب ضد ہے ، بیاباں کو گلستاں کہیے
فضا میں اُڑتے بگولوں کو آشیاں کہیے
ہر ایک شعر شرر بار و گل فشاں کہیے
غزل میں عظمتِ آدم کی داستاں کہیے
رہِ طلب میں عجب ہم سفر ملا ہے مجھے
اِک آفتاب جسے شعلۂ رواں کہیے
مرے نفس میں مچلتا ہے آرزو بن کر
وہ انقلاب جسے نغمۂ جواں کہیے
وہ جس کے فیض سے کانٹے بھی مسکراتے ہوں
اس اہتمامِ بہاراں کو جاوداں کہیے
یہی تھا صبحِ بہاراں ، یہی ہے شامِ خزاں
گلِ فسردہ کو تاریخِ گلستاں کہیے

زبانِ شعر ، زبانِ دل ونظر ہے سروشؔ
غزل کو شورشِ ہستی کی ترجمان کہیے

(۱۹۵۴ء)

○

بیانِ غم کے لیے، شرحِ آرزو کے لیے
کہاں سے لاؤں زباں ان سے گفتگو کے لیے
وہ پھول ہوں کہ ستارے، شرر ہوں یا غنچے
ترس رہے ہیں سبھی تجھ سے گفتگو کے لیے
قبائے اہلِ خرد جب بھی چاک چاک ہوئی
جنوں کے خار ہی کام آئے ہیں رفو کے لیے
بہار میں یہ نیا گل کھلا ہے اب کے برس
چمن کے پھول ترستے ہیں رنگ و بو کے لیے
یہ فصلِ گل ہے کھلاؤ فسردہ غنچوں کو
نقاب اُٹھاؤ گلستاں کی آبرو کے لیے

(نومبر ۱۹۵۸ء)

○

چھلکا رہا ہوں لذّتِ تشنہ لبی کے جام
منسوب ہے یہ رات غمِ عاشقی کے نام
اِک دل ہے اور لاکھ ارادوں کا اژدہام
اب تیرے ہاتھ لاج ہے اے سعیٔ ناتمام
گردِ سفر ہیں آج نجومِ فلک مقام
ہے کاروانِ علم و عمل کتنا تیز گام
اُس وادیٔ حسیں کو بھی ہے تیرا انتظار
جس وادیٔ خلا میں ستارے کریں خرام
شبنم، شراب، شعر، شفق، صبحِ نو بہار
کیا کیا رکھے ہیں دل نے تری دلکشی کے نام
پھر خط کے انتظار کی لوٹوں گا لذتیں
پھر نامہ لکھ رہا ہوں تری بے رُخی کے نام
اے جرأتِ نگاہ! تجھے آج کیا ہوا
اِک بنتِ ماہتاب ہے کب سے فروغِ بام
سیراب ہو چکے ہیں بہت تشنہ لب، مگر
اب تک چھلک رہا ہے غمِ زندگی کا جام
غم کو ثبات ہے نہ مسرت کو اے سروشؔ
دونوں کی دھوپ چھاؤں ہی کا زندگی ہے نام

(اگست ۱۹۶۲ء)

○

درد کی نشتر زنی ہے اور میں — اک مسلسل بے کلی ہے اور میں
زندگی کیا، موت پر قابو نہیں — اِک ہجومِ بے بسی ہے اور میں
بجھ گئے اُمید کے سارے چراغ — تیرگی ہی تیرگی ہے اور میں
اِک جہاں ہے اور وہ چشم مے فروش — اِک غمِ تشنہ لبی ہے اور میں
دشمنو! تم ہی کرو غم کا علاج
دوستوں کی بے رُخی ہے اور میں
(یکم ستمبر ۱۹۶۳ء)

○

ایسی چلی ہوائے غمِ گلشنِ دل جلا دیا
اتنے ہوئے اُداس ہم صبر و سکوں لٹا دیا
ایک اُداس شام تھی تیرے بغیر زندگی
تیرے خیال نے اُسے رشکِ سحر بنا دیا
اپنے دلِ تباہ کا مجھ کو نہ کچھ ملال تھا
تیرے خیال نے مگر رات رُلا رُلا دیا
اِک دلِ درد آشنا، ایک نگاہِ بیقرار
ایک وفا شعار کو میرے خدا یہ کیا دیا
برق کی کیا مجال تھی، میرے چمن کو تاکتی
جوشِ جنوں میں آشیاں میں نے ہی خود جلا دیا
میں وہی دل فگار ہوں، میں وہی بیقرار ہوں
میں وہی خوش نصیب ہوں تم نے جسے مٹا دیا
میرے ہی دم کے ساتھ ساتھ عشق کی آبرو گئی
مجھ کو مٹا کے آپ نے نقشِ وفا مٹا دیا
(۲۴؍ اکتوبر ۱۹۶۳ء)

○

کعبہ و دیر تو کجا، خود سے بھی بے خبر ہوں میں
چھوڑ کے رسمِ بندگی، تجھ سے قریب تر ہوں میں
قلبِ کلیمِ طور کو نور سے جس نے بھر دیا
ہاں وہی روشنی ہوں میں ہاں وہی اک نظر ہوں میں
میرے جنوں سے جل گئے عقل و خرد کے بال و پر
فتنۂ شر ہو باخبر شعلۂ سر بہ سر ہوں میں
میرا مقام بے خودی دیدۂ آگہی سے دور
اہلِ صفا کے واسطے دل سے قریب تر ہوں میں
آج غزل سرا ہوں میں بن کے نوا سروش کی
اہلِ جنوں سنو سنو! نغمہ معتبر ہوں میں

(۲۴؍اکتوبر ۱۹۶۳ء)

○

نظر اُٹھاؤ، بہاروں کی گفتگو چھیڑو
جنوں نواز ستاروں کی گفتگو چھیڑو

یہ میکدہ ہے یہاں رقصِ جام ہوتا ہے
یہاں نہ درد کے ماروں کی گفتگو چھیڑو

ابھی تو شوخیٔ طوفاں سے کھیلنا ہے مجھے
ابھی نہ مردہ کناروں کی گفتگو چھیڑو

میں تشنہ لب ہوں مجھے تشنہ لب ہی رہنا ہے
تم اپنے بادہ گساروں کی گفتگو چھیڑو

ہمیشہ ذکرِ خزاں ہے، ہمیشہ ماتمِ گل
کبھی تو ہنس کے بہاروں کی گفتگو چھیڑو

ابھی کسی کا سراپا ہے اور میری نظر
ابھی نہ چاند ستاروں کی گفتگو چھیڑو

گلوں کا ذکر بہت کر چکے ہیں اہلِ خرد
سروش سینہ فگاروں کی گفتگو چھیڑو

(۲۴؍جنوری ۱۹۶۵ء)

○

اُن کی نظروں کے تیور بدلتے رہے، اہلِ دل ہر قدم پر سنبھلتے رہے
حسن کی منزلیں رہ گئیں راہ میں، عشق کے قافلے یوں ہی چلتے رہے

زندگی کی حسینہ سنورتی رہی ، مسکراتی رہی ، رقص کرتی رہی
کس نے دیکھا مگر بزم میں رات بھر، شمع جلتی رہی، دل پگھلتے رہے

رات آنچل میں تارے سجاتی رہی ، صبح شبنم کے موتی لٹاتی رہی
وقت کے کارواں آتے جاتے رہے، ہم کھڑے راہ میں ہاتھ ملتے رہے

کیا کہیں کیا ملا حسن کی چاہ میں ، زخم کھاتے رہے پیار کی راہ میں
داغ سینے میں ہیں آبلے پاؤں میں، ہم مگر پھر بھی کانٹوں پہ چلتے رہے

کتنے طوفاں اُٹھے، کتنے گلشن جلے، آج بھی ہیں وہی حسن کی شوخیاں
لاکھ بدلے زمانے نے تیور مگر، ان کے عارض پہ گیسو مچلتے رہے

(اپریل ۱۹۶۵ء)

○

آدمیت ہے محبت میں فنا ہوجانا — اور فنا ہوکے محبت کے بقا ہوجانا
بے نیازِ غم و احساسِ فنا ہوجانا — دل کو راس آیا ہے اے دوست ترا ہوجانا
شمع کے ساتھ پگھلنا دلِ بیمار، مگر — شمع کی طرح نہ محفل سے خفا ہوجانا

بعد مدّت کے ملا تم سا جفا کیش مگر
تم بھی گھبرا کے نہ پابندِ وفا ہوجانا

(۲۰ فروری ۱۹۶۶ء)

○

نہ ذکرِ بادہ کروں اور نہ فکرِ جام کروں
کسی کی یاد میں اشکوں کا اہتمام کروں

کہوں تو کس سے کہوں دل پہ کیا گزرتی ہے
کروں تو کس سے میں تیرے سوا کلام کروں

جلاؤں پلکوں پہ اشکوں کے جھلملاتے چراغ
اندھیرے گھر میں اُجالوں کا اہتمام کروں

اُدھر ہیں دیر و حرم اس طرف ہے میخانہ
کدھر ہے منزلِ آدم کہاں قیام کروں

کسی کی یاد کے آنسو، کسی کے ذکر کے پھول
غزل تو ہوگئی منسوب کس کے نام کروں

(۲۷ر اکتوبر ۱۹۶۶ء)

○

اے زندگی میں تیرا پرستار بھی نہیں — لیکن ترے جمال سے بیزار بھی نہیں
یہ زندگی کا دشت، یہ محرومیوں کی دھوپ — بیٹھیں کہاں کہ سایۂ دیوار بھی نہیں
کیا لائے ہو! خلوصِ محبت، خلوصِ دل! — اس جنس کا تو کوئی خریدار بھی نہیں
ساقی مری خموش طبیعت کی لاج رکھ — اقرار گر نہیں ہے تو انکار بھی نہیں

اک عالمِ خیال ہے اور اُن کا غم سروشؔ
صد شکر اب یہاں کوئی غم خوار بھی نہیں

(۱۵ر فروری ۱۹۶۷ء)

○

کبھی قطرہ، کبھی میں طوفاں ہوں
اپنی حالت پہ آپ خنداں ہوں

پوچھتے ہیں وہ مجھ سے میرا نام
جیسے میں صرف ایک انساں ہوں

موت آئے گی ہوش آتے ہی
سازِ دیوانگی پہ رقصاں ہوں

بزمِ یاراں سے بھاگ آیا ہوں
دشتِ تنہائی میں غزلخواں ہوں

گیت گاتا رہا ہوں پھولوں کے
اور خود سر بہ سر بیاباں ہوں

میرا ماضی نہ میرا مستقبل
اور میں حال سے بھی نالاں ہوں

روشنی میں نہ مجھ کو لے جاؤ
اپنے سائے سے بھی گریزاں ہوں

میری ہستی ہے سر بہ سر ابہام
میں نئی شاعری کا عنوان ہوں

معنویت ہے اک اضافی چیز
ہائے کس دور میں غزل خواں ہوں

(دسمبر ۱۹۶۷ء)

○

دیباچۂ کتابِ وفا ہے تمام عمر
اِک لمحۂ شعور فنا ہے تمام عمر

محرومیوں نے ساتھ دیا ہے تمام عمر
اِک درد ہے کہ دل میں رہا ہے تمام عمر

کیوں میرے لب پہ آئی غمِ آگہی کی بات
گستاخیٔ خرد کی سزا ہے تمام عمر

یادِ خدا میں جی نہ لگا ہے یہ اور بات
خوفِ خدا تو دل میں رہا ہے تمام عمر

آ خلوتِ سروشؔ میں اے مرگِ ناگہاں
تیرا ہی انتظار کیا ہے تمام عمر

(دسمبر ۱۹۶۷ء)

○

یہ شان و شوکت و جاہ و حشم کیا غنی ہو دل تو پھر دام و درم کیا
دوکانِ مے سجائی جارہی ہے ادھر آئیں گے شیخِ محترم کیا
نہ ہنگامہ ، نہ بیتابی ، نہ ہلچل جہاں سے اُٹھ گئے اہلِ ستم کیا
ملے نقشِ قدم تو سر جھکائیں بھلا پابندیٔ دیر و حرم کیا

تمھارا نام بھی آتا نہیں یاد
کریں اب صفحۂ دل پہ رقم کیا

(۱۵ر فروری ۱۹۶۸ء)

○

کیا تھا پیش جنھیں اپنے دل کا نذرانہ
غضب ہے وہ بھی ملیں ہم سے گر حریفانہ
مثالِ شمع جلاتے رہو لہو دل کا
کبھی تو آئے گا اس انجمن میں پروانہ
ترے خیال کی منزل ہے سرحدِ ادراک
ترا وصال ہے لیکن جنوں کا افسانہ
ترے خیال میں سب منزلوں کو چھوڑ آیا
رُکا نہ کعبہ میں دیکھا نہ سوئے بت خانہ
شعور بادہ کشی ہو سروشؔ جس کو ، وہی
اُٹھائے بزمِ سخن میں غزل کا پیمانہ

(۲۸ر دسمبر ۱۹۶۸ء)

○

کلیسا نہ دیر و حرم چاہیے ہمیں تیرا نقشِ قدم چاہیے
میں انسان ہوں میری خواہش نہ پوچھ دو عالم مجھے کم سے کم چاہیے
مبارک تمھیں اپنی خوشیاں مگر مجھے اپنے حصّے کا غم چاہیے
مبارک ہوں تم کو یہ تیر و تفنگ ہمیں صرف اپنا قلم چاہیے

میں شاعر ہوں، نغموں کا خالق سروشؔ
مجھے زندگی کا بھرم چاہیے

(۱۹۶۸ء)

○

آئی مرے خوابوں کی تعبیر نظر آئی
آخر کفِ قاتل میں شمشیر نظر آئی

جب ڈالی نظر، ان کے عیبوں پہ نظر ڈالی
اپنی نہ کبھی ہم کو تقصیر نظر آئی

غنچہ جو کوئی چٹکا ہنگامِ بہاراں میں
زخمِ دلِ فطرت کی تصویر نظر آئی

اس شوخ کی محفل میں کیا عالمِ زنداں تھا
ہر سمت نگاہوں کی زنجیر نظر آئی

اس پیار بھرے خط کو آنکھوں سے لگا رفعتؔ
اس شوخ کی مدّت میں تحریر نظر آئی

(۱۷ر اگست ۱۹۶۸ء)

○

نہ کوئی دوست، نہ دشمن عجیب دنیا ہے
یہ زندگی ہے کہ تنہائیوں کا صحرا ہے
بدلتے رہتے ہیں ہر موڑ پر سفر کے رفیق
غمِ حیات مگر ساتھ ساتھ چلتا ہے
شعورِ درد، شعورِ فنا، شعورِ بقا
شعورِ حسن نے کیا کیا مجھے سکھایا ہے
دل و دماغ ہیں مصروف بحثِ ذات وصفات
جبینِ شوق مگر بیقرارِ سجدہ ہے
یہ شہرِ درد ہے لوگو! سنبھل سنبھل کے چلو
ہر ایک ذرّے میں آباد دل کی دُنیا ہے
بنائے گا یہ نیا آسمانِ فکر و نظر
غبارِ راہ جو پامال ہو کے اُٹھا ہے
جو دیکھئے تو بگولہ ہے ریگِ آوارہ
جو سوچئے تو یہی آبروئے صحرا ہے
کچھ آج رنگ ہے میلا فضا کے آنچل کا
ضرور آدمِ خاکی ادھر سے گزرا ہے
سروشؔ وادیٔ غربت سے بے خطر گزرو
تمھارے ساتھ محبت کا نرم سایہ ہے
(۱۹۶۸ء)

○

جبرِ تہذیب ہے ہندو کہ مسلماں ہونا
کتنا دُشوار ہے اس دور میں انساں ہونا
جشنِ تنہائی میں پلکوں پہ چراغاں ہونا
ہے غمِ دل کا بہ صد رنگ گل افشاں ہونا
کیسے جمعیتِ خاطر کی دُعائیں مانگوں
ان کی زلفوں سے تو سیکھا ہے پریشاں ہونا
چاہے جس سمت نکل جاؤں لیے جسمِ نزار
راس آیا ہے مجھے بے سروساماں ہونا
قلعۂ سرخ کی دیوارو! کوئی بات کرو
تم نے تو دیکھا ہے غالبؔ کا غزل خواں ہونا
(۲۲ر فروری ۱۹۶۹ء)

○

پھول شعلوں کو، بگولوں کو صبا کہتے ہیں
ہم وہ دیوانے ہیں ظلمت کو ضیا کہتے ہیں
عمر بھر ایک ہی دامن سے لپٹ کر رونا
کیا اسی جبرِ محبت کو وفا کہتے ہیں!
کل وہ عالم تھا خدا کو بھی نہ کہتے تھے خدا
اب یہ عالم ہے کہ ہر بت کو خدا کہتے ہیں
جہل کے دَور میں انساں تھے خدا کے بندے
عقل کے دَور میں بندوں کو خدا کہتے ہیں

(مارچ ۱۹۶۹ء)

○

تیرے بغیر لطف و سرورِ سخن کہاں
جس میں نہ ذکر ہو تیرا وہ فکر و فن کہاں
رہبر ملے، رفیق ملے، ہم سفر ملے
لیکن تلاش جس کی ہے وہ راہزن کہاں
بخشی ہے سوزِ غم نے مجھے لذّتِ فنا
پائے مجھے، یہ قسمتِ دار و رسن کہاں
حیرت سے تک رہی ہے مجھے میری خامشی
ان کے حضور مجھ کو مجالِ سخن کہاں
ویرانۂ قمر بھی نہیں منزلِ جنوں
لے جائے گا سروشؔ یہ دیوانہ پن کہاں

(۱۳؍جون ۱۹۶۹ء)

○

چاند ویران ہے صدیوں سے مرے دل کی طرح
زندگی گم ہے خلا میں مری منزل کی طرح

کرۂ ارض ہے اِک مرکزِ ہنگامۂ شوق
بحرِ بے آب میں تہذیب کے ساحل کی طرح

ذرّۂ خاک سے ہے شعلۂ جوہر کی نمود
جس نے سورج کو بھی دیکھا ہے مقابل کی طرح

کل کے چنگیز و ہلاکو ہیں پسِ پردۂ خاک
سرخرو تھے جو کبھی خنجرِ قاتل کی طرح

میرے قدموں کے نشاں چاند پہ رخشندہ ہیں
آپ آجایئے آوارۂ منزل کی طرح

گرہِ شام و سحر اہلِ خرد سے نہ کھلی
زندگی آج بھی ہے عقدۂ مشکل کی طرح (۱۳/اگست ۱۹۶۹ء)

○

اچھا یہ کرم ہم پہ تو صیّاد کرے ہے
پر نوچ کے اب قید سے آزاد کرے ہے

چپ چاپ پڑا رہوے ہے بیمار تمھارا
نالہ ہی کرے ہے نہ وہ فریاد کرے ہے

اے بادِ صبا! ان سے یہ کہہ دیجیو جا کر
پردیس میں اِک شخص تمھیں یاد کرے ہے

فرزانہ اجاڑے ہے بھرے شہروں کو لیکن
دیوانہ تو صحرا کو بھی آباد کرے ہے

آوے ہے ترا نام تو ہنس دیوے ہے اکثر
دیوانہ ترا یوں بھی تجھے یاد کرے ہے

نسبت ہے نگینہ سے یہ بولی ہے ہماری
کیا ناقدِ فن ہم سے تو ارشاد کرے ہے

لکھ لکھ کے مٹا دیوے ہے تو نام یہ کس کا
سچ کہیو سروشؔ آج کسے یاد کرے ہے (۲۶/نومبر ۱۹۶۹ء)

○

کیسے امیر، کس کے گدا، تاجدار کیا
دار الفنا میں جبر ہے کیا، اختیار کیا

وہ تیز دُھوپ ہے کہ پگھلنے لگے ہیں خواب
زلفوں کے سائے دیں گے فریبِ بہار کیا

آباد کر خرابۂ ذہن و خیال کو
شہروں میں ڈھونڈتا ہے سکون و قرار کیا

سمٹے تو مشتِ خاک ہے یہ آدمی کی ذات
بکھرے تو پھر یہ عرصۂ لیل و نہار کیا

میں ہوں سروشؔ بندۂ مجبور و ناتواں
مجھ میں بھی تیرا عکس ہے پروردگار کیا!

(مئی ۱۹۷۰ء)

○

گرمیٔ ہنگامہ غالبؔ گو تیری محفل میں ہے
اِک ہجومِ نامرادی پھر بھی تیرے دل میں ہے

مقبرے تاریخ کے ہیں یہ روایت کے کھنڈر
اِک نئی دُنیا بھی لیکن بطنِ مستقبل میں ہے

سوزِ محرومی سے کھلتے ہیں سرابوں کے کنول
لذّتِ بے نام سی اِک سعیٔ لاحاصل میں ہے

پھول بن کر مسکرانے کی تمنا تھی کبھی
ایک طوفانِ حوادث اب کلی کے دل میں ہے

زندگی روئی ہے صدیوں جبرِ تہذیب کے
ہائے وہ آنسو مگر جو چشمِ مستقبل میں ہے

(۱۵ فروری ۱۹۷۱ء)

○

یہ تیری طلب مجھ کو کس بزم میں لے آئی
اس بزم کا ہر ذرّہ ہے اپنا تمنّائی

اقلیمِ گلستاں میں کانٹوں کی ہے دارائی
ہے خام ابھی تیرا ذوقِ چمن آرائی

اس آئینہ خانے میں اب کون کسے دیکھے
یہ عالمِ حیرت ہے خود اپنا تماشائی

وہ کثرتِ جلوہ کا عالم ہے نگاہوں میں
میں بھولتا جاتا ہوں آدابِ جبیں سائی

یہ عالمِ امکاں ہے یا ذوقِ نمو تیرا
ہر شے میں تیرا جلوہ، ہر سو تیری رعنائی

یہ شور، یہ ہنگامہ! اس محشرِ دنیا میں
اِک عمر سے بہتر ہے اِک لمحۂ تنہائی

اقبالؔ نے بخشی ہے رفعتؔ مرے شعروں کو
اظہار کی بیباکی، احساس کی رعنائی

(۲۹/اپریل ۱۹۷۲ء)

○

اپنے گھر، اپنی دھرتی کی آس لیے، بوباس لیے
جنگل جنگل گھوم رہا ہوں جنم جنم کی پیاس لیے

جتنے موتی کنکر اور خذف تھے اپنے پاس، لیے
میں انجانے سفر پر نکلا مدھر ملن کی آس لیے

کچی گاگر پھوٹ نہ جائے، نازک شیشہ ٹوٹ نہ جائے
جیون کی پگڈنڈی پر چلتا ہوں یہ احساس لیے

وہ ننھی سی خواہش اب بھی دل کو جلائے رکھتی ہے
جس کے تیاگ کی خاطر میں نے کتنے ہی بن باس لیے

سوچ رہی ہے کیسے آشاؤں کا نشیمن بنتا ہے
من کی چڑیا تن کے دوارے بیٹھی چونچ میں گھاس لیے

جب پربت پر برف گرے گی سب پنچھی اُڑ جائیں گے
جھیل کنارے جا بیٹھیں گے اک انجانی پیاس لیے

چھوڑ کے سنگھرشوں کے جھنجھٹ توڑ کے آشا کے رشتے
گوتم برگد کے سائے میں بیٹھا ہے سنیاس لیے

(۱۹۷۳ء)

○

ہر قدم گردِ حوادث میں چھپایا ہے مجھے
گردشِ وقت نے افسانہ بنایا ہے مجھے

میں کہ اک نورِ معانی تھا، نہ صورت، نہ صدا
تم نے چہروں کی نقابوں میں چھپایا ہے مجھے

میں تو اک سوکھا ہوا پھول ہوں، پامالِ خزاں
تم نے کیا سوچ کے آنکھوں سے لگایا ہے مجھے

میرے معبود مجھے پھول بنایا تو نے
کیوں مگر سینۂ صحرا پہ کھلایا ہے مجھے

ٹوٹتے رہتے ہیں خنجر سے مرے سینے میں
یادِ ماضی نے یہ کیا روگ لگایا ہے مجھے

(۲۴ر فروری ۱۹۷۳ء)

○

یہ زندگی ہی کیا ہے اک بوجھ ڈھو رہا ہوں
کچھ کھو کے پا رہا ہوں، کچھ پا کے کھو رہا ہوں

مجھ کو جلا نہ ڈالے احساس کی تمازت
سوزِ غمِ دروں سے بیتاب ہو رہا ہوں

زرخیز کیوں نہ ہوگی بنجر زمینِ وفا کی
خونِ جگر سے سینچا اب اشک بو رہا ہوں

اے بے کنار موجو! اب تو پناہ دے دو
منجدھار میں خود اپنی کشتی ڈبو رہا ہوں

میں خواب کے جزیروں میں جاگتا تھا رفعت
اب آنکھ کھل گئی تو سمجھا کہ سو رہا ہوں

(۱۰ر نومبر ۱۹۷۳ء)

○

ایک تو یہ پاگل برسات　اُس پر ہجر کی لمبی رات
کشتی ساحل تک آئی　پھر طوفاں نے کھائی مات
ذکر خزاں کا نکلا تھا　جا پہنچی پھولوں تک بات
کیسی بہار آئی یارو!　پیڑوں پر ہیں پھول نہ پات
سب کے چہرے جھوٹے ہیں　کس سے کروں میں جی کی بات
زہر گھلا ہے دل میں، مگر　ہونٹوں پر ہے پیار کی بات

ہم تو بہت بدنام ہوئے
کر کے سروشؔ اُس شوخ سے بات

(۱۰ر نومبر ۱۹۷۳ء)

○

سکوتِ ناز میں رقصاں غبارِ نغمہ ہے　فضا میں آج عجب خلفشارِ نغمہ ہے
تری صدا ہے کہ اک بولتا ہوا جادو　تری نوا ہے کہ اِک آبشارِ نغمہ ہے
یہ چیختی ہوئی تنہائیاں ہیں آخر شب　کہ ڈوبتا ہوا دل بیقرارِ نغمہ ہے
ہر ایک سازِ نفس میں ہیں بجلیاں پنہاں　یہ بزمِ درد کہاں سازگارِ نغمہ ہے
خلا کے طشت میں یہ ٹوٹتا بکھرتا چاند　مرے خیال میں اِک جوئبارِ نغمہ ہے
یہ کیسے پھول کھلے تیرے دم قدم کے ساتھ　اُداس گھر مرا اب لالہ زارِ نغمہ ہے

ہر ایک لفظ ہے آئینۂ وجودِ حیات
سروشؔ تیری غزل اعتبارِ نغمہ ہے

(۲۲ر مارچ ۱۹۷۵ء)

○

جانے کب سے میں اس سفر میں ہوں   آج تک تیری رہ گزر میں ہوں
ایک سودائی ، ایک دیوانہ   جو بھی ہوں آپ کی نظر میں ہوں
میری پرواز ہے ابھی محدود   میں ابھی قیدِ بال و پر میں ہوں
زندگی ایک خواب بے تعبیر   میں بھی اس خواب کے نگر میں ہوں
ہوں تو ناچیز ذرّۂ خاکی   زمزمہ ریز بحروبر میں ہوں
کل بکھر جاؤں گا بہ رنگِ شمیم   آج پیراہنِ شرر میں ہوں
ناقدوں سے یہ پوچھنا ہے سروشؔ
میں بھی کیا آپ کی نظر میں ہوں

(۷/اپریل ۱۹۷۵ء)

○

توڑ بھی دے یہ رشتے ناطے سارے بندھن جھوٹے ہیں
جیون کی اس بگیا میں سب کاغذ کے گل بوٹے ہیں
اُن کانٹوں کی قدر و قیمت ہم دیوانوں سے پوچھو
جن کانٹوں پر چلتے چلتے پاؤں کے چھالے پھوٹے ہیں
حرص و ہوس کا پاگل بالک جو من میں وشرام کرے
کتنے شہر اُجاڑے اس نے ، کتنے لشکر لوٹے ہیں
جن کی نزاکت دیکھ کے شاخِ گل بھی شرما جاتی تھی
آج اُن کی یادوں سے دل میں کتنے خنجر ٹوٹے ہیں
اپنے سازِ نفس کے تارِ لرزاں کی آواز تو سن
تو سچا ، تیرا من سچا ، باقی سارے جھوٹے ہیں

(۲۲/مئی ۱۹۷۵ء)

○

یہ ثواب و عذاب کی دُنیا　　ایسی ہے جیسے خواب کی دُنیا
دل ہے یا اضطراب کی دُنیا　　خواہشِ بے حساب کی دُنیا
حسنِ کافر ادا ہے یوں، جیسے　　سر سے پا تک سراب کی دُنیا
جیسے پانی پہ ایک نقشِ جمیل　　ہائے کیا ہے شباب کی دُنیا
میری ہی خامشی سے پیدا ہے　　یہ سوال و جواب کی دُنیا
کتنی آباد ہے ترے غم سے　　دلِ خانہ خراب کی دُنیا

موت اک بحرِ بے کراں ہے سروشؔ
زندگی اک حباب کی دُنیا

(۱۱رستمبر ۱۹۷۵ء)

○

اہلِ خرد گئے ہیں نہ اہلِ خبر گئے　　ان کے حریم ناز میں ہم بے خطر گئے
دن بھر تو آفتاب کی مٹھی میں قید تھے　　دربارِ شب سجا تو یہ موتی بکھر گئے
اِک اپنے ہی وجود پہ قابو نہ پاسکے　　تسخیرِ کائنات کے دعوے کدھر گئے
اُن کے کمالِ شوق کی معراج دیکھیے　　بے بال و پر جو عرش پہ پرواز کر گئے
ہم ایسے تشنہ لب جنھیں صدیوں کی پیاس ہے　　لاکھوں فرات پاس سے ہو کر گزر گئے
آسودگانِ ساحلِ اُمید ہم بھی ہیں　　طوفاں ہمارے پاؤں کو چھو کر گزر گئے
اِک ہم کہ آگہی کے بھنور میں اسیر ہیں　　کیا لوگ تھے جو راہِ خبر سے گزر گئے
فرحتؔ، سلام اور شمیمؔ اب کہاں سروشؔ　　کن راستوں پہ جانے مرے ہم سفر گئے

وہ اے سروشؔ خانۂ دل میں مقیم تھے
ہم جن کو ڈھونڈنے کے لیے دربدر گئے

(۲ر اکتوبر ۱۹۷۵ء)

○

وقت کی زد سے بچ سکے وقت کے شہر یار کیا
وقت ہوا ہے کس کا دوست ، وقت کا اعتبار کیا

پھول اُداس ، دل اُداس ، باغ کی ہر روش اُداس
آج شکستہ ہوگیا آئینۂ بہار کیا

ایک نفس کے ساتھ ہی رونقِ زندگی گئی
دولت و عزّو جاہ کیا ، شہرت و اقتدار کیا

پیکرِ خاک ہوں مگر زیرِ قدم ہے کائنات
عالمِ سنگ وخشت کیا ، عالمِ نور و نار کیا

تو کہ حصارِ ذات میں اپنے ہی درد کا شکار
شکوہ کر اپنے آپ سے شکوۂ روزگار کیا

زندگی درد ہے مگر ، غالبؔ خستہ کے بقول
"کیجیے ہائے ہائے کیوں ، رویئے زار زار کیا"

کس کو بقا ملی سروشؔ راہِ طلب میں سب لٹے
عشق کے شہر یار کیا ، حسن کے تاجدار کیا

(۲۳ر نومبر ۱۹۷۵ء)

○

چاند اِک نقشِ پا، کہکشاں رہ گزر
ہے ادھورا مگر آ گہی کا سفر

میرا نورِ یقیں ہر طرف جلوہ گر
اور اس کے سوا سب فریبِ نظر

میری منزل نہیں ہیں یہ دیر و حرم
آ گیا ہوں ادھر راستہ بھول کر

اعتبار خودی ہی نہیں ہے تجھے
ورنہ دُنیا کی ہر چیز ہے معتبر

"کس کو راس آئی ہے شعلہ پیرہنی"
لکھ دیا کس نے یہ دامنِ طور پر

زندگی جیسے خوابوں کی زنجیر ہو
ایک دھندلکے میں کھوئے رہے عمر بھر

میرا نقشِ صدا تیرہ ماحول میں
غازۂ صبح ہے شب کے رخسار پر

(۱۱ر ستمبر ۱۹۷۷ء)

○

خموشیوں کے ہے دل میں ہلچل، سکوت میں انتشار سا ہے
ضرور گل اِک نیا کھلے گا، زمیں کا سینہ فگار سا ہے

گریز پا وقت کے اُفق سے، ہے کس نئے قافلے کی آمد
سنہری کرنوں کے ساتھ رقصاں فضاؤں میں اِک غبار سا ہے

یہ پھول مرجھا رہا ہے لیکن، چمن کی اب بھی نظر ہے اس پر
گلِ فسردہ خزاں کے دامن پہ ایک نقشِ بہار سا ہے

ردائے خاکی میں علم و حکمت کے پر لگا کر یہ کون آیا
ہراس ہے مہر و مشتری کو، خلاؤں میں انتشار سا ہے

پہاڑ سی رات کاٹنی ہے نہ جانے انجام کیا ہو اس کا
سروشؔ کچھ آج شام ہی سے دل حزیں بیقرار سا ہے

(۲۶ر اکتوبر ۱۹۷۷ء)

○

غبارِ رنگ بنے، مثلِ کارواں گزرے
ہم اہلِ شوق سرِ دوشِ کہکشاں گزرے

عطا کیا تھا جنھیں باغباں کے احساں نے
وہ چند پھول تو کانٹوں سے بھی گراں گزرے

ہماری خاک بھی اس راہ میں اُڑا دینا
اگر اِدھر سے بہاروں کا کارواں گزرے

ہمارے نقشِ قدم اور گل کھلا دیتے
ہوا یہ خوب کہ دنیا سے بے نشاں گزرے

زمیں نے رقص کیا، آسمان جھوم اُٹھا
وہ جب خیال کی وادی سے گل فشاں گزرے

وہ اور تھے جو سرِ راہِ شوق بیٹھ گئے
مثالِ شمس و قمر ہم رواں دواں گزرے

حسین یادوں کے سائے جو ہم سفر تھے سروشؔ
ہر ایک وادیٔ وحشت سے شادماں گزرے

(۲۶/اپریل ۱۹۷۸ء)

○

کہر کی چادر اُڑی، روشن ہوا منظر تمام
جگمگا اُٹھی ہمالہ کی سنہری، سبز شام

جیسے خوابوں کی حسیں شہزادیاں ہوں رقص میں
دیدنی ہے وادیوں میں ابر پاروں کا خرام

اُڑتا آتا ہے مری جانب سرور و وجد میں
اَبر لایا ہے نہ جانے کس پری وش کا پیام

بادلوں نے مضطرب ہوکر وفورِ شوق میں
برق کی لہروں سے لکھا ہے فلک پر کس کا نام

جانے کب سے وادیٔ خاموش میں رفعت سروشؔ
عظمتِ اوجِ ہمالہ سے ہے سرگرمِ کلام

(دارجلنگ ۱۷/جون ۱۹۷۸ء)

○

بجلی کا رقص دیکھ کے کالی گھٹاؤں میں
تصویر کھینچتا ہوں جنوں کی فضاؤں میں

یہ چاند کے کھنڈر ہیں، وہ مریخ و مشتری
بکھرے پڑے ہیں درد کے منظر خلاؤں میں

اس شہرِ سنگ و خشت میں کیا جی لگے مرا
گزری تمام عشرتِ رفتہ کے گاؤں میں

دے کر فریبِ عیش نہ پامال کر مجھے
میں جی رہا ہوں کب سے ترے غم کی چھاؤں میں

انفاس سے اُلجھتی ہے ہر لمحہ زندگی
کب سے پڑی ہے عمر کی زنجیر پاؤں میں

اب تیشۂ جنوں ہی برآمد کرے مجھے
صدیوں سے دفن ہوں میں خرد کی گپھاؤں میں

رشتہ ہے آندھیوں سے رقابت کا اے سروشؔ
کب سے بنا رہا ہوں نشیمن ہواؤں میں

(۲۳ر جون ۱۹۷۸ء)

○

هم عمر کے صید ہوگئے ہیں   اب بال سفید ہوگئے ہیں
افکار کریں تو کیسے پرواز   الفاظ تو قید ہوگئے ہیں
وہ برف گری ہے بے حسی کی   سب رنگ سفید ہوگئے ہیں
اس قید کی جانے کیا ہے معیاد   ہم جسم میں قید ہوگئے ہیں
هم گلشنِ آرزو میں رفعتؔ
بے دام ہی صید ہوگئے ہیں

(۲۷ر اکتوبر ۱۹۷۹ء)

○

ذہن میں لفظوں کا اک انبار ہے
منجمد لیکن لبِ ظہار ہے
جانے کس سے برسرِ پیکار ہے
ہر نفس چلتی ہوئی تلوار ہے
نفرتوں کے اس عجب ماحول میں
زندگی سے زندگی بیزار ہے
کاٹ دی تھی آپ نے جس کی زبان
آج پھر وہ مائلِ گفتار ہے
کشتیٔ دل تو سنبھلتی ہی نہیں
آج کس کے ہاتھ میں پتوار ہے
ٹوٹتے جاتے ہیں خوابوں کے محل
زندگی گرتی ہوئی دیوار ہے
آؤ رفعتؔ سوئے میخانہ چلیں
شیخ صاحب کا بہت اصرار ہے

(۱۵ر جنوری ۱۹۸۰ء)

○

جنونِ آگہی کی یادگار چھوڑ جاؤں گا
صبا کے لب پہ نغمۂ بہار چھوڑ جاؤں گا

بسا کے اُن کی یاد کی مہک سبک ہواؤں میں
فضا کے دل میں اُن کا انتظار چھوڑ جاؤں گا

کبھی تو کوئی غم گسار، سوگوار آئے گا
جلا کے شمعِ دل سرِ مزار چھوڑ جاؤں گا

رواں رہے گا کاروانِ شوق میرے بعد بھی
سجا کے نقشِ پا سے رہ گزار چھوڑ جاؤں گا

جواب نہیں تو میرے بعد آئے گی حیاتِ نو
سحر کو شب کے دل میں بیقرار چھوڑ جاؤں گا

یہ خارزار آج میرے خوں سے لالہ رنگ ہے
خزاں کے واسطے میں یہ بہار چھوڑ جاؤں گا

کہاں کہاں بجھاؤ گے مری صدا کی مشعلیں
تمام زندگی کو شعلہ بار چھوڑ جاؤں گا

کھلیں گے میرے بعد میری آرزو کے گلستاں
زمیں کے دل میں جذبۂ بہار چھوڑ جاؤں گا

میں نقطہ لفظ ہوں سروشؔ اِک یقینِ زندگی
میں حرف حرف اپنا اعتبار چھوڑ جاؤں گا

(۶ر فروری ۱۹۸۰ء)

○

دل میں رکھ لو کہ نگاہوں میں بسا لو مجھ کو
زندگی ہوں میں کس شکل میں ڈھالو مجھ کو

شب کے سناٹے میں ڈوبی ہوئی آواز ہوں میں
اس اندھیرے کے سمندر سے نکالو مجھ کو

میں تو اِک اشکِ ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں
تم اگر چاہو تو پلکوں پہ بٹھالو مجھ کو

سارا میخانہ ہی مانگے ہے مری تشنہ لبی
ایک دو جام پہ للہ نہ ٹالو مجھ کو

ذرّۂ خاک ہوں، پرواز کی حسرت ہے مگر
آندھیو تیز چلو اور اُڑا لو مجھ کو

(۱۰ر فروری ۱۹۸۰ء)

○

ٹوٹا چھپر، ٹوٹے بانس — گھر کی اکھڑی اکھڑی سانس
سوکھ گئے یادوں کے پھول — رہ گئی دل میں درد کی پھانس
بستی، جنگل ایک ہوئے — جب گھر میں آگ آئی کانس
موت کے اس سناٹے میں — مشکل ہے اب لینا سانس

موجِ نفس اب ہم تو چلے
اور کسی شہ زور کو پھانس

(یکم مارچ ۱۹۸۰ء)

○

اُس کی آنکھیں پیچھے ہیں ، چلتا ہے وہ اُلٹے پاؤں
نئے سفر پر نکلا تھا ، جا پہنچا پُرکھوں کے گاؤں
آج کہاں لے آئی ہے ، مجھ کو میرے دل کی تھکن
اس بستی میں رات نہ دن ، اس رستے میں دُھوپ نہ چھاؤں
نفس کشی کے جنگل میں پاؤں ہیں میرے لہولہان
موہ کے راج سنگھاسن پر کس نے رکھ دی میری کھڑاؤں
اس کی چاہت کی بازی کھیل انوکھا جیون کا
جیت کی فکر نہیں لیکن ، ہم بھی لگا آئے ہیں داؤں
اُس کے نام کی خوشبو سی پھیلی تھی جنگل جنگل
پگڈنڈی پگڈنڈی ہم جا پہنچے اس شوخ کے گاؤں

(۱۱ر اپریل ۱۹۸۰ء)

○

یہ کس کی عشوہ گری ہے ساقی چمن کو مقتل بنا دیا ہے
گلوں کے بدلے جوان لاشوں سے کون گلشن سجا رہا ہے
زبان ، مذہب ، عقیدہ ، ملت ، ہزار ہیں رُوپ دُشمنی کے
ہزار رنگوں میں نام قاتل نے اپنا خنجر پہ لکھ دیا ہے
سبھی ہیں معصوم ، سب کو دعویٰ ہے بے گناہی کا انجمن میں
تو کس کی مکروہ آستیں سے چمکتا خنجر ابھی گرا ہے
دُھواں دُھواں ہے فضائے گلشن ، شدید ہیں نفرتوں کے طوفاں
کوئی دِوانہ ان آندھیوں میں چراغِ اُلفت جلا رہا ہے
بنی جو تلوار شاخِ گلشن ، غزل بھی اب بن گئی ہے نوحہ
سروشؔ میرے لبوں پہ انسانیت کا پُرسوز مرثیہ ہے

(۲۴ر جنوری ۱۹۸۱ء)

○

مرے خیال کی وادی ہے نغمہ زن تجھ سے　　سجی ہوئی ہے مرے دل کی انجمن تجھ سے
تجھے بہار کہوں ، یا نگارِ صبحِ چمن　　گلوں میں رنگ، گلستاں ہیں بانکپن تجھ سے
ترے تبسمِ لب سے چٹکتے ہیں غنچے　　فضائے باغ کا رنگیں ہے پیرہن تجھ سے
سرورِ مئے ہے تری مئے گسار آنکھوں میں　　نشاط وکیف کے چشمے ہیں موجزن تجھ سے

ترے لبوں کو جو چھو جائے، جاوداں ہو جائے
مرا کلام بھی مانگے ہے بانکپن تجھ سے

(۲؍جون ۱۹۸۱ء)

○

بستی بستی سناٹا ہے ، دریا دریا تشنہ لبی
یہ معراج تمدن کی ہے ، یہ تہذیب کی بوالعجبی
عالی ہمت لوگوں نے تسخیر کیا اِک عالم کو
سر کو تھامے ہانپ رہی ہے گھر بیٹھی عالی نسبی
ہر قطرہ سے لہو کے 'قاتل قاتل' کی آتی ہے صدا
مقتل مقتل لیے پھرتی ہے مجھ کو مری ایذا طلبی
مصطفویؐ اقوال لبوں پر ، چہروں پر نورِ ایماں
دل کے کسی گوشے میں لیکن اب بھی چھپی ہے بولہبی
سارے چمکتے دن اُن کے ہیں جن کے دل تاریک بہت
ہم نے چراغِ فکر جلائے ، کم نہ ہوئی پر تیرہ شبی
شہرت ایسا تاج کہ جس کی خاطر گھر کو پھونک دیا
بے سروسامانی میں لیکن بے معنی ہے خوش لقبی
اس دُنیا کی عدالت میں کس طرح زباں کھولوں میں سروشؔ
جھوٹ سے مجھ کو نفرت اور سچ کہنا ٹھہرا بے ادبی

(یکم جولائی ۱۹۸۱ء)

○

غضب ہے کہ ایسی ہوائیں چلیں
صبا سے بہاروں کے دامن جلیں

چلیں آندھیاں نفرتوں کی ہزار
جلاتے رہو پیار کی مشعلیں

اُکھڑنے لگا دوڑ سے ان کا دم
یہ سڑکیں مرے ساتھ پیدل چلیں

سرِ راہ ہے، کوئی ٹھوکر نہ کھائے
دیا اس لحد پر جلاتے چلیں

نہیں ہے کوئی ہم سفر اے سروشؔ
سوئے میکدہ آج تنہا چلیں

(۵ر جولائی ۱۹۸۱ء)

○

سارے موسم بیت گئے، سردی، گرمی اور برسات
لیکن دل کی بگیا میں اب تک آئے پھول نہ پات

وہ تو حسنِ سراپا ہیں ان کے رُوپ کی ہے کیا بات
چہرہ جیسے صبحِ چمن، زلفیں جیسے کالی رات

ماہ وشوں کی محفل میں دل سے ڈرتا رہتا ہوں
جانے کس پر آجائے یہ ٹھہرا کافر، بد ذات

بھولی بسری یادیں آج آنکھوں میں یوں ناچتی ہیں
نیل گگن کے آنگن میں جیسے تاروں کی بارات

تم تو سروشؔ دِوانے ہو، آس لگائے بیٹھے ہو
کون یہاں اب آئے گا، بیت چکی ہے آدھی رات

(۲۱ر جولائی ۱۹۸۱ء)

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو

یہ کتاب طباعت کے مراحل سے گزر رہی تھی کہ میں اچانک بیمار ہوا عارضۂ جگر نے شدت اختیار کی اور مجھے ۲۰؍اگست کو صفدر جنگ ہسپتال کے سرجری وارڈ نمبر ۲۴ میں داخل ہونا پڑا۔ ۱۵ دن تک افاقہ کی کوئی صورت نظر نہ آئی:

''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی''

آخر ۵؍ستمبر کو ڈاکٹر گپتا بعد کوشش بسیار جگر سے پیپ کشید کرنے میں کامیاب ہوئے اور طبیعت شگفتہ ہونا شروع ہوئی۔ ۶؍ستمبر کی صبح اچانک دو غزلیں وارد ہوئیں اور پھر تو گویا بند ٹوٹ گیا۔ یہ تمام غزلیں ۶؍ سے ۱۲؍ستمبر کے دوران ہسپتال میں کہی ہیں جو میں نے بستر علالت سے اپنے بیٹے جاوید کو املا کرائیں۔ ۱۲؍ستمبر کو میں ہسپتال سے گھر آ گیا۔ آخری غزل (مناجات) ۱۵؍ستمبر کو کہی۔ یہ تمام اشعار میرے درد و کرب کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔

رفعت سروش

۱۸؍ستمبر ۱۹۸۱ء

○

کبھی میں لطف و محبت، کبھی میں جاہ و جلال
نگاہ ہو تو پرکھ میری زندگی کا جمال

ترے سوال کو سن کر میں اس لیے چپ ہوں
جواب دوں گا تو پیدا کروں گا لاکھ سوال

نہ جانے قید ہوا کب ہوس کے زنداں میں
نہ جانے کس نے بُنا میرے گرد مکر کا جال

نہ جانے کب سے کھڑا ہوں میں دل کے صحرا میں
غمِ فراق، رمِ جستجو، نہ شوقِ وصال

چہار سمت نگاہیں بچھائے بیٹھا ہوں
کوئی تو راہ ملے جو نہ ہو ابھی پامال

سروشؔ درد کے نشتر رگوں میں پنہاں ہیں
مگر لبوں پہ ہنسی! ہائے زندگی کا کمال

(۶؍ستمبر ۱۹۸۱ء)

○

قطرہ قطرہ درد رگوں سے نکلا ہے
تب جا کر جیون کا مکھڑا نکھرا ہے

شور مچا ہے بستی بستی، گلی گلی
لیکن میرے دل میں تو سنّاٹا ہے

بہتے بہتے سُوکھ گئے دل کے آنسو
اب تو ہنسنا رُونا ایک ہی جیسا ہے

کبھی کبھی محسوس یہ ہوتا ہے مجھ کو
جیسے یہ دُنیا اک پیاس کا صحرا ہے

ننھی سی اُمید کی کونپل مُسکائی
یاس کے پیڑ کا چہرہ پیلا پیلا ہے

اِک ٹھنڈک سی دل میں اُترتی جاتی ہے
آج یہ کس کی زلف کا مجھ پر سایہ ہے

آج سروشؔ نے ہلکی پھلکی باتوں میں
اپنے دِل کا حال سبھی کہہ ڈالا ہے

(۶؍ستمبر ۱۹۸۱ء)

○

جب گرفتارِ بلا تھی میری ہر موجِ نفس
ایک خلقت غم میں نالاں تھی، مگر دفتر کے لوگ!

پی لیا تھا درد نے اِک اِک لہو کی بوند کو
ساری دُنیا چشمِ حیراں تھی، مگر دفتر کے لوگ!

درسِ عبرت لے رہے تھے میرے غم سے اہلِ درد
آگہی کتنی پریشاں تھی، مگر دفتر کے لوگ!

جب کھلا رنگِ گلستاں، لوٹ کر آئی بہار
زندگی ہر سو غزل خواں تھی، مگر دفتر کے لوگ!

جب غزل کہنے لگا میرا ہر اِک تارِ نفس
زندگی شاداں و رقصاں تھی، مگر دفتر کے لوگ!

(۶؍اور ۱۰؍ستمبر ۱۹۸۱ء)

○

دیکھو! یہ بھی دُنیا ہے　دریا پیاس میں ڈوبا ہے
دن پر رات کا پہرہ ہے　سورج پیلا پیلا ہے
آج کی شب غم کا بادل　کتنا ٹوٹ کے برسا ہے
خوشیاں تو پل بھر کی ہیں　درد کا رشتہ گہرا ہے
میرا چہرہ تو ہے صاف　آئینہ ہی دُھندلا ہے
چہرہ چہرہ پھول کھلے　بوٹا بوٹا ہنستا ہے
جشن منا اے صبحِ بہار　سورج ڈوب کے اُبھرا ہے
تیرا ہر اِک شعر سروشؔ
فطرت کا آئینہ ہے

(۷ر اور ۱۲ر ستمبر ۱۹۸۱ء)

○

جب بجھی جاتی تھیں آنکھیں، اور گھلا جاتا تھا دل
یاد نے تیری لپک کر تب بھی گرمایا تھا دل
ٹوٹتی نبضوں نے لکھا تھا فسانہ درد کا
اور اس افسانے کو پڑھ کر بہت رویا تھا دل
یا چراغِ صبح کی مانند تھرانے لگا
یا کبھی اک پھول تھا، اک ساز، اک شعلہ تھا دل
مصلحت اور آگہی کا ہوچکا اب تو شکار
ہائے وہ دن جب زمانے بھر سے بیگانہ تھا دل
ذرّہ ذرّہ میں ہے میری ذات کا پرتو سروشؔ
کیا اسی دشتِ جنوں میں ٹوٹ کر بکھرا تھا دل

(۹ر ستمبر ۱۹۸۱ء)

○

زلفِ شکن شکن کا گرفتار زندہ ہے
اے نرگسِ جنوں ترا بیمار زندہ ہے

روشن ہے جس سے مشعلِ جاں، شمعِ جستجو
وہ آگہی کا شعلۂ بیدار زندہ ہے

راہِ طلب سے بچ کے چلا جو تمام عمر
وہ رہ نوردِ وادیٔ پُرخار زندہ ہے

رہ رہ کے 'آہ آہ' کی آتی ہے اک صدا
بیمارِ غم ترا پسِ دیوار زندہ ہے

اُس بزمِ ناز میں کبھی جانا تو اے صبا!
کہنا ابھی وہ یارِ طرحدار زندہ ہے

نغموں سے جس کے کھلتے ہیں مہر و وفا کے پھول
وہ عندلیبِ گلشنِ بے خار زندہ ہے

رفعت سروشؔ، شاعرِ رنگینیٔ حیات
باآب و تاب و شوخیٔ گفتار زندہ ہے

○

میں تیرے در کا بھکاری، میں تیرا دیوانہ	مگر زمانہ سمجھتا ہے مجھ کو فرزانہ
مجھے مزاج دیا تو نے بندگی کا، مگر	مجھے پلا بھی دیا آگہی کا پیمانہ
یہ لختِ لختِ جگر، یہ لہو لہو آنکھیں	ملا ہے در سے ترے کیا لطیف نذرانہ
مرے خدا! مجھے کیا کیا عطا کیا تو نے	یہ دل، یہ درد، یہ لبریز غم کا پیمانہ
یہ ہے سروشؔ، وہ ہیں فیضؔ اور وہ سردارؔ
رہے سدا یونہی آباد فن کا میخانہ	(۱۲؍ستمبر ۱۹۸۱ء)

○

مجھ پر اپنی رحمت کر	اپنا درد عنایت کر
میرے اتنا قریں ہو جا	خلوت کو بھی جلوت کر
میرے دل میں اپنا نور،	بھر دے، اتنی زحمت کر
ہم جیسے مجبوروں کی	پوری ہر اک حاجت کر
سب میں اس کا جلوہ ہے	ہر ذرّہ سے محبت کر
خود پردہ ہٹ جائے گا	دل سے اس کی عبادت کر
سامنے وہ منزل ہے سروشؔ
اور ذرا سی ہمت کر	(۱۵؍ستمبر ۱۹۸۱ء)

شاخِ گل

میں شامل غزلیں

ناشر
نورنگ کتاب گھر، نئی دہلی

اشاعت:
۱۹۹۰ء

(ترتیب ردیف وار)

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں
ایڈمن پینل
عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340123123
حسنین سیالوی : 03056406067

○

نہ راستے کی خبر ہے نہ ہوش منزل کا
گزر رہا ہے دبے پاؤں قافلہ دل کا

کرشمہ ہے یہ کسی نوبہار قاتل کا
گلی گلی جو تماشہ ہے رقصِ بسمل کا

بجھے چراغ، تہی جام، تشنہ لب میخوار
عجیب رنگ ہے ساقی یہ تیری محفل کا

دہانِ زخم کے لب پر ہے زندگی گویا
ہنر تو دیکھئے واللہ دستِ قاتل کا

بھنور کے بیچ بھی دل کا یہ حال تھا کہ سروشؔ
ہر ایک موج پہ گزرا گمان ساحل کا

○

رات میں اگلے زبانوں میں تھا
شہرِ دلی کے دِوانوں میں تھا

اس کے ہر جھوٹ کو سچ مان لیا
زور کچھ ایسا بیانوں میں تھا

بِک گیا وہ سرِ بازارِ ہوس
کل جو شہرت کی دوکانوں میں تھا

جن پہ گزری ہے قیامت کی گھڑی
میں بھی ان سوختہ جانوں میں تھا

آہن و خشت کے محلوں میں کہاں
لطف جو کچے مکانوں میں تھا

ہے سماعت میں ابھی تک محفوظ
وہ تاثر جو اذانوں میں تھا

کل تلک ایک حقیقت تھا سروشؔ
رات گزری تو فسانوں میں تھا

○

اپنی قسمت گھر کی ویرانی کا منظر دیکھنا
پھر درودیوار کو حیران و ششدر دیکھنا

پھر مرے حصّہ میں آئی لذّتِ تشنہ لبی
جنتِ نظارہ ہے مینا و ساغر دیکھنا

مدتیں گزریں یہاں سویا تھا کوئی ایک رات
آج تک مہکا ہوا ہے میرا بستر دیکھنا

آندھیوں میں دیر تک اُڑتا رہا اُڑتا رہا
ناتواں کمزور تنکے کا مقدّر دیکھنا

یہ زمیں ہے، اس کے ہر ذرّے میں پوشیدہ بہار
اس کی عظمت آسمانوں سے اُتر کر دیکھنا

سر بہ سر اک پیکرِ اخلاص ہے رفعت سروشؔ
تم کبھی اس آدمی کے ساتھ رہ کر دیکھنا

○

درد کا اپنے مداوا نکلا — وقت خود اپنے مسیحا نکلا
ہائے اُس شوخ کی برہم نظری — پھول کے پہلو میں شعلہ نکلا
ہنستے ہنستے نکل آئے آنسو — غم ہی انجام خوشی کا نکلا
یہ تو جنت ہے نہیں اس کی گلی — بے خیالی میں کہاں آ نکلا
اب کسی اور جگہ چل کے رہیں — اپنا یہ گھر بھی پرایا نکلا

تیرے اشعار کا دیوان سروشؔ
فکر و دانش کا صحیفہ نکلا

○

نئے سفر کا ہے آغاز ہر نفس میرا
نئے خیال کی پرواز ہر نفس میرا

میں سن رہا ہوں زمانے کی دھڑکنیں کب سے
گزرتے وقت کا ہمراز ہر نفس میرا

میں اپنی روح سے سرگوشیاں کروں ہر دم
مرے خیال کی آواز ہر نفس میرا

سروشؔ نغمہ سرا ہوں خموش صحرا میں
ہے میرے نطق کا اعجاز ہر نفس میرا

○

لطافت ہی لطافت تم سے ملنا
محبت کی شریعت تم سے ملنا
یہ دنیا ہے بھلایاں کون کس کا
مگر ہے ایک نعمت تم سے ملنا
تمھیں دیکھوں تو کچھ ایسا لگے ہے
نگاہوں کی عبادت تم سے ملنا
کبھی تنہائیاں تھیں اور میں تھا
مگر اب میری عادت تم سے ملنا
غموں کی آندھیوں میں شورشوں میں
مسرت ہی مسرت تم سے ملنا
ہزاروں خواہشیں پوری ہوئی ہیں
مگر بس ایک حسرت تم سے ملنا
نہ جانے تم کہاں رہتے ہو ہر دم
بڑا مشکل ہے رفعتؔ تم سے ملنا

○

رفیقِ جاں سمجھنا، غم گسار و چارہ گر کہنا
مری عادت ہے مخلص دوستوں کو ہم سفر کہنا

وہ رخصت ہو چکا جس کے لیے محفل سجائی تھی
اب اس کی یاد میں اشعار کہنا، عمر بھر کہنا

نہ شکوے ہیں، نہ جھلاہٹ، نہ دلداری نہ غم خواری
بڑا مشکل ہے ان خاموش دیواروں کو گھر کہنا

ٹھہر جائیں جو پلکوں پر وہ آنسو قطرۂ شبنم
گریں جوان کے دامن پر ان اشکوں کو گہر کہنا

دروغِ مصلحت آمیز ہے جی کا زیاں رفعتؔ
یہاں جو بات سچ ہے وہ فرازِ دار پر کہنا

○

حبابِ دل سرِ آبِ رواں کیا — ہماری زندگی کیا داستاں کیا
فقط دو چار تنکے شاخِ گل پر — گلستاں میں ہمارا آشیاں کیا
وہ ہم سے پوچھتے تھے حال دل کا — بیاں کرتے مگر ہم بے زباں کیا
ہوا کی طرح آوارہ ہیں ہم لوگ — فقیروں کا بھلا نام و نشاں کیا
سروشؔ عصر جس میں نغمہ زن ہو
مٹا سکتا ہے کوئی وہ زباں کیا

○

یہ مظلوم زمیں یارب — آخر کب کھولے گی لب
وہ دن کب آئے گا جب — ہوگا سب کا اک مذہب
گلشن گلشن پھول کھلیں — ایسا بھی اِک موسم اب
موت مجھے منظور نہیں — ہے یہ بھی جینے کا سبب
دنیا کو تو دیکھ لیا — میری شکل دکھا یارب
ان کی جدائی جی کا زیاں — اور ان سے ملنا بھی غضب

یاد کیا ہے کس نے سروش
دل میں اِک ہلچل ہے عجب

○

شعلۂ سازِ نفس رقصِ شرر کی صورت
زندگی گرمِ نوا پھر بھی بشر کی صورت
پے بہ پے اُٹھتے بگولے ہیں مرے ہمراہی
اس بیاباں میں عجب ہے یہ سفر کی صورت
آئینہ خانے میں یادوں کے دیے روشن ہیں
اب بھی آباد ہے دل رُوپ نگر کی صورت
خشک ٹہنی پہ کسی پیڑ کی اِک بلبلِ زار
ایسا رویا، مجھے یاد آ گئی گھر کی صورت
کس حسیں یاد کی آغوش نے پالا ہے اسے
اشک پلکوں پہ چمکتا ہے گہر کی صورت
بجھ گئے شمس و قمر، خواب ہوئے شام و سحر
زندگی بیٹھ بھی جا گردِ سفر کی صورت
کوئی منظر نہیں بجھتی ہوئی آنکھوں میں سروش
جھلملاتی ہے فقط شمعِ سحر کی صورت

○

سر رکھ دے میرے شانے پر تنہائی مجھ سے باتیں کر
جو ہاتھ میں آ جائے، گوہر اور باقی سب کنکر پتھر
دو پھول کھلے تھے، مرجھائے ویران ہے پھر سارا منظر
جو اپنے تھے بیگانے ہیں میں آ پہنچا کس منزل پر
دُنیا کب کی کنگال ہوئی عنقا اخلاص کے لعل و گہر
سچ بولنا میری عادت ہے اِک دن چڑھنا ہے سولی پر
کیا اس کا مول سروشؔ میاں
تم بیچ رہے ہو جنسِ ہنر

○

اُکھڑی اُکھڑی سانسوں کی تیز ہوگئی رفتار
جان لے کے جائے گا اے سروشؔ یہ آزار
آدمی کی جنت پر شیطنت نے کی یلغار
اور بند کمروں میں پڑھ رہے ہیں ہم اخبار
اے مسافرو! بڑھ کر ڈھونڈتی ہے خود منزل
سو گیا ہے رستے میں اپنا قافلہ سالار
چھوڑیے سیاست کو یہ دلوں کے رشتے ہیں
ٹوٹ ہی نہیں سکتے لاکھ کھینچیے دیوار
اس عجیب عالم کا کوئی نام تو ہوگا
ہم تری تمنا میں تجھ سے ہوگئے بیزار
گھر سے جب نکلتا ہوں اکثر ایسا لگتا ہے
میرا ہم سفر جیسے چھپ گیا پسِ دیوار
اے سروشؔ غربت میں حال ہے عجب اپنا
روح تو ہے آسودہ دل مگر بہت بیمار

○

پیڑ ، پودے چاند ، تارے سب اُداس
کس کا ہے شہکار یہ تصویرِ یاس
لو تصور کا سہارا بھی گیا
ہر حقیقت ہوگئی ہے بے لباس
ہم تو میخانہ سمجھ کر آئے تھے
ایک دو پیالوں سے کیا بجھتی ہے پیاس
دوستی ، اخلاص ، اِک حرفِ وفا
اور کیا رکھا ہے بھائی اپنے پاس
اب بھی اس کو یاد کرلیتا ہے دل
اب بھی ہے اس شوخ سے ملنے کی آس

○

آرہی ہے صدائے جرس — ساتھیوں توڑ ڈالو قفس
کل جو سچ تھا وہ اب جھوٹ ہے — مان لینے میں کیا پیش وپس
میں کہ ہوں وقت ، موسم نہیں — لوٹ آؤں جو اگلے برس
ہر طرف خواہشوں کا ہجوم — زندگی ایک شہرِ ہوس
تتلیاں رقص کرنے لگیں — چوس کر شوخ پھولوں کا رس
آسماں کو خبر ہو نہ جائے — فصل اچھی ہے اب کے برس
جسم کی کیا حقیقت سروشؔ
طائرِ روح و جاں کا قفس

○

ہچکیاں آئیں اچانک تو ہوا یہ احساس
زندہ روح سے ہے، جسم تو ہے ایک لباس
زندگی رہنا ہے مگر تجھ سے الگ، تیرے بغیر
ہے یہ بن باس، مگر کتنے دنوں کا بن باس!!
لب پہ آسودگیٔ روح کے نغمے ہیں، مگر
بس چکی ہے مری آنکھوں میں تری دید کی پیاس
پھر کوئی پھول کھلا، یاد یہ کس کی آئی
کون آیا ہے یہ پہنے ہوئے خوشبو کا لباس
اے سروشؔ آؤ، مگر نذر کروں کیا تم کو
ایک پھیکا سا تبسم بھی نہیں میرے پاس

○

آسماں پر شفق   زندگی کی رمق
بے معانی، مگر   لفظ کتنے ادق
کس کو آواز دوں   شہر ہیں لق و دق
سب کی ہے یہ زمیں   سب کو جینے کا حق
آپ کی نذر ہے   دل کا سادہ ورق
موت سے سیکھیے   زندگی کا سبق
یہ نوائے سروشؔ
جیسے اعلانِ حق

○

نہ کوئی جادہ، نہ منزل، نہ کوئی جائے قیام
یہ زندگی کا سفر ہے نہ جانے کب ہو تمام
وہ دوپہر کہ قیامت کی دُھوپ شرمائے
مرے وجود کے صحرا میں کوئی صبح نہ شام
تراشتے ہیں نئے فلسفے خرد والے
ازل سے اہلِ جنوں کا ہے ایک ہی پیغام
ہزار جال بچھاؤ جہانِ معنی میں
مگر نہ آئے گا شاہینِ وقت زیرِ دام
یہ آسماں بھی تری گردشِ نفس کا اسیر
تو آدمی ہے فراموش کر نہ اپنا مقام
بس ایک جہدِ مسلسل ہے زندگی اے دوست
کہ ہم رکاب ہے صدیوں سے گردشِ ایام
سروشؔ کعبۂ عرفاں ہے سامنے تیرے
ہوس کا جامہ اتار اور باندھ لے احرام

○

منزل پہ کھڑا یہ سوچتا ہوں
پھر راہ سے میں بھٹک گیا ہوں
خود آیا ہے وقت میرے پیچھے
میں وقت کے ساتھ کب چلا ہوں
تشکیک مزاج بن گئی ہے
میں اپنا ثبوت چاہتا ہوں
ہر لمحہ زیاں ہے زندگی کا
میں خوش ہوں کہ سانس لے رہا ہوں
ہر برگِ شجر پہ، ہر ورق پر
کب سے ترا نام لکھ رہا ہوں
الفاظ بھی سرگراں ہیں مجھ سے
میں نغمہ طراز بے صدا ہوں
پہچان مری ہے بے ثباتی
میں آبِ رواں پہ نقشِ پا ہوں

○

پھر فکرِ سخن جو کر رہا ہوں
افلاک سے میں گزر رہا ہوں
لفظوں کے کھلا رہا ہوں غنچے
ظلمت میں ستارے بھر رہا ہوں
یہ شمس و قمر ہیں دیکھے بھالے
ان سب کا میں ہم سفر رہا ہوں
مٹّی سے جنم جنم کا رشتہ
دھرتی کا سنگھار کر رہا ہوں
جنت مرے فکر کی ہے معراج
دوزخ سے تو میں گزر رہا ہوں
دنیا کے قصیدے میں نے لکھے
بس اپنا ہی نوحہ گر رہا ہوں
سب کی ہے خبر سروشؔ، لیکن
میں خود سے ہی بے خبر رہا ہوں

○

گزاری زندگی ہم نے محبت کے قرینوں میں
گنوائی گل عذاروں میں، لٹائی مہ جبینوں میں
سلامت تیرا میخانہ مگر اے ساقیٔ محفل
ذرا یہ دیکھنا کیا شے ہے تیرے آبگینوں میں
نہ چھیڑو تم انھیں یہ سانپ ہیں آفت کے پرکالے
انھیں پالا گیا ناز و نعم سے آستینوں میں
یہ مانا تم وفا پیشہ ہو، تم ہو خلق کے پیکر
مگر پھر کس لیے خنجر تمھاری آستینوں میں
سروشؔ اس دور میں ہم سرکشوں کا دم غنیمت ہے
کہ ہم ہیں خاتمِ تہذیبِ حاضر کے نگینوں میں

○

رات کہتی ہے کہ جی بھر کر پئیں
پھر کہاں یہ رونقیں یہ محفلیں
اِک نہ اِک دن تو بچھڑنا ہے ہمیں
زندگی کے موڑ تک مل کر چلیں
گاؤں کی گلیو مجھے آواز دو
کھو گیا ہوں شہر کی اس بھیڑ میں
انقلاباتِ جہاں دیوانہ وار
لے رہے ہیں کروٹوں پر کروٹیں
کل نہ تم باقی رہوں گے اور نہ میں
آؤ اپنے دور کا ماتم کریں
کون سنتا ہے مری آواز کو
وقت کے بازی گروں کے شور میں
لفظ کو کب تک اُدھیڑے جاؤں میں
اور کتنی ہیں معانی کی تہیں
زندگی کا سوز ہے میری غزل
درد ہے سب کا مری آواز میں
زندگی سوئی ہے تھک کر اے سروشؔ
اس کے دروازے پہ اب دستک نہ دیں

○

نہ پھول ہوں، نہ ستارہ ہوں اور نہ شعلہ ہوں
گہر ہوں درد کا پلکوں میں چھپ کے رہتا ہوں
وہ ایک بچہ ہے حسرت سے دیکھتا ہے مجھے
میں اس کے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا کھلونا ہوں
یہ سوچ کر کہ بچھڑنا ہے ایک دن خود سے
میں اپنے آپ سے پہروں لپٹ کے رویا ہوں
عجیب شخص مری زندگی میں آیا تھا
نہ یاد رکھوں اسے اور نہ بھول سکتا ہوں
لرز رہی ہیں مری انگلیاں قلم تھامے
نہ جانے آج میں کیا بات لکھنے والا ہوں
مجھے پکار کہ میں ڈوب ہی نہ جاؤں کہیں
میں بیقرار سمندر میں اِک جزیرہ ہوں
گزر چکے ہیں بہت کارواں ادھر سے سروشؔ
مگر میں اپنی ہی گردِ سفر سے لپٹا ہوں

○

شبیہہِ برق لکھوں شعلہ و شراب لکھوں
پھر آج خط میں اسے پیکرِ شباب لکھوں

نہ آفتاب لکھوں اور نہ ماہتاب لکھوں
اسے بہار کے موسم کا انتخاب لکھوں

تو اپنے دفترِ رحمت پہ ناز کرتا ہے
کہے تو اپنے گناہوں کا میں حساب لکھوں!

مرا یہ خواب ستاروں پہ ہو مرا مسکن
مگر زمین کی جنت کو کس کا خواب لکھوں!

جلے جلے ہوئے چہرے دھنسی دھنسی آنکھیں
یہ زندگی ہے تو ہر سانس کو عذاب لکھوں

جگہ جگہ یہ عبارت مٹی مٹی سی ہے
میں کیسے نامۂ اعمال کا جواب لکھوں

سروشؔ ذہن میں ہے اک ہجوم لفظوں کا
سکونِ دل کے لیے درد کی کتاب لکھوں

○

وہ رت جگے، وہ جشن، وہ رنگینیاں کہاں
ہوں بھی اگر سروشؔ، دلِ نوجواں کہاں

ہمدم کہاں، رفیق کہاں، ہم زباں کہاں
اس شہرِ بے ہنر میں کوئی قدرداں کہاں

دیر و حرم، کلیسا، پری خانہ، میکدہ
دو دن کی زندگی ہے میں جاؤں کہاں کہاں

خیمے اکھڑ چکے ہیں مسافر بھی چل پڑے
اب دیکھیے ٹھہرتا ہے یہ کارواں کہاں

یہ زندگی کا دشت ہے چلنا ہے یاں مدام
اس دشتِ بے اماں میں بھلا سائباں کہاں

اب اس کے بعد ہے کوئی منزل نہ راستہ
لے آئی آج تو مجھے عمرِ رواں کہاں!

بادِ صبا! خبر ہے تجھے کچھ سروشؔ کی
ہے نغمہ زن وہ طوطیٔ شیریں بیاں کہاں

○

ترے خیال کی لکھی ہیں کتنی تفسیریں
ترے جمال کا پرتو ہیں میری تحریریں

بس ایک جرم کیا تھا کہ اس کو چاہا تھا
قدم قدم پہ مرے واسطے ہیں تعزیریں

خلوص ، دوستی ، نام نمود ، مہر و وفا
لپٹ گئی ہیں مرے پاؤں سے یہ زنجیریں

یہ فصلِ گل ہے ، مگر خیر ہو گلستاں کی
ہر ایک شاخ نے کھینچی ہیں آج شمشیریں

میں اپنے آپ سے لڑتا رہا ہوں ساری عمر
بنا بنا کے بگاڑی ہیں کتنی تصویریں

وہ کوئی اور تھا جس نے کیا تھا قتل مجھے
کہ اس کے ہاتھ میں تھیں دوستی کی شمشیریں

درختِ عمر کا ہر لمحہ کٹ رہا ہے سروشؔ
کہ چل رہی ہیں مسلسل نفس کی شمشیریں

○

اب مرے پاس ترے خط ، نہ تری تصویریں
اجنبی لگتی ہیں ماضی کی سبھی تحریریں

ذہن میں اب کوئی چہرہ ، نہ کسی زلف کے خم
ٹوٹتی جاتی ہیں یادوں کی سبھی زنجیریں

ظلمتِ شب کے سمندر سے نکل آئے ہم
ساحلِ نور پہ رقصاں ہیں نئی تنویریں

خواب تو خواب ہیں آنکھوں میں بسے ہیں اب تک
لے گیا وقت مگر ساتھ حسیں تعبیریں

ان غلاموں کو نہ دو رقص کو مہلت ورنہ
توڑ ڈالیں نہ کہیں پاؤں کی سب زنجیریں

○

(نذرِ عزیز لکھنوی)

یوں تو کرتا ہے ہر بشر باتیں　　میرے دل کی ہیں نغمہ گر باتیں
کبھی پلکیں زبان بنتی ہیں　　کبھی کرتے ہیں اشکِ تر باتیں
لے کے خط کچھ نہ کچھ کہا ہوگا　　کچھ سُنا ان کی نامہ بر باتیں
یہ خموشی تو جان لیوا ہے　　کچھ تو کر میرے ہم سفر باتیں
سرِ محفل مجھے ملا نہ کرو　　لوگ کہتے ہیں دیکھ کر باتیں
اہلِ دانش عمل کے دیوانے　　اور بناتے ہیں بے ہُنر باتیں

دل کی دل میں رہے، غلط ہے سروش
مصلحت چھوڑ خوب کر باتیں

○

جو راستہ روکے ہوئے دنیا کا کھڑے ہیں
کام ان کے بہت چھوٹے مگر نام بڑے ہیں
یہ لوگ جواب موت کی سرحد پہ کھڑے ہیں
طوفان سے کھیلے ہیں تلاطم سے لڑے ہیں
ہم عمر کی منزل پہ یہاں تک تو چلے آئے
باقی جو بچے ہیں ابھی وہ کوس کڑے ہیں
کیا پوچھو ہو ہم کون ہیں کس دیس کے باسی
یوں سمجھو مسافر ہیں، سرائے میں پڑے ہیں
وہ پھول ہیں تہذیبِ محبت کی امانت
مسلے ہوئے جو حسن کے بستر پہ پڑے ہیں

○

اس زمینِ کہنہ پر تازہ جہاں پیدا کریں
خاک کے ذرّوں سے روحِ کہکشاں پیدا کریں
دُھوپ ہے مکر و ریا کی ہر طرف پھیلی ہوئی
مہر و اخلاص و وفا کا سائباں پیدا کریں
پھونک دیں بغض و تعصب کے جو سارے آشیاں
اپنے نغموں میں ہم ایسی بجلیاں پیدا کریں
بھولے بھٹکے قافلے کو سوئے منزل لے چلے
کس طرح آخر وہ میرِ کارواں پیدا کریں
خاکِ دل شامل کریں اس کی نئی تعمیر میں
آؤ ہم پھر اِک نیا ہندوستان پیدا کریں

○

(نذرِ غالبؔ)

پھر بہار آئی ہوائیں گل بداماں ہوگئیں
باغِ ہستی کی فضائیں نور ساماں ہوگئیں
رونقِ جمعیتِ گل ہے گلستاں کا وقار
رنگ اور خوشبو کی موجیں پھر پرافشاں ہوگئیں
اتصالِ کوثر و گنگا ہے وہ آبِ حیات
جس کو پی کر جاوداں اقوامِ انساں ہوگئیں
نسل اور مذہب کے غنچے، کتنی تہذیبوں کے پھول
مل کے سب کی نکہتیں روحِ دبستاں ہوگئیں
کتنا رنگیں ہوگیا تہذیب کا سادہ ورق
وید و گیتا محرمِ انجیل و قرآں ہوگئیں

ہم نے جو نظمیں لکھی تھیں چشتی و گوتم کے نام
اتحاد و دامنِ عالم کا وہ عنواں ہوگئیں

○

(نذرِ جگر مرادآبادی)

منظر یہ عجب شام و سحر دیکھ رہا ہوں
خونِ شفق علم و ہنر دیکھ رہا ہوں

ہر شہر پہ مقتل کا گماں ہوتا ہے مجھ کو
ہر ہاتھ میں شمشیر و تبر دیکھ رہا ہوں

ہے آج سوا نیزے پہ خورشیدِ قیامت
پگھلے ہوئے انسانوں کے سر دیکھ رہا ہوں

خود بھائی سے ہے بھائی یہاں دست و گریباں
اربابِ سیاست کا ہنر دیکھ رہا ہوں

ہو کس کا یقین، کون ہے اخلاص کا پیکر
ہر پھول کے پہلو میں شرر دیکھ رہا ہوں

غیروں نے لگائے تھے تعصب کے جو پودے
ان پودوں پہ نفرت کے ثمر دیکھ رہا ہوں

حرمت ہے نہ مسجد کی نہ مندر کی ہے توقیر
اُجڑے ہوئے اللہ کے گھر دیکھ رہا ہوں

○

جتنے نغمے باقی ہیں اور جتنی آہیں باقی ہیں
نام تمھارے لکھ دیں میں نے جتنی سانسیں باقی ہیں

دل میں تمناؤں کا میلہ اُجڑے دیر ہوئی لیکن
آنکھوں میں غم کے موسم، پاگل برساتیں باقی ہیں

اُجلا اُجلا دن نکلا تھا ہنستے ہنستے بیت گیا
تیرے میرے غم سہنے کو کالی راتیں باقی ہیں

اپنا گھر، ماحول، اندھیری گلیاں شہرِ تمنا کی
سب کچھ پیچھے چھوڑ آیا ہوں لیکن یادیں باقی ہیں

رات ملن کی پلک جھپکتے بیت گئی جانے کیسے
تم سے جو کہنی تھیں رفعتؔ کتنی باتیں باقی ہیں

○

ترے حصار میں ہے زندگی کا ہر لمحہ
ترے خیال میں گم آگہی کا ہر لمحہ
بہت لطیف ہے مانا سرورِ بادہ کشی
لطیف تر ہے مگر تشنگی کا ہر لمحہ
ابھی ہے وقت کہ ہم دشمنی سے باز آئیں
ابھی تو ذہن میں ہے دوستی کا ہر لمحہ
میں ہنس رہا تھا اچانک چھلک پڑے آنسو
فریب دیتا ہو جیسے خوشی کا ہر لمحہ
سروشؔ سانس کو روکے ہوئے ہوں سینے میں
کہ انتظار ہے مجھ کو کسی کا ہر لمحہ

○

کیسے کہوں کہ اب کوئی حاجت نہیں رہی
دستِ طلب بڑھانے کی عادت نہیں رہی
میں جی رہا ہوں جیسے کسی اور جسم میں
اب اپنے ہی وجود سے نسبت نہیں رہی
جن کے بغیر ایک بھی لمحہ عذاب تھا
اب ان کو یاد کرنے کی جرأت نہیں رہی
اتنا دیا ہے مجھ کو ترے غم کے رُوپ میں
اب زندگی سے کوئی شکایت نہیں رہی
یہ سانحہ بھی مجھ پہ گزرنا تھا اے سروشؔ
زندہ ہوں اور جینے کی ہمّت نہیں رہی

○

موت سینے سے لگائے چل رہا ہے آدمی
آگ میں حرص و ہوس کی جل رہا ہے آدمی
اہلِ دلت ! اہلِ دولت سیم و زر کے دیوتا
اور ان کی ٹھوکروں میں پل رہا ہے آدمی
اِک چھلاوا بن گیا تھا خواہشوں کے شہر میں
رفتہ رفتہ بن کے سایہ ڈھل رہا ہے آدمی
اب کوئی آدرش ہے اس کا نہ باقی ہیں اصول
آج اپنی آتما کو چھل رہا ہے آدمی
مشعلیں تہذیب کی صدیوں پرانی ہیں سروشؔ
اب بھی ان کی روشنی میں چل رہا ہے آدمی

○

جرأتِ اہلِ خرد کی ترجماں بنتی گئی
زندگی فکر و عمل کی داستاں بنتی گئی
فلسفوں نے جب بجھا ڈالے عقیدت کے چراغ
ہر حقیقت حسن کی وہم و گماں بنتی گئی
وقت نے دُھندلا دیے تہذیب کے کتنے نقوش
عظمتِ تاریخ جنسِ رائیگاں بنتی گئی
عشق کے ایوان میں گونجی انا الحق کی صدا
کعبۂ دل میں محبت کی اذاں بنتی گئی
اوّل اوّل اضطرابِ زندگی تھی ان کو یاد
آخر آخر وہ قرارِ جسم و جاں بنتی گئی
وہ فغانِ درد جس کو روک رکھا تھا سروشؔ
دل سے جب نکلی تو شعلوں کی زباں بنتی گئی

○

داستاں پیاس کی، ٹوٹے ہوئے پیمانوں کی
زندگی کا ہے کو ہے، یاد ہے میخانوں کی

بجھ گئی شمع، نہ محفل ہے نہ جانِ محفل
خاک باقی ہے مگر پیار کے پروانوں کی

ہوش پھر آ گیا شاید ترے دیوانے کو
دھجیاں جوڑ رہا ہے وہ گریبانوں کی

میرے افسانے سے ملتا نہیں کوئی عنواں
سرخیاں دیکھ رہا ہوں نئے افسانوں کی

چاند اترا ہوا ہے سمندر میں نہانے کے لیے
آج کی رات تو موج آ گئی طوفانوں کی

دھوپ کا سونا بکھرنے لگا جنگل جنگل
کھڑکیاں بند پڑی ہیں ابھی ایوانوں کی

آدمی جیسے یہاں کاٹھ کی تصویریں ہیں
اب یہ دنیا ہے شہنشاہوں کی سلطانوں کی

ان پہ اخلاص و عقیدت سے ہی رکھیے گا قدم
سیڑھیاں کعبہ کی ہوں یا ہوں صنم خانوں کی

دل پہ اک نام محبت کا ہی لکھا ہے سروشؔ
ہندوؤں کی یہ عمارت نہ مسلمانوں کی

○

گلی گلی مری وحشت لیے پھرے ہے مجھے
کہ سنگِ خشت کی لذت لیے پھرے ہے مجھے

نہ کوئی منزلِ مقصود ہے نہ راہِ طلب
بھٹکتے رہنے کی عادت لیے پھرے ہے مجھے

نہ مال و زر کی تمنا، نہ زندگی کی ہوس
نہ جانے کونسی قوت لیے پھرے ہے مجھے

حرم سے دیر تلک، دیر سے حرم کی طرف
نہ جانے کس کی عقیدت لیے پھرے ہے مجھے

یہ مفسدوں کا جہاں، یہ تضاد کی دُنیا
بس ایک حرفِ محبت لیے پھرے ہے مجھے

مجھے کیا مری فکرِ رسا نے آوارہ
کہ دربدر مری شہرت لیے پھرے ہے مجھے

جو بس چلے نہ اُٹھوں تیرے آستانے سے
یہ سر پھرا جو ہے رفعتؔ، لیے پھرے ہے مجھے

○

لفظوں کے یہ تانے بانے، جال لکیروں کے
دھندلے دھندلے خاکے ہیں میری تصویروں کے

کیا ان کی پہچان میاں جو بھریں سدا بہروپ
چال امیروں جیسی لیکن بھیس فقیروں کے

شہرت کی دنیا کے لوگو تم کو کیا جانیں
ہم تو رہنے والے ہیں بے نام جزیروں کے

جن کی خاطر جان سے گزرا، لغزش کی ہر گام
کھول رہے ہیں دفتر وہ میری تقصیروں کے

کاٹ کے میری زباں، مجھ کو مصلوب کیا رفعتؔ
گونج رہے ہیں پر نغمے میری زنجیروں کے

○

آنکھ کو ساغر، پھول لبوں کو، دل کو دریا لکھے ہے
تیرا شاعر اپنی دھن میں جانے کیا کیا لکھا ہے

شاید اس کا مطلب ہوگا، ساری عمر کی محرومی
لکھنے والا میرے حق میں تیری تمنّا لکھے ہے

بس اک لہر سمندر کی پل بھر میں بہالے جائے گی
گیلی ریت پہ ساحل کی تو نام یہ کس کا لکھے ہے

اس نے سچائی کی خاطر جان گنوادی تھی اپنی
بس تب سے یہ ساری دُنیا اس کو دِوانہ لکھے ہے

ہر گھر میں سنّاٹا ہے تم کس سے ملنے آئے ہوا
اس بستی کا ذرّہ ذرّہ اپنا نوحہ لکھے ہے

لکھتے لکھتے کھوجاوے ہے جانے کونسی دنیا میں
نام نہیں، القاب نہیں، ہر خط وہ ادھورا لکھے ہے

آج سروشؔ قلم سے تیرے آنسو چھلکے پڑتے ہیں
سچ کہیو تو چپکے چپکے حال یہ کس کا لکھے ہے

○

کلی کلی آشاؤں کی بگیا کی کھلتی جائے
من کی منڈیر پہ بیٹھا پنچھی کیا جانے کیا گائے
یادوں کی پروائی جانے کس کو لے آئی ہے
اک سایہ سا ٹھہر ٹھہر کر نظروں میں لہرائے
لکھتے لکھتے بھول گیا ہوں جانے کیا لکھنا تھا
بھولی بسری بات ہے شاید سوتے میں یاد آئے
کس نے شہر کے دروازے پر یہ تختی لٹکا دی
جو اس بستی میں آئے وہ پتھر سا بن جائے
رستے کے اس پتھر پر میں دیپ جلا کر رکھ دوں
میری طرح سروشؔ یہاں اب کوئی نہ ٹھوکر کھائے

○

رات جب خوشبو کی چادر اوڑھ کر سو جائے ہے
چاندنی اس کے سرہانے گیت میٹھے گائے ہے
کل وہ ہنگامہ تھا تنہائی کی رہتی تھی تلاش
آج تنہائی میں ہنگامہ بہت یاد آئے ہے
دشتِ غربت میں بھلا کوئی کہاں پرسانِ حال
بے نوائی غم کی چادر اوڑھ کر سو جائے ہے
چل رہی ہیں ذہن میں یہ آج کیسی آندھیاں
پھول سی یادوں کا چہرہ خود بخود کملائے ہے
بستیاں، صحرا، گلستاں سب ہی پیچھے رہ گئے
اے دلِ دیوانہ آخر تو کہاں لے جائے ہے
کوہِ صحرا سے گزر جاتا ہے باہوش و حواس
دل ہمیشہ کوچۂ جاناں میں ٹھوکر کھائے ہے
میرا ماضی کیا ہے! اک یادوں کا جنگل ہے سروشؔ
پھول کھلتے ہیں کہیں، کانٹا کہیں چبھ جائے ہے

○

ہنگامے سے وحشت ہوتی ہے تنہائی میں جی گھبرائے ہے
کیا جانئے کیا کچھ ہوتا ہے جب یاد کسی کی آئے ہے

جن کوچوں میں سکھ چھین گیا، جن گلیوں میں بدنام ہوئے
دیوانہ دل ان گلیوں میں رہ رہ کر ٹھوکر کھائے ہے

ساون کی اندھیری راتوں میں کس شوخ کی یادوں کا آنچل
بجلی کی طرح لہرائے ہے، بادل کی طرح اُڑ جائے ہے

یادوں کے درپن ٹوٹ گئے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
لیکن بے چہرہ ماضی سایہ سایہ لہرائے ہے

کچھ دنیا بھی بیزار ہے اب ہم جیسے وحشت والوں سے
کچھ اپنا دل بھی دنیا کی اس محفل میں گھبرائے ہے

کلیوں کی قبائیں چاک ہوئیں پھولوں کے چہرے زخمی ہیں
اب کے یہ بہاروں کا موسم کیا رنگ نیا دکھلائے ہے

دیوار نہ در، سنسان کھنڈر ایسا اُجڑا یہ دل کا نگر!
تنہائی کے ویرانے میں آواز بھی ٹھوکر کھائے ہے

یہ میرا کوئی دمساز نہ ہو، رفعتؔ یہ کوئی ہمراز نہ ہو
جو میرے گیت مری غزلیں میری ہی دھن میں گائے ہے

○

ریشم سا بدن، پھولوں سے حسیں، آنکھوں سے گلابی چھلکائے
سنبھلے تو ٹھہر جائے دُنیا ، بہکے تو قیامت آجائے

اِک پھول کی چاہت میں کتنے کانٹوں کو دوست بنایا ہے
اِک زخمِ جگر کے کھلنے تک کیا جانئے کیا نوبت آئے

آنکھوں کے کنول، زلفوں کے بھنور، بانہوں کا سہارا کافی ہے
طوفان کا جب یہ عالم ہو کیا کشتی و ساحل یاد آئے

سب پھول وفا کے کمہلائے، سب دل کے رشتے ٹوٹ گئے
اب سوچ میں ہوں کس نسبت سے اس شوخ کو خط لکھا جائے

اس پیکرِ ناز سے ملنے کی ساعت کو بھلاؤں تو کیسے
وہ عالم جیسے شوخ کلی شاخوں میں چھپ کر شرمائے

یہ کس نے دل پر دستک دی جانی پہچانی سی آہٹ
طوفانِ بہاراں ساتھ لیے بیتے لمحے پھر لوٹ آئے

رفعتؔ رفعتؔ! کچھ تو بولو ! آخر تم کیوں افسردہ ہو
چہرے پہ تھکن، آنکھوں میں نمی، کس محفل سے اُٹھ کر آئے

○

ملو جو اس سے تو بالکل گلاب جیسا ہے
وہ ماہتاب نہیں ، ماہتاب جیسا ہے

وہ ضربِ تیشہ کہ اس نے پہاڑ کاٹ دیے
مگر یہ سچ ہے کہ انساں حباب جیسا ہے

چلو کہ اس کے اُدھر بستیاں کریں آباد
یہ آسماں تو نظر کا نقاب جیسا ہے

بزرگ لوگ تو رحمت ہیں جب تلک بھی جئیں
کہ ان کا سایہ سروں پر سحاب جیسا ہے

خلوص ، دوستی ، ایثار ، خلق ، مہر و وفا
وہ زندگی کا مکمل نصاب جیسا ہے

جلا کے خود کو وہ دیتا ہے روشنی سب کو
سروشؔ اس کا وجود آفتاب جیسا ہے

○

صحرائے لق و دق میں اِک چشمہ ابلتا ہے
فطرت کی نگاہوں میں اِک خواب مچلتا ہے

اِک روحِ تغیر ہے وارفتہ بگولوں میں
ہر دور میں یہ صحرا رُوپ اپنا بدلتا ہے

باطل کے اندھیروں کو پیغامِ فنا دے دو
پھر نور کا اِک لشکر خیمے سے نکلتا ہے

منزل کی تڑپ دل کو رکنے ہی نہیں دیتی
ہرگام پہ دیوانہ گرتا ہے سنبھلتا ہے

یہ کیسا عذاب آخر زندہ ہوں نہ مردہ ہوں
مدّت سے چراغِ جاں بجھتا ہے نہ جلتا ہے

(مکہ معظمہ میں کہی گئی)

○

زندگی اور درد کے سو زاویے پیدا ہوئے
میں ہوا پیدا تو کتنے مسئلے پیدا ہوئے
پُرسکوں تھی کس قدر یہ سطحِ آبِ زندگی
ایک کنکر سے ہزاروں دائرے پیدا ہوئے
مضمحل خاموش سناٹا تھا کب سے رقص میں
اِک صدا گونجی تو کتنے زمزمے پیدا ہوئے
کوئی منزل پر نہ پہنچا آج تک میرے سوا
راستے میں جانے کتنے قافلے پیدا ہوئے
معجزہ ہے یہ عناصر کا کہ دل میں اے سروشؔ
ایک دھڑکن سے ہزاروں ولولے پیدا ہوئے

○

میں ہوں طوفانِ حوادث کا شناسا کب سے
لکھ رہا ہوں غمِ ہستی کا فسانہ کب سے
وار پر وار کیے جاتے ہیں احباب مرے
اِک جہاں دیکھ رہا ہے یہ تماشہ کب سے
ماہِ کنعاں ہے کہ زنداں سے نکلتا ہی نہیں
منتظر ہے دمِ یوسف کی زلیخا کب سے
کوئی بتلائے کہاں دفن کروں میں اس کو
میرے کاندھے پہ ہے خود میرا جنازہ کب سے
نہ بھڑکتا ہے، نہ جلتا ہے نہ بجھتا ہے سروشؔ
دل کہ ہے ایک سلگتا ہوا شعلہ کب سے

○

سانس کے فوارے اُٹھتے ہیں سینے میں سوراخ ہوں جیسے
جینا تو اِک مجبوری ہے، لیکن اور کتنے دن ایسے!!
بیماری، تنہائی، غربت، کس سے کہوں اب دل کی حالت
بن تیرے جیون کے یہ دن کاٹ، رہا ہوں جیسے تیسے
دل میں تھی بس ایک تمنا، تم سے ملنا، باتیں کرنا
لیکن اس اک سکھ کی خاطر دکھ جھیلے ہیں کیسے کیسے
مجبوری نے، معذوری نے تیرے در پر لا ڈالا ہے
لیکن یہ نہ سمجھنا بھائی! ہم ہیں کوئی ایسے ویسے
ہاں ہاں تم ہو وفا کے پیکر، میں ٹھہرا بدنام آوارہ
اب نہ کریدو بیتی باتیں، بھول سکا ہوں جیسے تیسے
نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں ہے
لکھتا جاتا ہوں افسانہ یاد آتا ہے جیسے جیسے
سب احباب ہوئے بیگانے اب تو سروشؔ چلو گھر اپنے
بگڑی میں کام آتے ہیں نالائق بیٹے، کھوٹے پیسے

○

سانس قابو میں جو آئے تو ذرا دل ٹھہرے
مشعلِ جاں مری طوفاں کے مقابل ٹھہرے
اس نے جب پہلے پہل پیار سے دیکھا تھا مجھے
وہی لمحات مری زیست کا حاصل ٹھہرے
زندگی خوابِ گریزاں کے سوا کچھ بھی نہیں
فلسفے عقل و خرد کے سبھی باطل ٹھہرے
زندگی موت پہ پھر فتح مبارک تجھ کو
بچ کے طوفان سے ہم پھر لبِ ساحل ٹھہرے
ہم وہ راہی کہ مقدر ہے سفر جن کا سروشؔ
ہم جہاں بیٹھ کے دم لیں وہی منزل ٹھہرے

○

سرودِ جاں پہ کوئی آخرِ شب میں غزل خواں ہے
معانی کا جہاں لطفِ سخن سے نور ساماں ہے

جو برہم ہے نگاہِ ناز ہر شے فتنہ ساماں ہے
گلستاں شعلہ پیکر ہے، ہوائے گل پریشاں ہے

زمیں کے قلبِ سوزاں میں جہنم ہی جہنم ہیں
فسادِ عقلِ انسانی سے خود یزداں بھی لرزاں ہے

یہ کیسی پیاس ہے صدیوں سے جو بجھنے نہیں پاتی
یہ کیسی کربلا ہے جو بیاباں در بیاباں ہے

لکھا دستِ ازل نے حرفِ دانش میرے سینے پر
یہی توریت ہے، انجیل ہے، گیتا ہے قرآں ہے

سفینہ آلگا عمرِ رواں کا جب کنارے پر
تو کیا موجِ بلا، کیسی ہَوا، کیا جوشِ طوفاں ہے

ہوا سنکی، کھلے غنچے، فضا میں نور لہرایا
اُٹھو رفعتؔ یہی تو لمحۂ تجدیدِ ایماں ہے

○

یہ دنیا ہے، یہاں جینے کی مہلت چار دن کی ہے
لہو میں یہ روانی ، یہ حرارت چار دن کی ہے

کھلاؤ پھول لفظوں کے، لکھو جب تک لکھا جائے
خیالوں میں یہ شوخی ، یہ حلاوت چار دن کی ہے

نفس کی آمد و شد اِک تعلق ہے زمانے سے
زمانے سے محبت ہو کہ نفرت چار دن کی ہے

عناصر کا یہ شیرازہ نہ جانے کب بکھر جائے
یہ بزمِ آب وگل ہے، یاں رفاقت چار دن کی ہے

اگر ہو مستقل تو آدمی بیزار ہو جائے
غنیمت ہے کہ یہ دنیا کی راحت چار دن کی ہے

سرِ دربارِ شاہی گا رہا تھا ایک دیوانہ
یہ شانِ کج کلاہی ، یہ رعونت چار دن کی ہے

یہ ڈھلتی دُھوپ ہے رفعتؔ، عبث ہے اس پہ اترانا
یہ عزت چار دن کی ہے، یہ شہرت چار دن کی ہے

شہرِ غزل

ناشر
نورنگ کتاب گھر، نوئیڈا

اشاعت:
۱۹۹۹ء

○

اس بھرے شہر میں اکیلا ہوں اپنے دل کا اُداس نغمہ ہوں
جس نے صحرا چنا سفر کے لیے وہ مسافر، وہ آبلہ پا ہوں
ہوگیا جو فضاؤں میں تحلیل میں وہ ٹوٹا ہوا ستارہ ہوں
مجھ کو روشن کرے گا جان کون میں چراغِ فروغِ فردا ہوں
اے سروشؔ آج کل یہ عالم ہے
ہر غزل آنسوؤں سے لکھتا ہوں

(۲۷/اپریل ۱۹۹۲ء)

○

لالچ کھوٹ کپٹ کو تیاگ سونے کی لنکا سے بھاگ
ایٹم پر بیٹھی دُنیا چھیڑ رہی ہے دیپک راگ
یاس کے زنداں سے نکلو ڈس لیں گے غفلت کے ناگ
لفظوں میں شعلوں کی لپک دل میں بھری ہے کیسی آگ
میں تیرا ہی سایہ ہوں مجھ سے ڈر کر دُور نہ بھاگ
ساون بھی جل جائے گا عشق جو چھیڑے دیپک راگ
بجھتے بجھتے بجھے گی سروشؔ
کھیل نہیں یہ دل کی آگ

(۵/مئی ۱۹۹۲ء)

○

یہ جنتِ جمال و ہنر بے ثبات ہے
جس کو دوام ہے وہ کوئی اور ذات ہے
آب و ہوا کا، آگ کا، مٹی کا معجزہ
ہر شخص اپنی ذات میں اِک کائنات ہے
سیّارۂ گماں ہے کہ ہے کرۂ خیال !!
یہ کون سا مقام ہے! دن ہے نہ رات ہے
خود اپنے ہی وجود سے ٹکرا گیا ہوں میں
کرتا ہوں جس کو قتل یہ میری ہی ذات ہے
ہے کربلا میں آج بھی زندہ حسینیت
لشکر یزید کا ہے نہ موجِ فرات ہے

(۲۰ر مئی ۱۹۹۲ء)

○

مجھ سے ملنے کون آیا خاموش کے پیکر میں
سایہ سایہ گھوم رہا ہے کون یہ میرے گھر میں
سنّاٹے کے پہلو میں یہ سَر سَر سی کیسی ہے
ناگن سی لہراتی ہے تنہائی ہر منظر میں
جیسے تھک کر سویا تھا بس ویسے ہی اُٹھ بیٹھا
کروٹ کی بھی شکن نہیں ہے آج مرے بستر میں
بے خبری سی بے خبری! صندل کے محل میں اپنے
ایسی شمع جلا بیٹھا جو آگ لگا دے گھر میں
خون کی ہولی کھیل رہے ہیں کچھ دیوانے لیکن
اپنا خون نظر آتا ہے مجھ کو ہر منظر میں
اس دھرتی پہ جانے کس نے کل بوئی تھی نفرت
اُگ آئے زہریلے پودے آج یہاں گھر گھر میں
تیغ و تفنگ سروشؔ کھلونے ہیں مردوں کے لیکن
کاٹ بہت ہوتی ہے تیکھی باتوں کے نشتر میں

(۳ر جون ۱۹۹۲ء)

○

اب خواب ہوئے سب ہنگامے، یگ بیتے بزم آرائی کو
سینے سے لگائے بیٹھا ہوں ویرانی کو ، تنہائی کو
شہروں کے تپتے محلوں میں دل یاد کرے ہے رہ رہ کر
مہکی مہکی امرائی کو ، بھیگی بھیگی پُروائی کو
ہے عین سعادت میرے لیے ہو ذکر تمھارے ساتھ اگر
خوش بختی سے تعبیر کروں میں اپنی اس رُسوائی کو
صحرا صحرا ، گلشن گلشن کانٹوں سے اُلجھا ہے دامن
زخموں ہی کی سوغات ملی پھولوں کے ہر شیدائی کو
منزل نے فریب دیے کتنے یہ کہنا مشکل ہے شاید
الزام مگر دینا ہے سروشؔ اپنی ہی شکستہ پائی کو

○

دولتِ حرف و بیاں ساتھ لیے پھرتے ہیں — ہم محبت کا جہاں ساتھ لیے پھرتے ہیں
اِک تبسّم پہ نہ جانا کہ ترے دیوانے — غم کا اِک کوہِ گراں ساتھ لیے پھرتے ہیں
جس پہ اِک سانس کی تکرار سے بال آجائے — ہم وہ شیشے کا مکاں ساتھ لیے پھرتے ہیں
آندھیاں اس کو بجھانے کے لیے ہیں بیتاب — ہم جو یہ مشعلِ جاں ساتھ لیے پھرتے ہیں
دشتِ غربت میں بزرگوں کو دُعا ہے ہمراہ — سایۂ ابرِ رواں ساتھ لیے پھرتے ہیں
سنگِ دَر سے جو ترے صورتِ سوغات ملا — روشنی کا وہ نشاں ساتھ لیے پھرتے ہیں

ہم نے دیکھا تو نہیں صرف سُنا ہے کہ سروشؔ
آج کل سروِ رواں ساتھ لیے پھرتے ہیں

(۱۰ر جون ۱۹۹۲ء)

○

نہ پوچھو ہم سے، اس محفل میں کیا کیا چھوڑ آئے ہیں
لپکتا تھا کبھی دل میں جو شعلہ، چھوڑ آئے ہیں

گھٹن ان بستیوں میں ہے تکلّف اور رعونت کی
تمھارے واسطے ہم کوہ و صحرا چھوڑ آئے ہیں

جہاں موجوں سے اُلجھے تھے، جہاں کشتی سے اُترے تھے
وہ ساحل چھوڑ آئے ہیں، وہ دریا چھوڑ آئے ہیں

ملے تو ان سے خلوت میں، نہ ہم کچھ کہہ سکے لیکن
کبھی جو لکھ نہ پائے خط وہ کورا چھوڑ آئے ہیں

عجب کیا ہے شرف اس کو قبولیت کا حاصل ہو
ہم ان کے آستاں پر نقشِ سجدہ چھوڑ آئے ہیں

ملی تھیں چند سانسیں، زندگی میں کام تھے کتنے
ہوا کیا ہم سے، ہر اِک کام ادھورا چھوڑ آئے ہیں

ہمارے بعد شاید کوئی منزل تک پہنچ جائے
جہاں تک چل سکے، نقشِ کفِ پا چھوڑ آئے ہیں

کبھی پہچان لے شاید کوئی، ہم کون تھے کیا تھے
درودیوار پر ہم اپنا سایہ چھوڑ آئے ہیں

ہماری زندگی تھی اے سروشؔ اِک عقدۂ مشکل
جسے ہم خود نہ سمجھے، وہ فسانہ چھوڑ آئے ہیں

(یکم جولائی ۱۹۹۲ء)

○

اے تنہائی کچھ تو بول
چپ کیوں ہے اپنے لب کھول

پھول نہیں تو خار سہی
خالی ہے میرا کشکول

باقی سب کی قیمت ہے
لیکن سانس ہر اک انمول

اُڑ جائیں گے ہواؤں میں
اپنے دل کے راز نہ کھول

سیدھی سیدھی باتیں کر
سچائی میں زہر نہ گھول

کچھ کہنے سے پہلے سوچ
اپنے ہر اِک لفظ کو تول

ہے یہ اُردو کی پہچان
خوش آہنگ رسیلے بول

رفعتؔ تیرا میرا ساتھ
تھوڑی دیر سہی، ہنس بول

آج گہر افشاں ہے سروشؔ
رول سکے تو موتی رول

(۱۱ر جولائی ۱۹۹۲ء)

○

حالاتِ زندگی کے کچھ ایسے بگڑ گئے
آخر ہم اپنے آپ سے خود ہی بچھڑ گئے

آزاد ہوں تو اُڑنے کا اب حوصلہ نہیں
قیدِ قفس میں سارے پر و بال جھڑ گئے

گلشن میں تازہ پھول کھلیں گے خزاں کے بعد
لیکن وہ چند پیڑ جو جڑ سے اُکھڑ گئے!

بوڑھا درخت تند ہواؤں کی زد میں ہے
کچھ کچے پھل بھی موت کی آندھی میں جھڑ گئے

اب ہم بھی چار دن کے ہیں مہماں سرائے میں
شہرِ سخن میں جتنے مکاں تھے اُجڑ گئے

کس کس کا مرثیہ لکھوں اے زندگی بتا
تھے کتنے ہم سفر جو ملے اور بچھڑ گئے

صحرائے زندگی میں اکیلا ہوں اے سروشؔ
سب یار دوستوں کے تو خیمے اُکھڑ گئے

(۱۸ر ستمبر ۱۹۹۲ء)

○

شہرِ ہوس میں صاحبِ کردار کی تلاش
جنگل میں جیسے گلشنِ بے خار کی تلاش
اس دُھوپ کے نگر میں بگولوں کا رقص ہے
صحرا میں اور سایۂ دیوار کی تلاش!
ان کی رگوں میں جذب ہیں تعمیر کے نقوش
خاموش پتھروں کو ہے معمار کی تلاش
بازار میں کھڑا ہوں متاعِ ہنر لیے
میں کب سے کر رہا ہوں خریدار کی تلاش
یہ کیسا شہر ہے مرے دل میں بسا ہوا
جس کو ازل سے ہے درودیوار کی تلاش
بکھرے پڑے ہیں کوچہ و بازار میں بہت
موضوع کر رہے ہیں قلم کار کی تلاش
تاریخ اپنی آنکھیں مجھے دے کہ اے سروشؔ
ہے مجھ کو عہدِ رفتہ کے آثار کی تلاش

(۱۹رستمبر۱۹۹۲ء)

○

اکیلا تھا، اکیلا چل رہا ہوں
پلٹ کر پھر میں کس کو دیکھتا ہوں
نہ جانے کب میں اک طوفان بن جاؤں
میں اِک دریا، ابھی ٹھہرا ہوا ہوں
سنور کر پھر بکھر جانے کی ضد تھی
بکھر کر پھر سنورنا چاہتا ہوں
کرن آئے کہیں سے روشنی کی
میں صدیوں سے اندھیرے میں کھڑا ہوں
سروشؔ آتا ہے اک لمحہ بھی ایسا
میں اپنے آپ ہی کو پوجتا ہوں

(۲۱راکتوبر۱۹۹۲ء)

○

نہ آگہی کا ، نہ ہے اختیار کا لمحہ
یہ زندگی نفسِ بے قرار کا لمحہ
خدا کرے کہ نہ آئے وہ اور تھوڑی دیر
بہت لطیف ہے یہ انتظار کا لمحہ
ہوا کے لمس سے جس دم کھلا تھا پہلا پھول
چمن کی رُوح تھا بس وہ بہار کا لمحہ
فرشتو جاؤ ابھی موت کے خمار میں ہوں
ملا ہے کتنے برس میں قرار کا لمحہ
سروشؔ پھیل گیا ہے اُفق پہ صدیوں کے
کسی کی شوخ نگاہوں کے پیار کا لمحہ

(۲۸ر اکتوبر ۱۹۹۲ء)

○

نفس نفس کی حفاظت سے تھک گیا ہوں میں
کہ زندگی کی ریاضت سے تھک گیا ہوں میں
سکون دے مجھے اپنی سیاہ زُلفوں میں
تمام دن کی مسافت سے تھک گیا ہوں میں
نہیں جو دوست تو دشمن ملے خلوص کے ساتھ
فریب خوردہ رفاقت سے تھک گیا ہوں میں
تمام عمر جو پلکوں پہ بوجھ بن کے رہا
اس ایک اشکِ ندامت سے تھک گیا ہوں میں
یہ زندگی ہے کہ اِک بوجھ میرے کاندھوں پر
سروشؔ بارِ امانت سے تھک گیا ہوں میں

(۶ر نومبر ۱۹۹۲ء)

○

ہر اِک موجِ نفس ہے برق ساماں — بھڑکتی جارہی ہے مشعلِ جاں
شکستہ دل سہی ، چل تو رہا ہوں — مرے زیرِ قدم ہے دشتِ امکاں
اُمید اِک لفظ ہے کہنے کو ، لیکن — کتابِ زندگانی کا ہے عنواں
ورق لاکھوں لکھے اور پھاڑ ڈالے — نہ بن پائی مگر تصویرِ جاناں
اندھیروں میں اچانک نُور کیسا!
لبوں پر آ گئیں آیاتِ قرآں (۱۱رستمبر۱۹۹۲ء)

○

بجھا بجھا کے جلاتا ہے دل کا شعلہ کون
دِکھا رہا ہے مجھی کو مرا تماشہ کون
سبھی کے چہروں پہ مہر و وفا کا غازہ ہے
کہوں یہ کیسے ، پرایا ہے کون ، اپنا کون
خوشی کی بزم میں ہم رقص ہیں سبھی ، لیکن
کرے گا پار مرے ساتھ غم کا دریا کون
بہار آئی ہے لیکن کھلے ہیں آگ کے پھول
ہر اِک درخت میں رکھ کر گیا ہے شعلہ کون
یہ پھول ، رنگ ستارے ، فضا کی رعنائی
اُٹھا کے بھول گیا اپنے رُخ سے پردہ کون
یقین تھا اُسے آنا ہے ایک دن ، لیکن
اچانک آئی تو دل نے دھڑک کے پوچھا ، کون؟
ورق ورق پہ محبت کی داستاں لکھ کر
سروشؔ سوچ رہا ہوں اسے پڑھے گا کون (۲۷ردسمبر۱۹۹۲ء)

○

لہو میں کوند گئیں بجلیاں سی آخرِ شب
نفس میں چلنے لگیں آندھیاں سی آخرِ شب

کسی کی یاد کا آنچل ہوا میں اُڑتا تھا
نظر فریب تھیں پرچھائیاں سی آخرِ شب

تھکے تھکے سے مرے ساتھ جاگتے تھے مگر
ستارے لیتے تھے انگڑائیاں سی آخرِ شب

یہ شخص کون تھا جو مرگیا پسِ دیوار
سنی تھیں ہم نے بھی کچھ ہچکیاں سی آخرِ شب

یہ خواب ہے کہ حقیقت، کوئی بتائے سروشؔ
میں روز سنتا ہوں شہنائیاں سی آخرِ شب

○

شانوں پہ زندگی کے عقیدوں کا بوجھ ہے
رسموں کی ہے کمند، رواجوں کا بوجھ ہے

سناٹے کی زبان سمجھنا ہوا محال
میری سماعتوں پہ تو نغموں کا بوجھ ہے

حرص و ہوس کے خار چبھوتی ہے ہر نظر
اُس پھول سے بدن پہ نگاہوں کا بوجھ ہے

زہرہ، زحل، عطارد و مریخ و مشتری
میری زمیں پہ کتنے ستاروں کا بوجھ ہے

عاری ہیں ذہن روشنیٔ علم سے، مگر
کہنے کو سب کے سر پہ کتابوں کا بوجھ ہے

فرقہ پرستی، بغض و دغا، جہل، مکروفن
اِک ذہن پر ہزار سوالوں کا بوجھ ہے

کھلتا نہیں کہ دوست ہیں ہمراز یا رقیب
چہروں پہ ان کے کتنی نقابوں کا بوجھ ہے

ڈرتی ہے مجھ سے موت گریزاں ہے زندگی
مجھ کو ملی دُعاؤں پہ آہوں کا بوجھ ہے

میں توڑنا بھی چاہوں تو ممکن نہیں سروشؔ
میرے تعلقات پہ صدیوں کا بوجھ ہے

(۲۰ رجنوری ۱۹۹۳ء)

○

دیکھ ڈالے ہم نے خیر و شر کے سارے تذکرے
سب حوالے ہیں تمھارے، سب تمھارے تذکرے

ہم گناہِ عشق کر بیٹھے تھے ، اچھا ہی ہوا
ورنہ کرتا کون دنیا میں ہمارے تذکرے

عشق کی اور مشک کی خوشبو کبھی چھپتی نہیں
آج کل ہیں رونقِ محفل ہمارے تذکرے

ایک دیوارِ انا ہے اب ہمارے درمیاں
ہم تو چپ ہیں، لوگ کرتے ہیں ہمارے تذکرے

صحبتیں اہلِ ہنر کی اب کہاں رفعت سروشؔ
لکھ رہا ہوں اب تو یادوں کے سہارے تذکرے

(۵/مارچ ۱۹۹۳ء)

○

کبھی جو اپنے سفر کی مَیں داستاں لکھوں
تری گلی کو محبت کی کہکشاں لکھوں

ہر ایک شاخِ چمن ہم کلام ہے مجھ سے
ہر اک شگوفے کو میں اپنا ہم زباں لکھوں

سلگ رہا ہے تمازت سے غم کی میرا وجود
میں اپنے آپ کو جلتا ہوا مکاں لکھوں

کھلی پڑی ہے مرے سامنے کتابِ حیات
تمھارا نام بتاؤ کہاں کہاں لکھوں

سُنا رہا ہے زمانہ ہزارہا قصّے
مگر میں اپنے سوا کس کی داستاں لکھوں

یہ کس مقام پہ ٹھہرا ہے قافلہ دل کا
یہ کیا جگہ ہے! امکاں ہے کہ لامکاں لکھوں!

تمام عمر کسی کی تلاش میں گزری
تمام عمر کو اِک سعیٔ رائگاں لکھوں

سفینہ اب تو کنارے پہ آ لگا ہے سروشؔ
عبث جو شورشِ طوفاں کا میں بیاں لکھوں

○

آدابِ کلام آئے ، شوریدہ سری آئی
جب خود کو بھلا بیٹھے ، تب خودنگری آئی

ہم جیسے دوانوں کا مسلک ہے جُداگانہ
حصّے میں ازل ہی سے آشفتہ سری آئی

ایمان لرز اُٹھا ، جس وقت مرے دل میں
لالچ کی قبا لے کر سونے کی پری آئی

جب ہوش رہا اپنا ، آنکھوں پہ تھا اِک پردہ
جب بھول گئے خود کو ، روشن نظری آئی

اس شوخ کے پیکر کو الفاظ میں جب ڈھالا
اشعار میں تب جا کے جادو اثری آئی

(۳/اپریل ۱۹۹۳ء)

○

نفرتیں اور رنجشیں ، حرص و ہوس
زندگی کیا دے گئی اب کے برس

کچھ دنوں سے اِک عجب احساس ہے
خود مرا ہی جسم ہے میرا قفس

کیا بتاؤں اس سے ملنے کا سبب
اِک سکوں ملتا ہے مجھ کو ، اور بس

اعتبارِ زندگی جاتا رہا
موت نے یورش وہ کی اب کے برس

تشنہ لب بھونروں کا موسم ہے سروشؔ
ہر کلی کا چوستے پھرتے ہیں رس

(۲۹/اپریل ۱۹۹۳ء)

○

ہمارے گھر میں عجب طرح کی اُداسی ہے
ہر ایک چیز کسی شے کی جیسے پیاسی ہے

وہ رات لوٹا، تو گھر کا ہی رستہ بھول گیا
کچھ اور بات نہیں، صرف بدحواسی ہے

کہو یہ بچوں سے، اس کو نہ تار تار کریں
ابھی ابھی تو دوانے نے یہ قبا سی ہے

تمام غنچہ و گل دے چکے لہو اپنا
بتا زمینِ چمن! اور کتنی پیاسی ہے

جدھر بھی دیکھئے باطل کی حق پہ ہے یلغار
سروشؔ ساری زمیں آج کربلا سی ہے

(۲۶؍جون ۱۹۹۳ء)

○

ایک جلوہ تھا، مگر بن گئے پیکر کتنے
مل گئے اک بُت رعنائی کو آذر کتنے

شب کے سناٹے میں زخموں سے دُھواں اٹھتا ہے
دل میں اُترے ہیں تری یاد کے نشتر کتنے

صرف اک گھونٹ مسرت کی طلب میں اے دل
پی گئی پیاس مری غم کے سمندر کتنے

منزلِ شوق پہ پہنچے، تو ہم آوارہ مزاج
راستہ بھول گئے راہ میں رہبر کتنے

آج بدلی جو فضا، ہم نے بھی توبہ کرلی
ورنہ میخانے میں چھلکائے ہیں ساغر کتنے

بہ گئیں نفرت و تحقیر کی سب دیواریں
تھے نہاں اشکِ ندامت میں سمندر کتنے

سرِ ساحل تو سدا بھیڑ لگی رہتی ہے
لیکن اس بحرِ ادب کے ہیں شناور کتنے

حرمتِ حرفِ محبت کو بچانا ہے سروشؔ
بک گئے شہرِ سیاست میں سخنور کتنے

(۱۶؍اگست ۱۹۹۳ء)

○

خوف کا سایہ رینگ رہا ہے منظر منظر قید میں ہے
کل جو ساحل توڑ چکا ہے اب وہ سمندر قید میں ہے

لفظ تو ہیں لیکن بے معنی، حرف تاثر سے عاری
کیسے آئے زورِ قلم جب روحِ سخنور قید میں ہے

میخانے ویران پڑے ہیں، سناٹا ہے سڑکوں پر
کیا رونق ہو شہر میں، جب ہر مست قلندر قید میں ہے

پے در پے ہے موت کی یورش اور اکیلا تارِ نفس
ہوش و حواس اور قلب و جگر کا سارا لشکر قید میں ہے

فکرِ جہانِ تازہ کے اصناف تراشے کون سروشؔ
نقش نہاں پتھر کے جگر میں، رُوحِ آذر قید میں ہے

(۱۲/اکتوبر ۱۹۹۳ء)

○

جہانِ فکر کے ہر اک سوال میں ہوں میں
حیاتِ نو کے جلال و جمال میں ہوں میں

ہر ایک منظرِ اوجِ کمال میں ہوں میں
ہر ایک قصۂ ہجر و وصال میں ہوں میں

بلند و پست کی سب رونقیں مجھی سے ہیں
زمین! تیرے عروج و زوال میں ہوں میں

ہٹاؤ کھیل سیاست کے، مکر کی بازی
شرارتوں کے فرشتو! جلال میں ہوں میں

مجھے نہ دیکھ سکے، پھر بھی مجھ کو پہچانو
ہر ایک لمحہ تمھارے خیال میں ہوں میں

یہ کس نے کاٹ دیے ہیں مرے پرِ پرواز
سروشؔ آج عناصر کے جال میں ہوں میں

(۲۱/اکتوبر ۱۹۹۳ء)

○

لغزشِ محبت کو شورشِ نفس جانا
اور اہلِ ظاہر نے ہم کو بوالہوس جانا
اُن کے آستاں سے بھی رختِ جاں اُٹھا لائے
راس ہی نہیں آتا ایک گھر میں بس جانا
انتظار کی گھڑیاں اس طرح گزاری ہیں
ایک ایک لمحے کو ایک اِک برس جانا
ہر گھڑی ستاتی ہے دل کو حسرتِ پرداز
جب سے جسمِ خاکی کو صورتِ قفس جانا
شکر ہے مکاں دل کا مدّتوں سے خالی ہے
اے مئی مئی یادو! تم نہ اس میں بس جانا

(یکم ستمبر ۱۹۹۴ء)

○

فلک زمیں پہ گرا اور زمیں ہے طشت از بام
بہت ہی تیز ہوا رقصِ گردشِ ایام
ہمارے حصّے میں آئی ہے صرف تشنہ لبی
اگرچہ بدلا ہے سو بار میکدہ کا نظام
لبوں پہ جم سا گیا ہے تبسمِ بے کیف
نہ رو سکے نہ ہنسے کھل کے مصلحت کے غلام
مفکروں کے خیالوں کو نظم کرنے سے
بھلا بنا ہے کوئی کعبۂ سخن کا امام
غبار بن کے اُٹھا اور فضا میں پھیل گیا
مجھے نہ ڈھونڈو کہ میں سر بسر ہوں اب ابہام
تمام شمس و قمر گردِ راہِ شوق ہوئے
کوئی بتائے کہ آخر کہاں ہے میرا مقام
یہ اور بات کہ تنقید کے قتیل ہیں ہم
عوام و خاص میں مقبول ہے ہمارا کلام
چراغِ عمر کی لَو جھلملا رہی ہے سروشؔ
ستارۂ سحری جھک کے کر رہا ہے سلام

(۲۰ مارچ ۱۹۹۴ء)

○

تعلقات میں اِک اعتدال لازم ہے نیاز و ناز بہ حسنِ کمال لازم ہے
ہر اِک سوال کا ملتا نہیں جواب کبھی جواب کے لیے ذوقِ سوال لازم ہے
اُٹھا جو خاک سے، ملنا ہے خاک میں اس کو سفر یہ ہجر کا ہے اور وصال لازم ہے
اُفق میں ڈوبتے سورج نے سر جھکا کے کہا جسے عروج ہو اس کا زوال لازم ہے
سروشؔ حسنِ عبارت سے کچھ نہیں ہوتا
ہر ایک لفظ میں حسنِ خیال لازم ہے

(یکم ستمبر ۱۹۹۴ء)

○

فضا فضا میں بکھر گیا تھا، سمٹ رہا ہوں میں لمحہ لمحہ
ہواؤں سے آج مانگ لایا، ہر اِک صدا اپنی، نغمہ نغمہ

کھلیں جو آنکھیں تو ہوش آیا، نشے میں سرشار ہو گیا تھا
وہ مے، ہے آلودہ جس سے دامن، نچوڑتا ہوں میں قطرہ قطرہ

جس آستاں سے اُٹھا دیا تھا سمجھ کے دیوانہ پاسباں نے
اُس آستاں کی طرف چلا ہوں قدم قدم اور سجدہ سجدہ

یہ انتہا ہے کہ تیرے کوچے میں راکھ بن کر بکھر گیا ہوں
وہ ابتدا تھی جنون کی جب، وجود میرا تھا شعلہ شعلہ

متاعِ حُسنِ خیال کب تک چھپا کے رکھوں سروشؔ دل میں
جو مجھ میں پنہاں تھا مدتوں سے، بکھر رہا ہے وہ جلوہ جلوہ

(۲۷ ستمبر ۱۹۹۴ء)

○

لہجے کا حسن، حرف کی تاثیر لے گیا
اِک شخص میری شوخیِ تحریر لے گیا

شعروں میں نغمگی ہے نہ وہ سوز وسازِ عشق
یہ کون میرے پاؤں کی زنجیر لے گیا

زخموں کی آب وتاب میں قاتل کا عکس ہے
پھر کیا ہوا جو ساتھ وہ شمشیر لے گیا

"میں اس کا نام تک بھی نہ لاؤں زبان پر"
دے کر قسم، وہ لذّتِ تقریر لے گیا

آیا مرے قریب وہ اِک خواب کی طرح
اور جاتے جاتے خواب کی تعبیر لے گیا

آنکھوں میں اس کی اِک نئی دنیا کے خواب تھے
دل میں سروشؔ حسرتِ تعمیر لے گیا

(۴؍اکتوبر ۱۹۹۴ء)

○

یہ شام وسحر، یہ روئے فلک، کس کا جلوہ رقصندہ ہے
لاکھوں سورج اُبھرے، ڈوبے، اِک نور مگر پائندہ ہے

وہ تیرے حرفِ تمنّا کی تفہیم سے کیوں معذور رہا
یہ ایسی لغزش تھی دل کی، جس پر اب تک شرمندہ ہے

جو اہلِ حق کا قاتل تھا تاریخ پہ ہے اِک داغ، مگر
صدیوں پہلے جو قتل ہوا وہ شخص ابھی تک زندہ ہے

اِک خواب ہے کب سے آنکھوں میں تعبیر نہ جانے کیا ہوگی
صدیوں کی لمبی رات گئی، پھر روئے شفق تابندہ ہے

کوشش کوشش، پیہم کوشش، ہر پائے عمل منزل کی طرف
دستور سروشؔ یہ دنیا کا، جوئندہ ہی یابندہ ہے

(۶؍اکتوبر ۱۹۹۴ء)

○

آ گئے ہیں ہم سرِ ساحل، عجب دھوکا ہوا
بیچ میں منجدھار کے طوفان ہے ٹھہرا ہوا

دھند میں لپٹا ہوا ہے چاند کس کا منتظر
مل کی چمنی پہ کھڑا ہے دیر سے سمٹا ہوا

میرے گھر کے ایک کونے میں کھڑا ہے مستقل
برف کا موسم رضائی میں ہے جو لپٹا ہوا

کیا پڑھوں! دیوانگی کی منحنی تحریر ہے
میرا خط آیا ہے میرے نام ہی لکھا ہوا

اب اجازت! میں نے اپنا فرض پورا کر دیا
دیکھ لے اے وقت سارا کام ہے سمٹا ہوا

(۱۹/ اکتوبر ۱۹۹۴ء)

○

اے دیدۂ نم اور چھلک اور چھلک اور
اے مشعلِ جاں اور بھڑک اور بھڑک اور

کچھ کچھ نظر آنے لگا اب جلوۂ جاناں
ہر پردہ میں تو اور جھلک اور جھلک اور

اب شمع کی لَو دور نہیں اور قریب آ
پروانۂ دل اور لپک اور لپک اور

دیوانہ اچانک سرِ منزل نہ پہنچ جائے
اے پائے جنوں اور بہک اور بہک اور

یاد آ گیا اک شوخ کی رفتار کا عالم
اے شاخِ حنا اور لچک اور لچک اور

مدّت میں ہوا شوخ وہ مائل بہ تبسم
اے غنچۂ دل اور چٹک اور چٹک اور

پھر شاخِ گلستاں پہ شباب آنے لگا ہے
اے مرغِ چمن اور چہک اور چہک اور

ہر لمحہ تڑپنے کی تو لذت ہی الگ ہے
اے قلبِ حزیں اور دھڑک اور دھڑک اور

ویرانیٔ گلشن ہے سروشؔ اپنا مقدر
اے بادِ خزاں اور لہک اور لہک اور

(۲۹/ اکتوبر ۱۹۹۴ء)

○

دل میں ہے انتشار سا، کوئی غزل سناؤ
سینے میں ہے غبار سا، کوئی غزل سناؤ

ویران زندگی میں یہ جھونکا بہار کا
آنے لگا خمار سا، کوئی غزل سناؤ

سینے میں دل ہے اور جگر، آسماں پہ چاند
سب کچھ ہے داغدار سا، کوئی غزل سناؤ

یہ تم ہو جس نے شانے پہ رکھا تھا میرے ہاتھ
آنے لگا قرار سا، کوئی غزل سناؤ

شاید تمھیں بھی اپنی جفا پر ملال ہو
میں بھی ہوں شرمسار سا، کوئی غزل سناؤ

کچھ ذکر ماہتاب ہو، کچھ شعر، کچھ شراب
ہم ہیں کہاں کے پارسا، کوئی غزل سناؤ

شہرت، عروج، کرسی و منصب کا اقتدار
سب کچھ ہے کاروبار سا، کوئی غزل سناؤ

سنتے ہیں شعر بن کے مہکتا ہے غم کا پھول
پھر دل ہے سوگوار سا، کوئی غزل سناؤ

لطفِ کلام آئے گا اس حال میں سروشؔ
دامن ہے تار تار سا، کوئی غزل سناؤ

(۳؍دسمبر ۱۹۹۴ء)

○

اکثر ایسا لگتا تھا ، جی چھوٹ رہا ہے جیسے
آج تو جسم کا ریشہ ریشہ ٹوٹ رہا ہے جیسے

مٹتی جاتی ہیں دل سے بچپن کی سہانی یادیں
من مندر کی دولت کوئی لوٹ رہا ہے جیسے

کروٹ کروٹ بستر پر ڈستی ہے مجھے تنہائی
سکھ سپنوں کا جادو بھی اب ٹوٹ رہا ہے جیسے

کچے دھاگے سے لگتے ہیں سارے رشتے ناطے
دنیا سے سمبندھوں کا پُل ٹوٹ رہا ہے جیسے

جب میں غزلیں کہتا ہوں تو کچھ ایسا لگتا ہے
دھرتی کے سینے سے انکر پھوٹ رہا ہے جیسے

(۷ر دسمبر ۱۹۹۴ء)

○

آج کہاں ہو کر آئی نٹ کھٹ چنچل پروائی
ممتا کے ہاتھوں کی تھپک مجھ کو اچانک یاد آئی
پنچھی، شاخیں، پتّے، پھول، جاگے لے کر انگڑائی
گملے میں ننھی سی کلی کھلتے کھلتے شرمائی
بھول نہیں پایا اب تک پہلے پہلے پیار کی بات
جیسے بوندوں سے مہکے کچّے گھر کی انگنائی
آنکھوں میں کٹ جاتی ہے اب تو ساری ساری رات
کانٹا بن کر چبھتی ہے کروٹ کروٹ تنہائی
کچھ تو بدلا ہے موسم، نکلی تاروں کی بارات
دور خلا میں گونجی ہے مدھر ملن کی شہنائی

(۸؍دسمبر ۱۹۹۴ء)

○

اس کی تصویر کو میں دل سے مٹا سکتا کاش
جس کی ہر لمحہ مجھے رہتی ہے خوابوں میں تلاش
ایک ہی در پہ رہوں، ایسا مقدر ہے کہاں
کوچہ کوچہ لیے پھرتی ہے مجھے فکرِ معاش
وہ جہاں پیڑ ہے برگد کا، گھنا، سایہ دار
اسی بستی میں کبھی اپنی بھی تھی بود و باش
موت تو آئی مگر دے نہ سکی مجھ کو سکوں
میں ہوں صحرائے تمنا میں تڑپتی ہوئی لاش

(۸؍دسمبر ۱۹۹۴ء)

○

کوئی ساحل ڈھونڈیے، کوئی کنارا ڈھونڈیے
بھیڑ ہے کتنی یہاں، منزل کا رستہ ڈھونڈیے

زندگی کی آگ دب جائے مگر بجھتی نہیں
دل میں باقی ہے ابھی تک جو شرارا ڈھونڈیے

مال و دولت، نام، شہرت، سب سہارے ہیں فضول
ڈھونڈنا ہے تو محبت کا سہارا ڈھونڈیے

کوئی ساحل سے نہیں آئے گا اب امداد کو
ڈھونڈیے، طوفاں میں تنکے کا سہارا ڈھونڈیے

جس سے ہم آہنگ ہو جائیں دلوں کی دھڑکنیں
ساز کے تاروں پہ ایسا کوئی نغمہ ڈھونڈیے

زندگی کا قرض تو آخر چکانا ہے سروشؔ
جان و دل اس کے ہیں، کوئی اور تحفہ ڈھونڈیے

(۱۰ر دسمبر ۱۹۹۴ء)

○

زمین ہے نہ آسماں ، مکان ہے نہ لامکاں
نظر نظر غبار ہے ، یہاں میں آ گیا کہاں
وہ آسمانِ حسن ہیں ، میں خاکِ پائے عاشقاں
اُڑائے وقت بھی اگر ، پہنچ نہ پاؤں گا وہاں
اُٹھا یہ پردۂ خرد ، مجھے کبھی نظر بھی آ
نہیں ہے کوئی فاصلہ جو تیرے میرے درمیاں
پتنگ کٹ کے جس طرح کسی کی چھت پہ آ گرے
تمھارے در پہ آ گیا ہوں اس طرح میں ناگہاں
وہ زندگی کی بھیڑ میں ہے ایک عام آدمی
نہ جانے لکھ رہا ہے کیوں سروش اپنی داستاں

(۳رفروری ۱۹۹۵ء)

○

مرے دل میں خودی کا پاس رکھ دے
نہیں مجبور ، یہ احساس رکھ دے
فرشتوں کو ترے جنت مبارک
مرے حصے میں تو بن باس رکھ دے
اندھیرا بخش پر اتنا کرم کر!
نظر میں روشنی کی آس رکھ دے
تو میرے ضبط کا بھی امتحاں لے
ندی کے پاس میری پیاس رکھ دے
بہار آئی ہے، کھل اُٹھے گا سب کچھ
یہ کانٹے بھی گلوں کے پاس رکھ دے
صراحی ، جام ، مینا ، زہر ، تریاق
یہ سب کچھ آج میرے پاس رکھ دے
یہ چوبِ نے جگا سکتی ہے جادو
کوئی اس میں مرے انفاس رکھ دے
مصوّر! ہاں مری تصویر ہے یہ
پر اس کا نام 'غم کی پیاس' رکھ دے
محبت میں نئی لذّت کی خاطر
رقابت کا بھی کچھ احساس رکھ دے

(۱۶رمارچ ۱۹۹۵ء)

○

کتنا سوچے ، کتنا لکھے ، کتنا گائے اِک شاعر
کب تک تنہائی کے بھنور کو ناچ نچائے اِک شاعر

اندر اِک طوفان بپا ہے لیکن باہر خاموشی
غم کو چھپا کر دنیاداری خوب نبھائے اِک شاعر

سب کے سکھ سپنوں کو سجائے سب کے دکھ کو اپنائے
سب کی آگ بجھائے ، اپنے دل کو جلائے اِک شاعر

ہے وہ بہاروں کا پروردہ ، خوشبو کا دیوانہ ہے
کب تک کاغذ کے پھولوں سے دل بہلائے اِک شاعر

محفل محفل نغمے گائے مستی کے ساغر چھلکائے
تنہائی میں چپکے چپکے اشک بہائے اِک شاعر

بستی بستی ہنگامے ہیں ، کون سنے ہے اس کی بات
اپنے من کے ورنداون میں راس رچائے اِک شاعر

غور کرو تو کوئی نہیں ، انساں خود اپنا دشمن ہے
انجانے میں اپنے دل پر تیر چلائے اِک شاعر

(۲۲/اپریل ۱۹۹۵ء)

○

کیسی بہار آئی گلشن میں ہر اِک سمت اُڑاتی دُھول
اِک اِک کر کے ٹوٹ رہے ہیں سارے پتے، کلیاں پھول
اِک اِک سانس انمول ہے بھائی اس کی قدر و قیمت جان
خود اپنے سانسوں سے بغاوت! کبھی نہ کرنا ایسی بھول
وقت فسانہ خود لکھے گا کل میری بربادی کا
تند ہوا کی زد پر ہوں میں، اپنے چمن کا آخری پھول
گھر سے باہر جھانک کے دیکھو، آنگن آنگن پھول کھلے
پربت پربت، جنگل جنگل بکھری ہے سونے کی دھول
لفظوں کی تکرار سے گھر میں لگ جاتی ہے آگ سروشؔ
چھوٹی چھوٹی باتوں کو ہم کیوں دیتے ہیں اتنا طول

(۱۸؍ مئی ۱۹۹۵ء)

○

زندگی! سامنے بچپن کے فسانے رکھ دے
ایک مٹی کا دِیا میرے سرہانے رکھ دے

جا چکی جن سے محبت کی، وفا کی خوشبو
طاقِ نسیاں میں وہ مکتوب پرانے رکھ دے

تو جو چاہے تو مٹا دے مری دنیا کو، مگر
پہلے آنکھوں میں مری خواب سہانے رکھ دے

ہاتھ لگنے سے تو ہو جائیں گے میلے یہ ورق
دل کے تہہ خانے میں یادوں کے خزانے رکھ دے

زندگی کا کوئی مصرف تو ہوا ے ربِ کریم!
میری سانسوں میں محبت کے ترانے رکھ دے

شیخ! اللہ نہ لے نام خدا گن گن کر
ذکر کرنا ہے تو تسبیح کے دانے رکھ دے

وقت ہر لمحہ نئی فصل اُگاتا ہے سروشؔ
تو بھی گا راگ نیا، ساز پرانے رکھ دے

(۱۶؍ جون ۱۹۹۵ء)

○

مجھے ملال نہیں ہے اگر میں تنہا ہوں
میں آنسوؤں کے سمندر میں اِک جزیرہ ہوں

میں تجھ سے ہو کے جدا کب سکون سے بیٹھا
بھٹک رہا ہوں کہ جیسے غبارِ صحرا ہوں

یہ جلتے بجھتے شب و روز ہم رکاب مرے
ازل سے گردشِ دوراں کے ساتھ کھیلا ہوں

یہ چاند تاروں کی بستی بہت پرانی ہے
تلاشِ یار میں سو بار ادھر سے گزرا ہوں

طلسمِ ذات ابھی تک ہے تشنۂ اظہار
جو لب پہ آئے نہ شاید کبھی، وہ نغمہ ہوں

(۲۷؍جولائی ۱۹۹۵ء)

○

خبر نہ تھی، ہے امانت یہ دولتِ نایاب
نفس نفس مجھے دینا ہے زندگی کا حساب

تمام عمر کی جہد و عمل کا یہ حاصل!
بس ایک موجِ تبسم، بس ایک دشتِ سراب!

رباب دل کا پھر ایک بار جھنجنا اُٹھا
یہ لہر درد کی ہے دل کے واسطے مضراب

فضا میں گونج کے میری صدا پلٹ آئی
مرے سوال کا شاید نہیں ہے کوئی جواب

یہ آنسوؤں کے خزانے سنبھال کر رکھو
ابھی زمین کی قسمت میں ہیں بہت سے عذاب

پھٹے پھٹے سے ورق ہیں مٹی مٹی تحریر
نہ پڑھ سکے گا کوئی میری زندگی کی کتاب

سروشؔ علم کا دریا ہے یہ بجھا لو پیاس
ہوئے تھے حافظؔ و اقبالؔ بھی یہیں سیراب

(۱۱؍اگست ۱۹۹۵ء)

○

سلسلہ ٹوٹتے سانسوں کا جو باقی ہے ابھی
آگ احساس کے سینے میں سلگتی ہے ابھی

میری مشتاق نگاہوں نے سرِ بزمِ بہار
اِک غزل چاندسی پیشانی پہ لکھی ہے ابھی

نور کا جسم تھا پہنے ہوئے خوشبو کا لباس
نازنیں کون مرے پاس سے گزری ہے ابھی

جانے وہ کون تھا کل جس سے ملایا تھا ہاتھ
میرے ہاتھوں میں نشہ لمس کا باقی ہے ابھی

(۱۷/اگست ۱۹۹۵ء)

○

کچھ نہ تھا موجود پہلے، ناگہاں لکھی گئی
نور کے اوراق پر اِک کہکشاں لکھی گئی

کتنا مبہم تھا وہ پہلا حرف جو تم نے لکھا
شرح پھر جس کی سرِ آبِ رواں لکھی گئی

آدمِ خاکی ہوا اعمال کا اپنے شکار
اور ہر آفت بہ نامِ آسماں لکھی گئی

ہم نے اپنا خون چھڑکا تھا گلستاں میں مگر
نامِ : کے بہارِ گلستاں لکھی گئی

بزم میں جب تک رہے کوئی نہ تھا پُرسانِ حال
اُٹھ گئے جب ہم، ہماری داستاں لکھی گئی

معجزہ تھا یہ کہ اِک اِک لفظ روشن ہوگیا
شعر میں جس دم حدیثِ دلبراں لکھی گئی

پھول، تارے، لعل وگوہر، سب تھے ناکافی سروشؔ
آنسوؤں سے زندگی کی داستاں لکھی گئی

(۲۶/اکتوبر ۱۹۹۵ء)

○

میرے کمرے کی ہر اِک چیز سجا کر رکھنا
اس کو آتا ہے مجھے اپنا بنا کر رکھنا
دشت تو دشت ہیں کل شہر بھی ویراں ہوں گے
اپنی آنکھوں میں حسیں خواب سجا کر رکھنا
دل کے گلشن میں خزاں آتی ہے بے موسم بھی
درد کے پھول بھی سینے میں کھلا کر رکھنا
کہیں دلدل، کہیں پتھر، کہیں تپتی ہوئی ریت
جس طرف چلنا پڑے پاؤں جما کر رکھنا
فکرِ آزاد کے پیکر ترے اشعار سروشؔ
ان کو اربابِ سیاست سے بچا کر رکھنا

(۵ردسمبر ۱۹۹۵ء)

○

بہت قریب ہو تم، پھر بھی فاصلہ سا ہے
ہمارے بیچ یہ کیسا عجیب رشتہ ہے
بھٹک رہا ہوں مہ و سال کے اندھیروں میں
ہر اک سے پوچھ رہا ہوں، مرا پتہ کیا ہے
تمھاری یاد سے بھی ہو گیا ہے بیگانہ
کبھی کبھی تو یہ عالم بھی دل پہ گزرا ہے
توہمات کی دنیا میں آ گئے ہیں ہم
چراغِ فکر جلاؤ، بہت اندھیرا ہے
مری اُڑان کے رستے میں آ گیا ہے سروشؔ
یہ آسمان پرندوں نے جس کو گھیرا ہے

(۲۰ رجنوری ۱۹۹۶ء)

○

خرد کی سرکشی ٹھہری ، جنوں کا بانکپن ٹھہرا
جیے جس طرح دیوانے وہ دنیا کا چلن ٹھہرا
ازل سے کاروانِ شوق ہے آوارۂ منزل
جہاں یہ کارواں رُکتا گیا ، نقشِ وطن ٹھہرا
ہوائے مصلحت نے ساری شمعوں کو بجھا ڈالا
اگر ٹھہرا اس آندھی میں ، چراغِ علم وفن ٹھہرا
ستارے تیرگی سے رات بھر لڑتے رہے لیکن
اُجالا روزِ روشن کا ، ستاروں کا کفن ٹھہرا
زباں کٹتی ہے یاں سچ بولنے پر اہلِ دانش کی
سروشؔ اس دور میں لکھنا جہادِ علم وفن ٹھہرا

(۹ر فروری ۱۹۹۶ء)

○

(نذرِ غالبؔ)

اے قلبِ حزیں یورشِ آلام بہت ہے
کس طرح ہنسیں شورشِ ایام بہت ہے

ساقی تری اس بات پہ کہرام بہت ہے
اپنوں کو پلاتا ہے یہ الزام بہت ہے

کیا بات ہے مل جائے جو اُن کے لبوں سے
ورنہ تو مجھے لذّتِ دشنام بہت ہے

کیا تجھ کو نہیں پاس مری تشنہ لبی کا
مینا میں تری بادۂ گلفام بہت ہے

مسجود کی اب تک متلاشی ہیں نگاہیں
یوں دل میں مرے مجمعِ اصنام بہت ہے

مشکل ہے تو خودداری کی ، اس شہرِ ہوس میں
بک جایئے تو بارشِ اکرام بہت ہے

یہ قربتِ غالبؔ کی فضا ، ابرِ بہاراں
مل جائے اگر دُردِ تہہِ جام بہت ہے

(۱۵ر فروری ۱۹۹۶ء)

○

جد و جہد، کشمکش، خواب اور شکستِ خواب
موت کی خبر نہیں، زندگی ہے اِک عذاب
نام، شہرتِ دوام، اِک فریب اِک سراب
بحرِ بے کراں ہے دہر، آدمی ہے اِک حباب
حسنِ کائنات ہے سر بہ سر حجاب میں
یہ زمیں کی رونقیں! اُٹھ گیا ہے اِک نقاب
برگِ گل کے لب پہ ہے گلستاں کی داستاں
دیکھیے جو غور سے، ہر ورق ہے اِک کتاب
ساز ہیں الگ الگ، روحِ نغمہ ایک ہے
ایک ہے سب کی صدا، چھیڑیئے کوئی رباب

(۲۹؍مارچ ۱۹۹۶ء)

○

نہ زمیں ہے یہ میری زمیں، نہ یہ آسماں مرا آسماں
یہ نہ جانے کس کا دیار ہے کہ فضا فضا ہے دُھواں دُھواں
مری ذات خاک سے ہے مگر، رمِ جستجو مرے بال و پر
مرے نقشِ پائے وجود ہیں تہہِ بحر و بر، سرِ کہکشاں
میں تمام عمر چلا مگر، وہی دوریاں، وہی فاصلے
میں ٹھہر گیا سرِ رہگذر نہ کہیں ملا جو ترا نشاں
کہو رہ روانِ رہِ خرد! کوئی سانحہ! کوئی حادثہ!!
کہ بجھی بجھی سی ہیں مشعلیں، کہ لٹا لٹا سا ہے کارواں
وہ سمومِ فصلِ جنوں چلی، وہ بگولے رقص میں آ گئے
میں اسیرِ کنجِ خرد مگر، کوئی کاٹ دے مری بیڑیاں
وہی زندگی کے معاملے، وہی حسن و عشق کے سلسلے
مگر اپنا اپنا بیانِ غم، نئے تجربوں کی نئی زباں
نہ جلال ہے نہ جمال ہے، نہ فراق ہے نہ وصال ہے
میں سروشؔ کب سے بھٹک رہا ہوں خیال و خواب کے درمیاں

(۱۸؍اپریل ۱۹۹۶ء)

○

یادوں کے پھول ، درد کے نغمات لے چلیں
خلوت سے ان کی ، پیار کی سوغات لے چلیں
شاید یقیں نہ آئے انھیں دل کی بات کا
ساتھ اپنے انتظار کے لمحات لے چلیں
چل تو پڑا ہوں ، سمتِ سفر کی خبر نہیں
کیا جانے کس طرف مجھے حالات لے چلیں
یہ مصلحت کا دور ، یہ کہرام وقت کا
آؤ بچا کے عزتِ سادات لے چلیں
کیا جانے کن جہانوں کا درپیش ہو سفر
کچھ دُور تک تو اپنی روایات لے چلیں
کل کو اندھیری رات میں مشعل جو بن سکیں
تاریخ سے وہ حرف و حکایت لے چلیں
جانا ٹھہر گیا ہے کڑی دُھوپ میں سروشؔ
زلفوں کی چھاؤں، نغموں کی برسات لے چلیں

(۱۹؍جون ۱۹۹۶ء)

○

رائیگاں رائیگاں زندگی آج بھی　　ناتواں ناتواں آدمی آج بھی
سائباں سائباں تیرگی آج بھی　　کہکشاں کہکشاں روشنی آج بھی
واقعیت سے ہیں دور لفظ و بیاں　　داستاں داستاں ساحری آج بھی
شور و غوغائے لایعنیت ہر طرف　　بے زباں بے زباں آگہی آج بھی
جبر و قہر و ستم شیوۂ زرگری
بے اماں بے اماں مفلسی آج بھی

(۱۰؍دسمبر ۱۹۹۶ء)

○

نظم، غزل، منظوم ڈرامے، جانے کیا کیا لکھوں میں
لفظوں کے پردے میں اپنا درد چھپانا چاہوں میں

چاند بھی اپنی کشتی لے کر دُور اُفق سے جا پہنچا
رات نے بھی پلکیں جھپکائیں، آخر کب تک جاگوں میں

یہ نقطے، بے جان لکیریں، آڑی ترچھی، بے ترتیب
اپنے اندر سوئے انساں کی تصویر بنانا بناتا ہوں میں

ہر مضمون پُرانا ٹھہرا تیری گھنی پلکوں کے سوا
کب سے سوچ رہا ہوں بیٹھا، لکھوں تو کیا لکھوں میں

راہ کے کانٹے چنتے چنتے پاؤں ہوئے گھائل لیکن
وقت کی پگڈنڈی پر دھیرے دھیرے بڑھتا جاؤں میں

ٹوٹ کے بکھرے نیلے تارے، پیلا سورج، کالا چاند
کلجگ کی تصویر نہ ہو یہ! کیسے سپنے دیکھوں میں!

یہ جو فرشتہ صورت مجرم آج کٹہرے میں ہیں سروشؔ
سب ہیں ظالم، سب ہیں قاتل، کس کس کو پہچانوں میں

(۱۳؍دسمبر ۱۹۹۶ء)

○

سر سے پا تک درد کی زنجیر سے جکڑا ہوا میں
ریزہ ریزہ سانس کی شمشیر سے کٹتا ہوا میں

ڈر رہا ہوں روشنی کی ہر کرن، ہر زاویے سے
نیلگوں پرچھائیوں کی شال میں لپٹا ہوا میں

کب تلک اُڑتا رہوں گا دوش پر موجِ ہوا کے
فصلِ گل میں زرد پتہ شاخ سے ٹوٹا ہوا میں

کل مری پرواز کے لائق نہ تھا کیوں آسماں بھی
سوچتا ہوں آج اپنے آپ میں سمٹا ہوا میں

(۱۵رجنوری ۱۹۹۷ء)

○

رات کی خاموش وادی، غم کا دریا اور میں
پے بہ پے اُٹھتے بگولے، دل کا صحرا اور میں

ٹوٹتی پرچھائیاں، بنتے بگڑتے زاویے
ایک مبہم سا خیالِ صبحِ فردا اور میں

گر رہی ہے برف لیکن آگ روشن ہے ابھی
آرزو کا ایک ننھا سا شرارہ اور میں

شام جب محفل سجی، کیا مجمعِ اصنام تھا
آخرِ شب ڈوبتا سا اِک ستارہ اور میں

اب تو سب کچھ لٹ چکا ہے، کیا بچا اس کے سوا
سازِ دل پر کربِ تنہائی کا نغمہ اور میں

(۲۵رمئی ۱۹۹۷ء)

○

لفظوں نے پلکیں جھپکائیں معنی بھی معدوم ہوئے
لیکن پُراسرار فضا میں شعر حسیں معلوم ہوئے
خاک کے ذرّے تپتے تپتے کندن بن کر چمکے ہیں
دل سے خدمت کرنے والے خادم تھے مخدوم ہوئے
ان کے در سے خود کو اُٹھا لائے تھے ہم کس عالم میں
ان سے بچھڑ کر دنیا کی ہر نعمت سے محروم ہوئے
ذکر چھڑا جب اہلِ وفا کی رُسوائی ، بربادی کا
محفل کی آنکھیں بھر آئیں ، ہم بھی بہت مغموم ہوئے
دیکھو تو اس طغیانی میں غرق ہوا ہے کون سروشؔ
لہر لہر بیتابیِ دل کے افسانے مرقوم ہوئے

(۲۴ر جون ۱۹۹۷ء)

○

دولت ، نہ ملک و مال ، نہ شان و وقار دے
میں تیرا بن سکوں مجھے یہ افتخار دے
تم سے کوئی سوال نہیں حاکمانِ وقت
میں جو بھی چاہوں وہ مجھے پروردگار دے
خاموش رہ کے میں نے گزاری تمام رات
اب تو لبوں کو نغمۂ صبحِ بہار دے
ہے بیقرار جس کے لیے روحِ شاعری
یارب وہ شعر تو مرے دل پر اُتار دے
عمرِ عزیز جیسی کٹی ، کٹ گئی سروشؔ
باقی جو ہے وہ اس کی طلب میں گزار دے

○

پتھر، سبزہ، ریت اور ٹیلے، میرے سفر کے ساتھی ہیں
جنگل کے سارے نظارے میرے سفر کے ساتھی ہیں

بنجر دھرتی کے سینے میں نئی نئی فصلوں کے خواب
کیسے کیسے میٹھے سپنے میرے سفر کے ساتھی ہیں

جتنے کھنڈر ہیں، گھور رہے ہیں پتھرائی سی آنکھوں سے
ماضی کی عظمت کے قصّے میرے سفر کے ساتھی ہیں

ایسا لگتا ہے صدیوں سے میں ہوں سفر میں ہر لمحہ
اور اُجالے تہذیبوں کے میرے سفر کے ساتھی ہیں

دن اور رات کے وصل کا لمحہ، رنگوں کی بارات سجی
گھلتے ملتے رنگ اُفق کے میرے سفر کے ساتھی ہیں

آنکھ مچولی کھیل رہا ہے بادل سے چھپ چھپ کر چاند
دُور خلاؤں کے سیارے میرے سفر کے ساتھی ہیں

جبر ہے یہ جیون کا سفر بھی جس کو طے کرنا ہے سروشؔ
دوست اور دشمن اپنے پرائے میرے سفر کے ساتھی ہیں

○

دن ڈھل گیا فراق کا، بکھرا غبارِ شب
شاید کہ بے نقاب ہو میرا نگارِ شب
سورج ہزار آئے مگر تیرگی رہی
کھینچا ہے میرے گرد یہ کس نے حصارِ شب
اب جن کے نام تک بھی نہیں جانتا کوئی
تاریخ کا غرور تھے وہ تاجدارِ شب
ہم بحرِ زندگی میں یہاں تک تو آگئے
منہ دھو رہی ہے صبح کی دیوی کنارِ شب
بجھنے نہ پائے مشعلِ امید اے سروشؔ
منزل ہے دُور، راہ میں ہے خارزارِ شب

(۲۸؍اکتوبر ۱۹۹۷ء)

○

ہر مسافر کی الگ رفتار ہے
کارواں بے قافلہ سالار ہے
جو سفینوں کو ڈبوتا ہے سدا
پھر اسی کے ہاتھ میں پتوار ہے
بے یقیں، بے حسی، بیگانگی
آج کا انساں بہت بیمار ہے
کٹ رہا ہے لمحہ لمحہ عمر کا
ہر نفس چلتی ہوئی تلوار ہے
ہے کہیں کوہِ گراں پہ آدمی
اور کہیں گرتی ہوئی دیوار ہے
ہیچ ہیں تاج وکلاہ وتخت وتاج
مجھ کو حاصل فقر کی دستار ہے
بک رہے ہیں کتنے یوسف اے سروشؔ
شہرِ دلّی مصر کا بازار ہے

(۲۴؍جنوری ۱۹۹۸ء)

آزاد غزل

اے شبیہِ شامِ تنہائی سلام
سرمئی ہونٹوں پہ تیرے کس نے لکھا میرا نام
کچھ نظر آتا نہیں، احباب ہیں یا محتسب ہیں یا رقیب
ہے نگاہوں میں مری پرچھائیوں کا اژدہام
بھولتا جاتا ہوں اس کی شکل بھی،
ہر گھڑی وردِ زباں رہتا تھا جس انساں کا نام
جانے کیا دُھن ہے، ستاروں سے بھرے آکاش میں
ڈھونڈتا رہتا ہوں میں اپنا مقام
منزلیں ملتی ہیں ان کو جو رہیں ثابت قدم
ورنہ دیکھے ہیں ہزاروں تیز گام
میں ازل سے آسمانِ فکر و فن کا گم شدہ سیارہ ہوں
جانے کس سورج سے رشتہ ہے کہ چلنا ہے مدام
ایک ہی تسبیح کے دانے ہیں سب
شہریار و حامدی و رفعت و مظہر امام

(یکم فروری ۱۹۹۸ء)

○

حاکمِ شہر ہے بانیٔ فساد
کس سے اب کیجئے جا کر فریاد

زندگی قصرِ حسین ہے ایسا
بہتے پانی پہ ہو جس کی بنیاد

بستیاں فکر و نظر کی ویراں
شہر ہیں بے ہنروں کے آباد

کھیتیاں سوکھ گئیں خوابوں کی
کھل نہ پائے کبھی گلہائے مراد

لب پہ آتا ہی نہیں حرفِ طلب
دل میں اِک شہرِ تمنّا آباد

سایہ سایہ سی ہیں کچھ تصویریں
کمرے کمرے میں خراماں تری یاد

حرف حرف اِک نئی تصویر سروشؔ
میں ہوں دنیا کے سخن کا بہزاد

(۹؍فروری ۱۹۹۸ء)

○

غزل خیال کے پردے میں مسکراتی ہے
پہن کے پیرہنِ حرف گنگناتی ہے

کوئی تو بات ہے اس خاکداں کے ذرّوں میں
بگڑ بگڑ کے جو دنیا سنورتی جاتی ہے

ترے خیال کی وادی سے جب گزرتا ہوں
تری مہک سی فضاؤں میں سرسراتی ہے

ترے جمال کی انگڑائیوں کا ہے پیکر
بہار دشت و دمن میں جو گل کھلاتی ہے

یہ اور بات کہ دل کی کلی نہیں کھلتی
سنا ہے اب بھی چمن میں بہار آتی ہے

یہ روشنی کے ورق چن سکے تو چن لے کوئی
کہ شمع لمحہ بہ لمحہ پگھلتی جاتی ہے

تری غزل میں یہ سوز و گداز کب تھا سروشؔ
غموں کی آنچ میں تپ کر نکھرتی جاتی ہے

(۱۴؍فروری ۱۹۹۸ء)

○

یہ دنیا آنی جانی ہے ، کوئی دائم نہیں رہتا
سدا خوشیاں نہیں رہتیں ، ہمیشہ غم نہیں رہتا

لہو کو گرم رکھتی ہے مسائل کی گراں باری
دلِ مردہ اسے کہیے کہ جس میں غم نہیں رہتا

یہی بستی ہے جس کے ہر گلی کوچے سے نسبت تھی
مگر اب یاں کوئی ہمدم ، کوئی محرم نہیں رہتا

نکل اب اپنے مسکن سے ، مقدر ہے ترا ہجرت
کہ دریا اپنے مخرج پر کبھی قائم نہیں رہتا

بدلتی رہتی ہیں قدریں ، بدل جاتی ہیں تہذیبیں
زمانہ ایک مسلک پر سدا قائم نہیں رہتا

زبانیں ارتقا کی منزلوں سے جب گزرتی ہیں
بہت سے لفظ کٹ جاتے ہیں جن میں دم نہیں رہتا

سروشؔ آخر یہاں کس کس کے در پر دستکیں دو گے
یہاں اغیار بستے ہیں ، کوئی محرم نہیں رہتا

(۱۳ر مارچ ۱۹۹۸ء)

○

افسانۂ خرد ہے نہ ہنگامۂ جنوں
کیوں جی رہا ہوں پھر بھی! اسی کشمکش میں ہوں

ظاہر ہوا ہوں آج عناصر کے رُوپ میں
لوحِ ازل پہ لکھا ہوا ایک لفظ ہوں

اے آندھیو! بتاؤ قدم کس طرف بڑھاؤں
اس دشتِ بے اماں میں کہاں تک کھڑا رہوں

مل جائے گا سروشؔ مجھے زیست کا جواز
اِک لمحہ بھی جو ساتھ میں اس کے گزار لوں

○

نشانِ منزل، نہ راستہ ہے — قدم بڑھانے کا حوصلہ ہے
سنا ہے سب کچھ ہے اتفاقی — یہ زندگی ایک حادثہ ہے
کرو نہ سود و زیاں کی باتیں — یہ اہلِ دل کا معاملہ ہے
ہم اِک ندی کے ہیں دو کنارے — ملیں تو کیسے! یہ مرحلہ ہے
تمھاری باتوں میں ہے صداقت — مگر ذرا تلخ ذائقہ ہے
رواں ابھی وادیٔ سخن میں — مری صداؤں کا قافلہ ہے
سروشؔ میرا جدید لہجہ
روایتوں کا ہی سلسلہ ہے

(۲۳ر مارچ ۱۹۹۸ء)

گُم ہوتا ہوا آسمان

میں شامل غزلیں

ناشر
نورنگ کتاب گھر، نوئیڈا

بہ اہتمام: نرالی دُنیا پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی

اشاعت:
۲۰۰۳ء

○

یہ زمیں حسین و دلکش مگر آسماں کی زد میں
کہ ستارے اس کے دُشمن رہے بغض اور حسد میں

کسے فکر دوسرے کی، ہیں سبھی غرض کے بندے
یہ ہے دورِ کم نگاہی، نہیں فرق نیک و بد میں

ہے یہ ایک باغ لیکن کئی تختہ ہائے گُل ہیں
ہے بہار کا تقاضا رہیں اپنی اپنی حد میں

میں ازل سے چل رہا ہوں کوئی ہمسفر نہ رہبر
میں سروشؔ کھو گیا ہوں رہِ منزلِ ابد میں

(۱۰ر مئی ۱۹۹۸ء)

○

ٹکڑے کر کے پھینک دیا خط اُس نے سمجھ کر میلا کاغذ
حرف حرف میں دل ہے میرا چن لوں پرزا پرزا کاغذ

اس میں بسی ہیں اس کے سانسیں، اس کے حنائی لمس کی خوشبو
بادِ صبا تو لائی کہاں سے ، یہ البیلا ، کورا کاغذ

یادیں دُھندلے سپنوں جیسی مٹ جاتی ہیں دل کے ورق سے
کبھی کبھی ایسا لگتا ہے ذہن ہے گویا سادا کاغذ

خط لکھنے کو قلم اُٹھایا ، آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بھول گیا سب کیا لکھنا تھا ، ہاتھوں میں ہے گیلا کاغذ

یہ اُس کی تحریر ہے جس نے سحر جگایا تھا لفظوں کا
کتنی بار پڑھا ہے پھر بھی ، تازہ ہے بوسیدا کاغذ

جانے کتنے دُکھ کے موسم ، جانے کتنے غم ہیں مجھ میں
آنکھیں بن گئیں ساون بھادوں، جب بھی نچوڑا من کا کاغذ

یہ نہ سمجھنا سروشؔ تمھاری تلخ نوائی بھول گیا ہے
اک اک لفظ لکھا ہے دل پر، کس کا قلم اور کیسا کاغذ

(۱۱ر ستمبر ۱۹۹۸ء)

○

ہر بزم ہے بزمِ اہلِ خرد، ہر شہر ہے شہرِ تنہائی
اِک طُرفہ تماشہ ہے گویا تہذیبِ نو کی رعنائی

یہ شور و شغب کے سنّاٹے مدفن نغماتِ بہاراں کے
آوازوں کے اس محشر میں کب عقل کو تابِ گویائی

حسّاس اندھیروں کے دل میں ہے ایک کسک، ہے ایک تڑپ
کب رات کا بندھن ٹوٹے گا، لے گی صبحِ نو انگڑائی

پہلے تو تری رفتار میں کچھ شوخی تھی یہ پندار نہ تھا
اے بادِ صبا سچ سچ کہنا، کس کے انداز اُڑا لائی

رہ رہ کے کوئی کھڑکاتا ہے زنجیر مرے دروازے کی
اے رُوح ٹھہر، ٹک دیکھ تو لوں، یہ کس کو میری یاد آئی

کیا شانِ عروج ہے، اُس کی طرف اب آنکھ اُٹھانا مشکل ہے
وہ وقت بھی تھا جب سورج نے ہر در پہ کی تھی جبیں سائی

ماضی کے کھنڈر ہیں یا رفعتؔ عظمت کے فسانوں کی دُنیا
منظر منظر عبرت کا سبق، انجامِ شکوہِ دارائی

(۶/ اکتوبر ۱۹۹۸ء)

○

بے خودی کا یہ عالم ، یہ خمار کا موسم لوٹ کر نہ آئے گا پھر بہار کا موسم
اُڑتے پنچھی وعدوں کے چہچہاتے پھرتے ہیں آس کا نشیمن ہے انتظار کا موسم
شبنمی دُھند لکے میں آبدیدہ ہیں غنچے یہ خزاں کا پرتو ہے یا بہار کا موسم
دشت میں بگولے ہیں کشتیاں رواں جیسے ہے سراب کی دُنیا ریگ زار کا موسم
برف کی ردا اوڑھے سو رہی ہے خاموشی
دائمی سکوں جیسا کوہسار کا موسم (۲۰ر ستمبر ۱۹۹۸ء)

○

خیال و خواب کی دُنیا نئی سجاتا ہوں
نئی زمین ، نیا آسماں بناتا ہوں
تراشتا ہوں صنم یا میں کہہ رہا ہوں شعر
جمالِ یار کی تجسیم کرتا جاتا ہوں
زمین کروٹیں لیتی ہے بے قراری میں
میں روز و شب کے نئے زاویے بناتا ہوں
پرانی بستی کے دیوار و در شکستہ سہی
میں اُن کے سائے میں کتنا سکون پاتا ہوں
میں اپنے دَور کا سورج تو بن نہیں پاتا
چراغِ شب ہوں اندھیرے میں جھلملاتا ہوں
کبھی تو وادیٔ وحشت سے کوئی گزرے گا
میں اپنے نقشِ قدم ثبت کرتا جاتا ہوں
سروشؔ خاک سے رشتہ کبھی نہ ٹوٹے گا
کہ مٹتا جاتا ہوں اور پھر سنورتا جاتا ہوں (۲۳ر دسمبر ۱۹۹۸ء)

○

تصوّرات کے لمحاتِ خوش جمال کی رات
تمام ہونے کو ہے حسرتِ وصال کی رات

وہ کیسے دائرۂ غم کی زُلف سلجھائے
جسے ملی ہو ازل سے فقط ملال کی رات

کسی کی یاد کو دل سے لگائے بیٹھا ہوں
بہت طویل ہے ہجرت کے ماہ و سال کی رات

اُٹھاؤ ہاتھ مری دوستی سے چارہ گرو
کہ آ گئی مرے زخموں کے اندمال کی رات

یہ جبر و قہر کا عالم، دُھواں دُھواں ہے فضا
زمیں پہ کب سے مسلط ہے یہ وبال کی رات

اُداس اُداس ہیں نسلیں نئے زمانے کی
نہ جانے کیسے کٹے گی یہ اضمحلال کی رات

سروشؔ رہتا ہے ہر ایک حال میں مسرور
وہ دن عروج کے ہوں یا وہ ہو زوال کی رات

(۲۵ر دسمبر ۱۹۹۸ء)

○

ہر ایک طاقِ تخیل میں آگہی کے چراغ
چراغِ فن سے جلائیں سخنوری کے چراغ

یہ رہبروں کی نئی ٹولیاں! خدا کی پناہ
جو رکھتی پھرتی ہیں راہوں میں گمرہی کے چراغ

نہ عید ہوتی ہے ہر روز اور نہ دیوالی
ہمارے دل میں ہیں خوشیاں کبھی کبھی کے چراغ

عداوتوں کے بھنور سے نکل کے دیکھو تو
ہر ایک موڑ پہ رکھے ہیں روشنی کے چراغ

وہ آئیں شوق سے نفرت کی آندھیاں لے کر
ہمارے ہاتھ میں ہیں امن و آشتی کے چراغ

گزر رہی ہے صدی، وقت کی منڈیروں پر
سجا کے حکمت و دانش کے، آگہی کے چراغ

سروشؔ صحنِ چمن میں اُگائیں ایسے شجر
کہ جن کی شاخوں پہ کھلتے ہوں روشنی کے چراغ

(۳۱ر دسمبر ۱۹۹۸ء)

○

حرف و طرزِ بیاں کو جدّت دے　　میرے افکار کو صداقت دے
دل میں اُٹھتے ہیں سینکڑوں طوفاں　　میرے جذبات کو عبارت دے
تیری نسبت سے نام ہو میرا　　ایسی عزّت دے ایسی شہرت دے
بھول جاؤں میں سب عذاب و ثواب　　ایک لمحے کو اپنی قربت دے
ہر طرف سے سمیٹ لوں خود کو　　کم سے کم مجھ کو اتنی مہلت دے
وحشتیں درد کا علاج نہیں　　آدمی کو تو آدمیت دے

آج سے کل حسین ہوگا سروشؔ
بے نواؤں کو یہ بشارت دے

(۱۵ر جنوری ۱۹۹۹ء)

○

صداقت ہو محبّت میں تو اِک لمحہ غنیمت ہے
اگر دل سے ادا ہو جائے اِک سجدہ غنیمت ہے
بہار آئی ہے گلشن میں، ہزاروں پھول کھلتے ہیں
چمن کا نام ہو جس سے وہ اِک غنچہ غنیمت ہے
ہزار آتش فشاں بھڑکیں، فضا میں آگ برسائیں
جلا دے قصرِ باطل کو وہ اِک شعلہ غنیمت ہے
سنا ہے آسماں در آسماں سورج دہکتے ہیں
کرے جو رُوح کو روشن وہ اِک جلوہ غنیمت ہے
سرِ بازارِ حسنِ شعلہ ساماں کی فراوانی
مگر گھر میں سروشؔ اِک پھول سا چہرہ غنیمت ہے

(۲۵ر جنوری ۱۹۹۹ء)

○

زندگی ہے حرف و نغمہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہو
بے ارادہ بے تمنا کچھ نہ کچھ لکھتے رہو

حرف کے پہلو میں اسرار و رموزِ کائنات
جانے کب ہوں آشکارا کچھ نہ کچھ لکھتے رہو

لفظ خود اپنے معانی کی بچھاتا ہے بساط
فرض ہے تخلیق کرنا کچھ نہ کچھ لکھتے رہو

ایک دل اور اُس میں جانے کتنی یادوں کا ہجوم
درد ہو جائے نہ گہرا کچھ نہ کچھ لکھتے رہو

اُن کے وعدے، اُن کی قسمیں، اُن کی باتیں اُن کا نام
دل تو ہو جائے گا ہلکا، کچھ نہ کچھ لکھتے رہو

کس نے کیا لکھا ہے کل خود فیصلہ ہو جائے گا
شعر، افسانہ، ڈراما کچھ نہ کچھ لکھتے رہو

آگ ٹھنڈی ہو چلی دل میں! غضب ہے اے سروشؔ
سرد ہو جائے نہ شعلا کچھ نہ کچھ لکھتے رہو

(۲۵ر فروری ۱۹۹۹ء)

○

بہار آئی چمن میں ، آ گیا برنائی کا موسم
کہیں کس سے ہمارے دل میں ہے تنہائی کا موسم
ہوا کے پیچ و خم ، کھلتے گلابوں سے لدی شاخیں
چمن میں آج چھایا ہے تری انگڑائی کا موسم
کوئی دستک ، کسی کا خط کسی کا فون کچھ تو ہو
بہت بے رنگ ہے اے دل مری تنہائی کا موسم
فضا میں قہقہوں کا رس ، مہک بیلا چمیلی کی
کہاں یہ بند کمرے اور کہاں انگنائی کا موسم
دریچے کھل گئے یادوں کے موجِ اشکبار آئی
مری تنہائی میں ہے انجمن آرائی کا موسم

(۲رمئی ۱۹۹۹ء)

○

کہنے کو چار آنسو تھے دِل کو ڈبو گئے
ہم رسم و راہِ شوق سے بیگانہ ہو گئے
بادل کسی کی یاد کے آئے تھے دو گھڑی
فرقت کی تیز دُھوپ کا آنچل بھگو گئے
کل رات موت گزری بہت ہی قریب سے
ارمان زندگی کے سبھی تھک کے سو گئے
مقصود ہے سفر تو نئی کشتیاں بناؤ
یہ ناخدا تو سارے سفینے ڈبو گئے
اب جانے کب تلک مری آنکھیں کھلی رہیں
تک تک کے اُن کی راہ ستارے تو سو گئے
یاد آ رہی ہیں لغزشِ بے جا کی لذتیں
ہم وضعِ احتیاط سے بے زار ہو گئے
اب کیا ، چلے نسیم کہ بادِ صبا سروشؔ
غنچے سب آرزو کے تو افسردہ ہو گئے

(۲رمئی ۱۹۹۹ء)

○

رفتار کی شوخی کو کیوں بادِ صبا لکھو
تنقید یہ کہتی ہے کچھ اور نیا لکھو
شعلوں کی لپک میں بھی الفاظ مچلتے ہیں
کرنوں میں اُنھیں گوندھو فطرت کی ثنا لکھو
اُجڑی ہوئی یہ بستی آباد نہ کیوں ہوگی
ویران منڈیروں کو تم دستِ دُعا لکھو
یہ جسم تو میرا ہے میں اُس میں نہیں لیکن
اس درد کے قالب کو زخموں کی قبا لکھو
شاید تمھیں مل جائے معنی کی نئی دُنیا
جو کچھ نہ کہا اب تک، جو کچھ نہ سنا، لکھو

(۳۰/اگست ۱۹۹۹ء)

○

تو لہر ہے تو تہہ بحر سے اُچھال مجھے — حصارِ آبِ غمِ ذات سے نکال مجھے
مرا مزاج بغاوت شعار حق گوئی — تو اپنے سانچے میں اے مصلحت نہ ڈھال مجھے
میں کون ہوں، یہ جہاں کیوں ہے؟ زندگی کیا ہے — جھنجھوڑتے رہے بچپن سے یہ سوال مجھے
یہ مصلحت ہے کہ ہے بندہ پروری تیری — عروج غیر کو بخشا گیا، زوال مجھے
ہزار عیب تو بخشے ہیں تیری رحمت نے — کوئی کمال بھی اے ربِّ ذوالجلال مجھے
میں رختِ جاں تو اُٹھا لایا اُس کی محفل سے — تمام عمر رہے گا مگر ملال مجھے
میں شعر ہوں تیری تصویرِ ذات کی تکمیل
سروشؔ ذہن کے زنداں سے تو نکال مجھے

(۲۲/اکتوبر ۱۹۹۹ء)

○

مرنے کی دُعا مانگے ، جینے کی ادا مانگے
تنگ آ گئے اس دل سے کیا جانئے کیا مانگے
پھولوں سے اسے نفرت کانٹوں سے اسے رغبت
ہے یہ کوئی دیوانہ ، زخموں کی قبا مانگے
انسان نے قناعت کی لذّت ہی نہیں جانی
جو کچھ بھی میسر ہے کچھ اس سے سوا مانگے
دل ایک گھروندا ہے احساس کے تنکوں کا
اِک شعلۂ رقصاں کی قربت کی فضا مانگے
کھل جائیں جہاں فصلیں اُلفت کے گلابوں کی
صحرا مرے خوابوں کا وہ آب و ہوا مانگے

(۱۹؍ اکتوبر ۱۹۹۹ء)

○

(نذرِ میر تقی میرؔ)

ایسا بھی کوئی جھونکا ویرانے میں آ جاوے
کلیوں کو کھلا جاوے پھولوں کو ہنسا جاوے
ہر روز نئی آفت ، ہر روز نیا فتنہ
دھیرے سے درِ دل کی زنجیر ہلا جاوے
اس آس میں ہی شب بھر دروازہ کھلا رکھا
شاید کوئی آ جاوے، شاید کوئی آ جاوے
حسرت ہے، اُمنگیں ہیں پژمردہ اُمیدیں ہیں
کس کس کو بھلا دل میں آباد کیا جاوے
تحریر بہت ہوں گے قصے مری وحشت کے
لیکن وہ فسانہ جو اشکوں سے لکھا جاوے!
اک لمحہ زمیں پر بھی کل پاؤں نہ پڑتے تھے
اور آج یہ عالم ہے رُک رُک کے چلا جاوے
غالبؔ کے حوالے سے یہ میرؔ کی محفل ہے
ہے رُعب سروشؔ ایسا کچھ بھی نہ کہا جاوے

(۴؍ دسمبر ۱۹۹۹ء، یومِ غالب کے موقع پر کہی گئی طرحی غزل)

○

آج پھر یاد کوئی جانِ سخن آوے ہے
نام اُس کا ہی فقط آج قلم لکھے ہے

مدتیں گزریں کہ اس راہ سے گزرا تھا کوئی
پھول کھلتے ہیں تو اُس کی ہی مہک آوے ہے

ہائے زندانیٔ غربت کی تہی دامانی
پھول تو پھول ہیں کانٹوں کے لیے ترسے ہے

بھائی بھائی سے گریزاں رہے ممکن ہے مگر
خون کا رشتہ ہے توڑے سے کہاں ٹوٹے ہے

جانے کس وقت کچل دے تجھے بے حال کرے
ہر قدم پھونک کے رکھنا کہ اجل پیچھے ہے

اب مجھے پاؤں کے چھالے نہیں چلنے دیتے
راہ دُشوار ہے منزل کو نظر ترسے ہے

جب تلک دل پہ نہ اُفتاد پڑے اپنے سروشؔ
آدمی درد کی لذّت کو کہاں سمجھے ہے

(۶ر دسمبر ۱۹۹۹ء)

○

ہوائے شوق ذرا اور سرسرا کے چل
کہ بے حسی کا ہے دل میں بہت گھنا جنگل

نہ جانے کیا ہوئیں وہ صورتیں کوئی تو بتائے
کہ مہر و ماہ جنھیں دیکھ کر ہوئے تھے خجل

نظر ملاؤ نہ مجھ سے، نظر نہ لگ جائے
تمھاری آنکھیں اور اس پر غضب سیہ کاجل

یہ طنطنے تو ہیں بہکی ہوئی جوانی کے
نکال دیتی ہے عمرِ عزیز سب کس بل

برسنے والی ہیں آنکھیں بھی اب کوئی دم میں
اُٹھے ہیں سینے میں پھر درد کے گھنے بادل

نہ جانے کون سی لغزش ہو موت کی تمہید
اجل ہے تاک میں، ہر موڑ پر سنبھل کے چل

کسی کی یاد کے پنچھی بھی اب نہیں آتے
سروشؔ کب سے ہے ویران آرزو کا محل

(۲۵ر جنوری ۲۰۰۰ء)

○

پھر بہار آئی ہے ہر خفتہ شجر جاگتا ہے
کونپلیں پھوٹی ہیں، فطرت کا ہنر جاگتا ہے

ایک تم ہو کہ نہیں لب پہ تبسّم کی رمق
سنگ و آہنگ کے بھی سینے میں شرر جاگتا ہے

کیسی بے چینی ہے بستر پہ جو لیٹے لیٹے
پاؤں میں پھر کوئی بے نام سفر جاگتا ہے

رات کی آنکھ بھی اِک پل کو نہیں جھپکی ہے
جانے کس خوف سے یہ سارا نگر جاگتا ہے

تم نہیں ہو تو یہاں قبر کا سناٹا ہے
گھر ہے خاموش، نہ کھڑکی ہے، نہ در جاگتا ہے

بے سبب شعر کہا جائے نہ تصویر بنے
چوٹ پڑتی ہے جو دل پر تو ہنر جاگتا ہے

ایک شعلہ سا لپکتا ہے مرے دل میں سروشؔ
جب کسی شوخ کی یادوں کا شرر جاگتا ہے

(۲۷ جنوری ۱۹۹۹ء)

○

باغ میں ہر برگ پر حمد و ثنا لکھی ہوئی ہے
شبنمی لفظوں میں توصیفِ خدا لکھی ہوئی ہے

اب پرندوں سے کہو چھوڑیں وہ اپنے آشیانے
صبح کے منظر پہ اُڑنے کی ادا لکھی ہوئی ہے

دشت و دریا، کوہ و صحرا کھلتے ملتے رنگ اُفق کے
زندگی ! تیری کہانی جا بجا لکھی ہوئی ہے

تم جو کرنا ہے کرو دستورِ قدرت کا نہ بھولو
کس عمل کی کیا سزا ہے کیا جزا، لِکھی ہوئی ہے

گھوم کر دُنیا ترے دامن میں آجاتا ہوں دلّی
میرے حصّے میں تری آب و ہوا لکھی ہوئی ہے

موت بھی آ کر ٹھٹھک جاتی ہے دروازے پہ میرے
حال پر میرے بزرگوں کی دُعا لکھی ہوئی ہے

اے سروشؔ اب پھیل جانے دو اُنھیں ساری فضا میں
ان ہواؤں پر محبّت کی نوا لکھی ہوئی ہے

(۳۱ر جنوری ۲۰۰۰ء)

○

برق و باراں سے اُس کی اَن بن ہے　　چار تنکوں کا یہ نشیمن ہے
اپنے ہی عاشقوں کو ڈستی ہے　　راست گوئی اِک ایسی ناگن ہے
موت کا کام ہو گیا آساں　　زندگی زندگی کی دشمن ہے
وقت رُک جائے اب قیامت تک　　میرے آنسو اور اُن کا دامن ہے
دلِ ویراں کے ایک گوشے میں　　آس کا اِک چراغ روشن ہے
میں یہ کس راہ پر نکل آیا　　کوئی رہرو نہ کوئی رہزن ہے

اُس کی زلفیں سنوارتا ہوں سروشؔ
میرا محبوب بس مرا فن ہے

(۲۴؍فروری ۲۰۰۰ء)

○

لفظ ہیں بے ربط، اُن کو داستاں ہونے تو دو　　ہر صدا کو سوزِ دل کی ترجماں ہونے تو دو
ضبطِ گریہ کا ابھی سے مشورہ دیتے ہو کیوں　　آنسوؤں کو غم کا بحرِ بے کراں ہونے تو دو
اور پُر تاثیر ہو جائے گی لَے فریاد کی　　بے بسی میں ہر بُنِ مُو کو زباں ہونے تو دو
آسماں سر پر اُٹھا لے گا کسی دن دیکھنا　　نالۂ خاموش کو دل میں جواں ہونے تو دو
سوچنا انجام کا، آغاز کی توہین ہے　　جانبِ منزل روانہ کارواں ہونے تو دو
سر کے بل آؤں گا پھر سجدہ گزاری کے لیے　　کوئے جاناں کی زمیں کو آسماں ہونے تو دو

لطف آئے گا بہت اس کو منانے میں سروشؔ
پہلے تم اُس حیلہ جو کو بدگماں ہونے تو دو

(۱۶؍مارچ ۲۰۰۰ء)

○

وقت نے باندھ دیا درد کی زنجیروں میں
فرق کیا مجھ میں ہے اور موت کی تصویروں میں

زندہ رہنا ہے تو خوابوں کو بچا کر رکھئے
ناامیدی کے بہت رنگ ہیں تعبیروں میں

سانس باقی ہے ابھی، عمرِ رواں رقص میں ہے
ابھی جھنکار سی ہے پاؤں کی زنجیروں میں

اور کھل اُٹھتے ہیں افکار و معانی کے نقوش
رنگِ ماضی بھی اگر ہو نئی تصویروں میں

لفظ اجمال کی صورت تھے معانی کے صدف
طشت از بام مگر ہو گئے تفسیروں میں

میں نے تہذیب کے ہر رنگ کو اپنایا ہے
اک جہاں بول رہا ہے مری تحریروں میں

اے سروشؔ آؤ چلیں اک نئی منزل کی طرف
عزمِ نو کی ہے رمق صبح کی تنویروں میں

(۲۱ر مارچ ۲۰۰۰ء)

○

دل منزلِ بے نام کا بھٹکا ہوا راہی
ہر گام پہ کرتی ہے سلام آ کے تباہی

تشکیک دُورا ہے پہ کھڑی سوچ رہی ہے
"پایا نہ صنم اور نہ ملا مجھ کو خدا ہی"

ہر دَور میں ناقدریٔ اربابِ وفا تھی
اس دور میں ناپید ہیں اربابِ وفا ہی

یہ کیسے بگولے ہیں کہ محمل تو ہے محمل
لیلائے تمدن کی اُڑا دی ہے ردا ہی

ایثار سے کھل جاتے ہیں کردار کے اسرار
انسان کی پہچان فقیری ہے نہ شاہی

پھر کھیل نیا کھیلتی ہے گردشِ ایام
پھر مطلعِ انوار پہ چھائی ہے سیاہی

صد حیف کہ بیگانہ ہے خود اپنی زمیں سے
انسان جو انجانے ستاروں کا ہے راہی

(۲۰ر مارچ ۲۰۰۰ء)

○

انسانیت کے حصّے میں کب تک یہ پستیاں
اُجڑیں گی کب تلک یہ رعونت کی بستیاں

تہذیبِ نو کے تحفے ہیں کتنے عجب عجب
فرقہ پرستیاں کہیں دہشت پرستیاں

جامِ ہوس میں بھائی کے، ہے بھائی کا لہو
بامِ عروج اور یہ انساں کی پستیاں!

تاریخ کا ہیں کوڑھ یہ نفرت کے بام و دَر
آؤ بسائیں پیار محبّت کی بستیاں

جب زندگی تھی شعر و شباب و شراب و چنگ
یاد آتی ہیں وہ عہدِ گذشتہ کی مستیاں

اب خدمتِ عوام کتابوں کی بات ہے
اِس درجہ عام ہوگئیں مطلب پرستیاں

میں خود کو دیکھتا ہوں تو شرم آئے ہے سروشؔ
گزری ہیں کیسی کیسی زمانے میں ہستیاں

(۲۹؍اپریل ۲۰۰۰ء)

○

اِک تھکا ماندہ مسافر چل رہا ہے دھیرے دھیرے
مضمحل پژمردہ سورج ڈھل رہا ہے دھیرے دھیرے

آسماں پر سلوٹیں ہیں چاندنی مرجھا رہی ہے
آ رہا ہے چاند کی نگری میں بادل دھیرے دھیرے

یاد ہی آتا نہیں ہے چوٹ کب کھائی تھی دل نے
زخم اب ناسور بن کر پل رہا ہے دھیرے دھیرے

اُٹھ گئے میرے سوا سب ، بزم سونی رہ گئی ہے
طاقِ تنہائی میں دیپک جل رہا ہے دھیرے دھیرے

میں زمانے سے گریزاں اور زمانہ مجھ سے نالاں
وقت ہے چالاک مجھ کو چھل رہا ہے دھیرے دھیرے

حادثوں کے برف کے نیچے دبا ہے جسم میرا
برف ہے پتھر نہیں ہے، گل رہا ہے دھیرے دھیرے

رُوح کا یہ گھر کہ جیسے پھونس کا اِک سائباں ہے
غم کی چنگاری سے رفعتؔ جل رہا ہے دھیرے دھیرے

(۳۱ مئی ۲۰۰۰ء)

○

آنکھ سے اوجھل ہوا جاتا ہے بینائی کا رنگ
ہو گیا کچھ اور گہرا آج تنہائی کا رنگ

موت پھر اک بار سینے سے لگا تا ہوں تجھے
دیکھنا ہے آج پھر اُن کی مسیحائی کا رنگ

ہر طرف طوفان سا ہے، ہر طرف موجِ سراب
کر رہا ہے طنز مجھ پر میری دانائی کا رنگ

مضطرب تھا، منفعل تھا اپنی ناکامی پہ دِل
آتے آتے آئے گا صبر و شکیبائی کا رنگ

بھیڑ سی چہروں کی اور سرگوشیوں کا اِک ہجوم
ہے مری تنہائیوں میں بزم آرائی کا رنگ

میں اُبھرتا جا رہا ہوں جیسے اِک کوہِ گراں
دیکھ میرا حوصلہ، میری توانائی کا رنگ

دُھندلے دُھندلے عکس ہیں، گم ہو گئیں سب صورتیں
کتنا پھیکا پڑ گیا رفعتؔ شناسائی کا رنگ

(۱۹ر جون ۲۰۰۰ء)

○

بس ایک سانس پر ترا دار و مدار ہے
اے زندگی بتا ترا کیا اعتبار ہے

زد میں جو بجلیوں کی ہر اک شاخسار ہے
فصلِ بہار اب کے خزاں کی شکار ہے

اِک ساتھ پینے والے جو میکش تھے جو اُٹھ گئے
اب اپنی اپنی پیاس ہے اپنا خمار ہے

شانہ بشانہ بیٹھے ہیں ایوانِ شوق میں
لیکن دِلوں میں بغض و حسد کا غبار ہے

سب خیر و شر کے معرکے اس کے ہی دَم سے ہیں
انسان دیکھنے میں تو مشتِ غبار ہے

اس کے جلو میں کل تھے شہنشاہ و تاجدار
وہ دُور آسماں پہ جو گرد و غبار ہے

بزمِ سخن سے اُٹھ گئے مجروحؔ و جعفریؔ
محوِ فغاں ہے نظم، غزل سوگوار ہے

(۱۹ر اگست ۲۰۰۰ء)

○

ہزار چہرے نہاں داستاں کے منظر میں
ہزار رنگ ہیں حرف و بیاں کے منظر میں

عجیب شعبدے ہیں کہکشاں کے منظر میں
زمین رقص میں ہے آسماں کے منظر میں

حقیقتوں نے تو بے حال کر دیا ہوتا
تمام عمر جیا ہوں گماں کے منظر میں

زبانِ برگِ گلِ تر نہ غنچۂ گفتار
خزاں کا ناچ ہے بس گلستاں کے منظر میں

شہید ہوتا رہا حرفِ حق ازل ہی سے
ہیں کربلائیں بہت سی فغاں کے منظر میں

نہ جانے کس کو ملے گا قبولیت کا شرف
ہزار سجدے ہیں اس آستاں کے منظر میں

یہ دشت دشت سفر جانے ختم کب ہو سروشؔ
پڑاؤ ہی نہیں عمرِ رواں کے منظر میں

(۵ر جون ۲۰۰۰ء)

○

نہ دن، نہ رات، نہ منظر، نہ کوئی پس منظر
گہن میں آ گئے اِک ساتھ جیسے شمس و قمر

نہ میرے پاؤں میں طاقت، نہ دِل میں ذوقِ سفر
اُٹھائے پھرتا ہے خود وقت اپنے کاندھوں پر

کہیں ہے پستیٔ کردار کی مثال مگر
کہیں بلند فرشتوں سے ہے مقامِ بشر

لیے لیے پھرا دِن بھر کہاں کہاں سورج
تھکن نے ڈال دیا شب کو لا کے بستر پر

قلم قبیلے میں ہر شخص دوسرے کا حریف
بساطِ حرف پہ کھلتے ہیں اُن کے سب جوہر

مگر یقین ہے یہ نظمِ حیات بدلے گا
نہ میں ولی ہوں نہ درویش ہوں نہ پیغمبر

جلاؤ مشعلِ جاں اب نئے سفر کے لیے
سروشؔ بجھ گئے ماضی کے سارے شمس و قمر

(۲۵ر ستمبر ۲۰۰۰ء)

○

جب سے مجھے تنہائی کے آسیب نے گھیرا
ہر سمت اندھیرا نظر آتا ہے گھنیرا

کب آتا ہے کب جاتا ہے معلوم نہیں کچھ
ہے لمحہ خوشی کا تو بس اِک سائیں کا پھیرا

یہ پیڑ جو صدیوں سے اسی طرح ہے سرسبز
اس پیڑ پہ تھا اپنا بھی اِک رات بسیرا

قابو میں جو کر لے ہے اُسی کا یہ وفادار
یہ وقت کا رہوار نہ تیرا ہے نہ میرا

موتی یہ ترے دامنِ رحمت پہ گرے گا
اِک اشکِ ندامت کا ہے پلکوں پہ بسیرا

آفاق کے سب شمس و قمر آئیں اُتر کر
اس کرۂ خاکی میں ہے صدیوں سے اندھیرا

یہ سوچ کے اِک عمر اندھیروں سے لڑا ہوں
اب آئے گا اب آئے گا رنگین سویرا

(۲۷ر ستمبر ۲۰۰۰ء)

○

کوئی رہبر نہ منزلِ مقصود
جادہ پیما ہے کاروانِ وجود

تُو نے کیا سوچ کر مرے معبود
مرے قدموں کو کر دیا محدود

اِک ترے کوچۂ طلب کے سوا
میری ہر راہ ہو گئی مسدود

جب سے نسبت ہوئی ترے در سے
بھول بیٹھا ہوں میں رکوع و سجود

بحر و بر، آسماں، ستارے کیا
مری فکرِ رسا ہے لامحدود

اور سب ہے گماں، خواب و خیال
بس حقیقت ہے لمحۂ موجود

آج سورج پہ ڈالتا ہے کمند
ذرّۂ خاک سے ہے جس کی نمود

(۲۹ر اکتوبر ۲۰۰۰ء)

○

(نذرِ غالبؔ)

کب حرفِ طلب معرضِ اظہار میں آوے
آوے جو کبھی پردۂ اسرار میں آوے
یاں جنسِ ہنر کا تو کوئی مول نہیں ہے
جو بیچ سکے خود کو وہ بازار میں آوے
گل گشتِ چمن میں تو سبھی ساتھ تھے، لیکن
ہمراہ کوئی وادیٔ پرخار میں آوے
اِک درد جسے دل میں بسانے کی تمنا
لذّت یہ عجب عشق کے آزار میں آوے
دوکانِ جواہر میں تو پتھر ہیں ہزاروں
موتی وہی جو چشمِ خریدار میں آوے

(۲۱ر نومبر ۲۰۰۰ء)

○

مری سرشت میں کیا چیز ہے مرے معبود
بکھر بکھر کے سنورتا رہا ہے میرا وجود
اُفق کے پار اُڑا جا رہا ہے ذہنِ رسا
نہ جانے کون سا عالم ہو منزلِ مقصود
تڑپتا رہتا ہے طائرِ قفس میں ہر لمحہ
حصارِ جسم میں رہ کر ہے زندگی محدود
مطالعہ کریں مقدور بھر اب اہلِ نظر
کھلی ہوئی ہے کتابِ نوادراتِ وجود
کوئی تو بات ہے دِل میں ہے روشنی کی رمق
کہ بے سبب تو نہیں حرفِ آگہی کا ورود
خدا ہی جانے اُنھیں کیا جزا عطا ہوگی
جو کر رہے ہیں سخاوت برائے نام و نمود
اگر یقیں نہ ہو دِل میں تو پھر عبث ہے سروشؔ
وضو، نماز، مصلّٰی، رُکوع اور سجود

(۲۴ر دسمبر ۲۰۰۰ء)

○

دِل ہوا روشن محبّت میں ، تو کیا عالَم ہوا!
تھا جو کل جامِ سفالیں ، آج جامِ جم ہوا
خود کشی کی ، پھر بھی پروانوں کا تو ماتم ہوا
کون سوچے ، شمع کا محفل میں کیا عالم ہوا!
اے دلِ بیتاب! ان کے ذکر سے راحت ملی؟
آخرِ شب رُوح فرسا درد تھا ، کچھ کم ہوا؟
دل میں عرضِ شوق کے ارمان کیا کیا تھے ، مگر
سامنا اُن کا ہوا ، تو اور ہی عالَم ہوا
آپ ہیں بیگانۂ سود و زیاں رفعت سروشؔ
کیا غلط ہے! گر زمانہ آپ سے برہم ہوا

(۲۷ رنومبر ۲۰۰۱ء)

○

سلگتے لفظوں ، دہکتے محاوروں میں لکھو
بیانِ حال قیامت کے زاویوں میں لکھو
یہ لفظ کل تھا مقدس ، ہے آج بے معنی
بغاوتوں کو بھی دہشت کے دائروں میں لکھو
زمیں پہ طاری ہے اب رقصِ مرگ کا عالم
چمکتی بجلی سے گھنگھور بادلوں میں لکھو
وہ دور ہے ، کوئی منصف ، نہ کوئی اہلِ نظر
نقیبِ امن کا بھی نام مفسدوں میں لکھو
لغت کے لفظ وہی ہیں ، بدل گئے معنی
جو سر اُٹھا کے چلے ، اس کو سرکشوں میں لکھو
وفا پرستوں کی تاریخ لکھ رہے ہو تم
ہمارا نام بھی اے کاش حاشیوں میں لکھو
سروشؔ حرف کا شیدا ، قدیم ہے کہ جدید
یہ ایک زندہ حقیقت ہے ، سرخیوں میں لکھو

(۲۸ رنومبر ۲۰۰۱ء)

○

وہ آخرِ شب کا سناٹا ، وہ فکرِ سخن ، الہامِ غزل
پھیلایا ہے دستِ فطرت نے ہر سمت فضا میں دامِ غزل

عارض پہ کھلی گُل رنگ شفق ، اس پر چھائی زلفوں کی گھٹا
یہ عالم بھی کیا عالم ہے ، گہہ صبحِ غزل ، گہہ شامِ غزل

لبِ غنچہ صفت ، آنکھیں نرگس ، موہوم کمر ، لہرائے بدن
گل گشتِ چمن کو نکلے ہیں کیسے کیسے گلفامِ غزل

سوغات محبت کی سمجھوں ان لفظوں کو ، ان حرفوں کو
ان کے ہونٹوں پر آجائیں گر میرے لیے دشنامِ غزل

ہر لفظ نشہ ، ہر تان غضب ، مسحور ہے محفل کی محفل
کس کی آواز کی لہروں نے پھینکا ہے سنہرا دامِ غزل

میرؔ و غالبؔ ، آتشؔ ، مومنؔ ، داغؔ و حسرتؔ ، فانیؔ و جگرؔ
اُردو کے شوالے کی رونق کیسے کیسے اصنامِ غزل

بنجاروں کی اس بستی میں تم کس سے ملنے آئے ہو؟
اچھا ، وہ سروشؔ ، وہ دیوانہ ، وہ شاعرِ گل ، بدنامِ غزل!

(۶ ر دسمبر ۲۰۰۱ء)

○

جنوں کا شعلۂ تند، اضطراب کا آہنگ
مرے شعور میں ہے انقلاب کا آہنگ

خیال نغمہ سرا بربطِ تحیر پر
ہر ایک شعر میں تمثیلِ خواب کا آہنگ

مرے نصیب میں ہے فیضِ حافظؔ و خیامؔ
مرے لہو میں ہے موجِ شراب کا آہنگ

نفس نفس کے شرارے ہیں اس میں پیوستہ
نوائے درد ہے دل کی کتاب کا آہنگ

ازل کا گیت ہے بچپن کے شوخ ہونٹوں پر
ابد کا نغمہ ہے عہدِ شباب کا آہنگ

وہ اُن کے طرزِ تکلّم سے آشنا ہوگا
سنا ہے جس نے شگفتِ گلاب کا آہنگ

چہک رہا ہے ابھی طائرِ نوائے سروشؔ
کبھی سکون کبھی اضطراب کا آہنگ

(۷ر دسمبر ۲۰۰۱ء)

○

یہ کیسے خوف کا ماحول میں بسیرا ہے
توہمات کے سایوں نے دل کو گھیرا ہے

دُھواں دُھواں سا ہے منظر، نظر نہیں آتا
لٹا ہے کون یہاں، کون یاں لٹیرا ہے!

اُدھر نہ جانا، اُدھر منجمد ہے ہر منظر
اُداس رُوحوں کا ان وادیوں میں ڈیرا ہے

گرا چکا ہے ہر اِک آشیانے پر بجلی
یہ آسمان نہ تیرا ہے اور نہ میرا ہے

جلاؤ، اور جلاؤ لہو چراغوں میں
ابھی تو رات ہے باقی، ابھی اندھیرا ہے

درخت ایک ہے، شاخیں ہزار ہیں اس کی
نہ جانے کتنے پرندوں کا یاں بسیرا ہے

سروشؔ رات نئے رُخ بدلتی رہتی ہے
مری نگاہ میں لیکن نیا سویرا ہے

(۸ر دسمبر ۲۰۰۱ء)

○

ازل کے روز پڑھا تھا جو، وہ سبق لکھا
قلم سے پہلے پہل میں نے حرفِ حق لکھا
اُسی کے ذکر سے بھر دی فضائے ارض و سما
اسی کا نام لکھا اور طبق طبق لکھا
تمام دن بہا مقتل میں خون لمحوں کا
ہوئی جو شام تو ہم نے اسے شفق لکھا
حکایتِ غمِ ہستی انھیں سناتے جائیں
کتابِ زیست کا ہم نے ورق ورق لکھا
سروشؔ تم نے جڑے لفظ موتیوں کی طرح
زمانہ کہتا ہے لیکن بہت ادق لکھا

(۱۱؍دسمبر ۲۰۰۱ء)

○

ٹوٹتے بکھرتے سے پتھروں کی آوازیں　اُٹھ رہی ہیں سینے سے زلزلوں کی آوازیں
گر رہی ہوں پھولوں پر جیسے برف کی بوندیں　کس جہاں سے آئی ہیں دوستوں کی آوازیں
کربِ نارسائی سے پاؤں ہو گئے پتھر　بُن رہی ہیں افسانے راستوں کی آوازیں
لب پہ موجِ دریا کے پیاس ہے شہیدوں کی　نوحہ خوانی کرتی ہیں ساحلوں کی آوازیں
شعر سہمے سہمے ہیں دَم بخود ہیں افسانے
گونجتی ہیں ایواں میں ناقدوں کی آوازیں

(۲۵؍فروری ۲۰۰۲ء)

○

خوں کے گرداب میں انسان کو رقصاں دیکھا
میں نے کل رات عجب خواب پریشاں دیکھا
آگ کے پھول کھلاتی ہوئی گزری جو نسیم
صبح دم باغ میں کیا رنگِ بہاراں دیکھا
غنچے پامال تو گل زخمی ، لہو رنگ زمیں
رشکِ مقتل جسے کہیئے وہ گلستاں دیکھا
زندگی نام کے میلے میں ہوا اپنا گزر
اور ہر جنس ملی کوئی نہ انساں دیکھا
ایک بازار میں نیلام ہوا عصمت کا
ایک چوراہے پہ بکتا ہوا ایماں دیکھا
ایک چہرے پہ نظر آئے ہزاروں چہرے
اور ہر چہرے میں ہنستا ہوا شیطاں دیکھا
بستیاں ہوگئیں ویران ، جلے رنگ محل
مگر آباد ہر اک شہرِ خموشاں دیکھا

(۲۳ر اگست ۲۰۰۲ء)

○

اپنا نغمہ سنا رہی ہے ابھی		مہرباں مجھ پہ زندگی ہے ابھی
اک صدی سے گزر کے آیا ہوں		اِک صدی سامنے کھڑی ہے ابھی
رات سے رات جنم لیتی ہے		گم اندھیرے میں روشنی ہے ابھی
تم نہ آنا کہ شامِ تنہائی		غم کا افسانہ لکھ رہی ہے ابھی
پھول بن جائیں کیا خبر یادیں		دِل کی مٹّی میں تو نمی ہے ابھی
ابھی اپنا قلم نہ رکھنا سروشؔ
تیرے لہجے میں تازگی ہے ابھی

(یکم اکتوبر ۲۰۰۱ء)

○

اُتر کر گنبدِ افلاک سے ہم خاک پر آئے
نہ الزام اب ہماری جرأتِ بے باک پر آئے

بہت ہی بے حقیقت، بے بضاعت ڈھیر مٹّی کا
مگر سونا بنے جب کوزہ گر کے چاک پر آئے

ہمارے سر میں سودا تھا ہزاروں لغزشیں کی ہیں
مگر الزام سارے اِک دلِ صد چاک پر آئے

مرے زخموں کی گل کاری کے آگے سب خجل ٹھہرے
ستارے جب بھی شب کو منظرِ افلاک پر آئے

ستارے دَم بخود شمس و قمر بھی محوِ حیرت ہیں
زمیں سے اُڑ کے ذرّے رفعتِ افلاک پر آئے

تری ضد ہے تو اس کوچے میں چلتا ہوں دلِ ناداں
اگر چھینٹے ندامت کے مری پوشاک پر آئے!

سروشؔ آئے ہو کس وادی میں یاں پتھر برستے ہیں
نہ کوئی ضرب دیکھو شیشۂ ادراک پر آئے

(۱۳/۱ اکتوبر ۲۰۰۲ء)

○

جب کوچہ کوچہ مقتل ہو، تب ذکرِ گلستاں کیا معنی
جب آگ میں زندہ جسم جلیں، تب جشنِ بہاراں کیا معنی

تاریک گھروں کے سناٹے خاموش فسانے کہتے ہیں
پُرہول کھنڈر کے کونے میں اِک شمعِ لرزاں کیا معنی

مسموم فضا، ہر سمت دُھواں، پرواز کریں طائر کیسے
جب شاخِ نشیمن جلتی ہو، بلبل ہو غزل خواں کیا معنی

اُس قافلے کا لٹنا ٹھہرا، قزاق ہو جس کا راہنما
ہو جو اپنی فطرت سے، گلشن کا نگہباں! کیا معنی

جس علم کے زہر سے انساں بھی خونخوار درندے بن جائیں
اِس امن و اماں کی بستی میں وہ علم فراواں کیا معنی

جس کا مسلک ہو نسل کشی، جس کا مقصد قتل و غارت
وہ آدمی ہندو کیا مطلب! وہ مردِ مسلماں کیا معنی!

اس کرۂ ارض پہ لکھا ہے مظلومیٔ آدم کا قصہ
یاں چھین جھپٹ کی تہذیبیں، آزادیٔ انساں کیا معنی

(۱۵؍اکتوبر ۲۰۰۲ء)

○

طائرِ فکر کو اُڑان میں رکھ ہر قدم اپنا آسمان میں رکھ
صلح کی بات چیت کر پہلے ابھی تلوار کو میان میں رکھ
قتل و غارت کا آ گیا موسم اے خدا سب کو تو امان میں رکھ
قوم میں اتفاق اگر چاہے اتحاد اپنے خاندان میں رکھ
قصۂ غم کو اتنا طول نہ دے چند خوشیاں بھی داستان میں رکھ
دوستوں سے بھی احتیاط سے مل فاصلہ کچھ تو درمیان میں رکھ
تیری عادت سروشؔ حق گوئی
کچھ لطافت مگر بیان میں رکھ

(۲؍نومبر ۲۰۰۲ء)

○

بس ایک حرفِ محبت، بس ایک لفظ وفا ہمارے پاس نہیں اور کچھ بس اس کے سوا
وہ ایک خواب تھا یا خود شناس لمحہ تھا میں اپنے آپ سے مل کر بہت بہت رویا
تمام عمر گزار آئے تب یہ راز کھلا سدا کسی کا کوئی ہم سفر نہیں ہوتا
روش روش پہ مہکتے گلاب، برگِ سمن مگر وہ پھول جو صبحِ بہار میں نہ کھلا!
مسافتوں میں کٹے زندگی کے ماہ و سال نہ پار ہو سکا لیکن یہ ریت کا دریا
نفس کے ساز پہ نغمہ، نہ تھرتھراہٹ ہے ہوا کے ہاتھ سے شاید یہ ساز چھوٹ گیا
سروشؔ کب سے میں کانٹوں کے بیچ رہتا ہوں
مرے لیے تو ہے یہ شہر درد کا صحرا

(۱۴؍دسمبر ۲۰۰۲ء)

○

اُس زمیں پر ہوں کہ جس کا آسماں گم ہوگیا ہے
چلچلاتی دُھوپ سر پر ، سائباں گم ہوگیا ہے

تھے نشاں جو منزلوں کے ، بن گئے ہیں سنگِ حیرت
راستوں کے پیچ وخم میں کارواں گم ہوگیا ہے

ہاں یہی بستی کہ جس میں کچھ کھنڈر ، کچھ جھونپڑے ہیں
ایک چھپر کا مرا گھر تھا یہاں ، گم ہوگیا ہے

کل یہاں سیلابِ غم تھا ، بجھ گئی ہیں آج آنکھیں
خشک ہیں صحرا کے لب ، آبِ رواں گم ہوگیا ہے

اہلِ دِل اپنی جبینوں میں لیے پھرتے ہیں سجدے
جس پہ خود جھک جائے سر وہ آستاں گم ہوگیا ہے

آرزو کی شمع لے کر کوندتی پھرتی ہے بجلی
وادیٔ افلاک میں ابرِ رواں گم ہوگیا ہے

ان سے کیا بچھڑے سروشؔ اب زندگی ہی رائگاں ہے
ایسا لگتا ہے کہ جیسے کل جہاں گم ہوگیا ہے

(دسمبر ۲۰۰۲ء)

○

بادۂ الفاظ میں صورت گری کے ذائقے
گاہ نغمہ، گاہ رقص و شاعری کے ذائقے
ہر غزل میں تلخ و شیریں زندگی کے ذائقے
گمرہی کے ذائقے، خود آگہی کے ذائقے
ہے نفاست کی علامت وضعِ عجز و انکسار
ہیں مگر کچھ اور ذوقِ خودسری کے ذائقے
دوستی اور امن کے صہبا کہاں پیتے ہیں وہ
لگ گئے ہوں جن کے منہ غارت گری کے ذائقے
کاش شیخ و برہمن میخانے میں آنے لگیں
ہوں زباں پر سب کی ربطِ باہمی کے ذائقے
واسطے سے کربلا کے ہے امر موجِ فرات
شاعری کو جس نے بخشے تشنگی کے ذائقے

(دسمبر ۲۰۰۲ء)

○

نہ کوئی نقشِ تصور، نہ کوئی حرفِ خیال
مری نگاہ میں رقصندہ ہے یہ کس کا جمال
نئے سفر کے لیے ہے نئی زمیں درکار
سمٹ گیا مرے قدموں میں دشتِ ماضی و حال
کوئی بساط جہاں نقش اُبھر سکیں اس کے
بسا ہوا ہے خیالوں میں ایک شہرِ کمال
یہ میرا دِل ہے دھڑکتا ہے ہر گھڑی، ہر پل
اس آئینے پہ ٹھہرتی نہیں ہے گردِ ملال
جواب آئے نہ آئے خلا کی وسعت سے
اُچھالتا ہوں مگر کربِ آگہی کے سوال

(دسمبر ۲۰۰۲ء)

○

جو شگفتِ گل ہے روش روش تو چٹک رہی ہے کلی کلی
یہ نہ جانے کس کا دیار ہے کہ مہک رہی ہے گلی گلی
کبھی شعلہ بن کے بھڑک اُٹھی، کبھی اشک بن کے ڈھلک گئی
یہ عجیب شمعِ حیات ہے ، نہ بجھی بجھی نہ جلی جلی
یہ مرا چمن ہے مرا چمن مگر اس پر ٹوٹی ہیں بجلیاں
مرا آشیاں تھا وہیں کہیں جہاں شاخِ گل ہے جلی جلی
کوئی سانحہ ہے نہ واقعہ، مرے روز و شب کی بساط کیا
مری صبح تھی بڑی ملگجی ، مری شام بھی ہے ڈھلی ڈھلی
غمِ زندگی کے ہجوم میں مری جراتوں کو نہ آزما
مرے سر پہ سایۂ مصطفیٰؐ ، ہے زباں میں میری علیؑ علیؑ

○

اِک مرکز پر آن ملے صدیوں کے موسم
مجھ میں بسے ہیں کتنی تہذیبوں کے موسم
آنکھیں ان کو دیکھیں تو پہچان نہ پائیں
ذہن میں ہیں کچھ ایسی تصویروں کے موسم
آگ لگی ہے جنگل جنگل بستی بستی
ختم نہ جانے کب ہوں گے شعلوں کے موسم
اِک اِک کر کے کتنے چہرے ملنے آئے
لوٹ آئے بھولی بسری یادوں کے موسم
کوئی کلی کھلتی ہی نہیں ہے ارمانوں کی
رُوٹھ گئے ہیں شاید سب پھولوں کے موسم
روز کہاں لکھی جاتی ہیں دل کی باتیں
کبھی کبھی آتے ہیں تحریروں کے موسم
آج سروشؔ میں کس منزل پر آ پہنچا ہوں
تنہائی اور دل میں ہنگاموں کے موسم

○

تن کو بوسیدہ قبا ، بیچارگی کا پیرہن
من کو بخشا ہے قناعت اور خودی کا پیرہن

یہ لباسِ اطلس و کمخواب تو ہے بے وقار
ہو میسر رُوح کی آسودگی کا پیرہن

علم و دانش کے لیے کل تک ریاضت شرط تھی
ہوتا ہے نیلام اب دانشوری کا پیرہن

علم کی آسودگی ہے اصل میں چیزے دِگر
پہنے پھرتے ہیں ہزاروں آگہی کا پیرہن

آنسوؤں کے داغ دھبے، درد کے پیوند ہیں
کتنا بوسیدہ ہے میری زندگی کا پیرہن

ہم نشیں یہ رات کتنی خوبصورت رات ہے
زیبِ تن اس نے کیا ہے چاندنی کا پیرہن

لفظ تھے بے رنگ، بے ترتیب لیکن اے سروشؔ
شاعری نے ان کو بخشا نغمگی کا پیرہن

○

دِلّی تری آغوش میں صدیوں کے کھنڈر ہیں
اس باغ میں ہر سمت بہاروں کے کھنڈر ہیں

دل ایسا خرابہ کہ نہیں جس کا مقابل
کہنے کو بہت چاند ستاروں کے کھنڈر ہیں

ویرانۂ اُلفت میں ہمیں کچھ تو ملا ہے
کانٹوں کی مسیحائی ہے، وعدوں کے کھنڈر ہیں

اس درجہ شکستہ ہیں کہ پہچاننا مشکل
یادیں نہیں، احباب کی یادوں کے کھنڈر ہیں

جو عمر گزر جائے وہ بن جائے ہے ماضی
ماضی کے نہاں خانے میں لمحوں کے کھنڈر ہیں

مرتی نہیں، کھو جاتی ہے ماحول میں آواز
رقصندہ ہواؤں میں صداؤں کے کھنڈر ہیں

وہ شعر نہ جن میں ہو محبّت کی حرارت
بے نور ہیں بے رنگ ہیں، لفظوں کے کھنڈر ہیں

○

نہ پوچھ میرے قلم تجھ سے آج کیا چاہوں
میں اپنے درد کی تصویر کھینچنا چاہوں

میں آدمی ہوں، ہوس ہے سرشت میں میری
بہت ملا ہے مگر اس سے بھی سوا چاہوں

تصوّرات کے محلوں میں سو چکا برسوں
میں خارزارِ حقیقت میں جاگنا چاہوں

نہ کر سکے اُنھیں رفتارِ وقت بے حرمت
ہر ایک نقش میں اپنا سمیٹنا چاہوں

اب ان کی یاد کا بھی سحر ہو چکا زائل
سروشؔ جینے کا پھر کوئی مشغلہ چاہوں

○

زخم ہیں یا آرزو کے پھول مرجھائے ہوئے
باغِ دل میں ہیں لہو کے پھول مرجھائے ہوئے

جن کی سانسوں کی مہک سے کِل کھِل اُٹھتے تھے چمن
اب ہیں ان کی گفتگو کے پھول مرجھائے ہوئے

لٹ گئی کب کی بہارِ میکدہ ، روتے ہیں اب
ہر طرف جام و سبو کے پھول مرجھائے ہوئے

دامنِ دِل تھا دریدہ ، اب تو سب کچھ ختم ہے
رہ گئے ہیں کچھ رفو کے پھول مرجھائے ہوئے

فصلِ گُل آئے بھی تو کھلتی نہیں کوئی کلی
کب سے ہیں جوشِ نمو کے پھول مرجھائے ہوئے

لے گئی تاریخ البم میں سجانے کے لیے
تھے جو کربِ جستجو کے پھول مرجھائے ہوئے

آندھیاں فرقہ پرستی کی چلی ہیں اے سروشؔ
ہیں وطن کی آبرو کے پھول مرجھائے ہوئے

○

شوخیٔ رنگِ حنا کے پھول ہیں مہکے ہوئے
میرے پہلو میں وفا کے پھول ہیں مہکے ہوئے

جب سے ان کا ذکر میری شاعری میں آ گیا
ہر طرف میری نوا کے پھول ہیں مہکے ہوئے

اُن کو بے باکانہ دیکھے، ہے بھلا کس کی مجال
روئے زیبا پر حیا کے پھول ہیں مہکے ہوئے

کس گلی سے ہو کے آئی ہے صبا! کچھ تو بتا
تیرے دامن میں غنا کے پھول ہیں مہکے ہوئے

میرے دروازے تک آ کر لوٹ جاتی ہے خزاں
یاں بزرگوں کی دُعا کے پھول ہیں مہکے ہوئے

اور ہے یہ بات لکھنے پر قلم قادر نہ ہو
فکر میں حمد و ثنا کے پھول ہیں مہکے ہوئے

باغِ اُردو میں بہارِ بے خزاں ہے اے سروشؔ
میرؔ و مرزاؔ کی نوا کے پھول ہیں مہکے ہوئے

○

ٹھہر ٹھہر کے درد کے چراغ جھلملائے اور یہ رات بھی گزر گئی
نہ جانے کتنے بھولے بسرے لوگ یاد آئے اور یہ رات بھی گزر گئی

کبھی کبھی تو یوں لگا کہ جیسے وقت تھم گیا، نفس بھی رُک گیا مگر
ہزار غم خوشی کے ساتھ ساتھ آئے اور یہ رات بھی گزر گئی

ادھورے کام اِک سوال بن کے آ کھڑے ہوئے جو سامنے تو یک بیک
نہ جانے زندگی سے کتنے وعدے یاد آئے اور یہ رات بھی گزر گئی

نفس نفس ہے بیقرار ازل سے جن کے واسطے وہ بے مثال مہرباں
حریفِ جاں وہ آج بھی نہ آئے پر نہ آئے اور یہ رات بھی گزر گئی

پگھل پگھل کے درد کا سیہ پہاڑ روشنی میں ڈھل گیا دمِ سحر
امید کے پرند شاخ شاخ چہچہائے اور یہ رات بھی گزر گئی

حریف بھی، حلیف بھی، رقیب بھی، حبیب بھی، عجیب اژدہام تھا
تصوّرات میں نہ جانے کتنے لوگ ملنے آئے اور یہ رات بھی گزر گئی

وہ تیرگی سی تیرگی کہ ہاتھ کو بھی ہاتھ سوجھتا نہ تھا، مگر سروشؔ
لپک لپک کے زخم زخم دیپ مسکرائے اور یہ رات بھی گزر گئی

گم ہوتا ہوا آسمان

کے بعد کی غزلیں

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

○

بہت دشوار تھی منزل ، مگر ہم بے خطر آئے
جہاں پر موت بنتی ہے وہاں سے بھی گزر آئے

اسی سوکھے شجر پر کل ہمارا بھی نشیمن تھا
یہیں پر آنکھ کھولی تھی ، یہی پر بال و پر آئے

سفینہ لے کے چل اے ناخدا طوفان کی زد میں
کبھی گرداب سے کھیلیں، کبھی ساحل نظر آئے

ہمارے سامنے تہذیب کی لاشوں کا منظر ہے
یہ پورا شہر ہے قاتل، کہاں سے نوحہ گر آئے

کریں گے رقص دیوانے، ابھی توڑیں گے زنجیریں
ذرا محفل تو اے ذوقِ تماشا ! رنگ پر آئے

ہمیں منظور اس بازی میں جاں سے بھی گزر جانا
نہ کوئی حرف لیکن عشق کے کردار پر آئے

کہاں وہ نازپرور اور کہاں یہ خانہ ویرانی
سروشؔ ان کو خرابے میں نہ آنا تھا، مگر آئے

(۱۲؍دسمبر۲۰۰۳ء)

○

اہلِ زر کی خود سری ، دیوانگی کا آئینہ
کرۂ ارضِ حسیں غارت گری کا آئینہ
جس طرف بھی دیکھئے بے چہرگی ہے عکس ریز
کس قدر دُھندلا چکا ہے زندگی کا آئینہ
اپنی صورت بھی نظر آتی ہے کچھ انجان سی
طاق پر رکھا ہے ٹیڑھا بے رخی کا آئینہ
بیخودی نے ٹکڑے ٹکڑے کردیے منظر تمام
ہم لیے بیٹھے رہے اپنی خودی کا آئینہ
کس طرح منزل ملے، ہو ختم کیسے یہ سفر
میل کا ہر ایک پتھر گمرہی کا آئینہ
پرزے پرزے حرف ہیں اور ریزہ ریزہ ہے خیال
اتنا مبہم، اتنا دُھندلا! شاعری کا آئینہ
ہر حقیقت خواب ہو کر رہ گئی ہے اے سروشؔ
ٹوٹ کر بکھرا کچھ ایسا آگہی کا آئینہ

(۱۵رجنوری ۲۰۰۴ء)

○

نفس نفس ہے آگہی
یہ زندگی ہے زندگی
یہ کونسا مقام ہے
نہ تیرگی ، نہ روشنی
کہاں ہے آفتابِ نو
سنا ہے رات ڈھل گئی
مآلِ آرزو نہ پوچھ
اِک آگ ہے بجھی بجھی
اُڑان تھی فلک فلک
فضا میں تھک کے سوگئی
بنائیں آشیاں کہاں
جو شاخِ گل تھی، جل گئی
کچھ اس طرح پلا مجھے
بڑھے کچھ اور تشنگی
طبیعت اپنی آج کل
ہے دُھوپ سی کھلی کھلی
سروشؔ میری ہم نفس
یہ شاعری کی چاندنی

(۵رفروری ۲۰۰۴ء)

○

(نذرِ غالبؔ)

اس زمانے میں بھلا ہے کون کس کا آشنا
بزم میں اک دوسرے کے سب ہیں چہرا آشنا

اپنی ہستی بھی اسی کے جوہرِ ذاتی سے ہے
ایک قطرہ ہی سہی، پھر بھی ہوں دریا آشنا

کیسے ممکن، دل میں کوئی راز پوشیدہ رہے
روزِ اوّل سے نفس ٹھہرا ہوا کا آشنا

لائقِ تعزیر ہیں وہ، بستیاں جن کی جلیں
عدل کی ہے آنکھ بھی کتنی جفا نا آشنا

تو بھی کر عشقِ ستم اے برقِ ابرِ نوبہار!
یہ مری شاخِ نشیمن تو ہے شعلہ آشنا

وادیٔ ایمن تو ہے، رقصندہ شعلہ ہی نہیں
منتظر ہے جانے کب سے چشمِ جلوہ آشنا

سنگِ در کس کا ہے! یہ بھی سوچنا ہے اے سروشؔ
آستاں ہر اک نہیں ہوتا ہے سجدہ آشنا

(۱۴ر فروری ۲۰۰۴ء)

○

آئی ہیں شہرِ تمنا میں براتیں کتنی
طاقِ حسرت میں سجا رکھی ہیں یادیں کتنی

ایک اُمید کہ پھر چاند نظر آئے گا
جاگ کر کاٹی ہیں ان آنکھوں نے راتیں کتنی

زندگی تو نے ہی بویا تھا تمنا کا شجر
مجھ سے مت پوچھ کہ اب پھیلی ہیں شاخیں کتنی

مصلحت روز لگاتی ہے زباں پر تالے
آ کے ہونٹوں پہ ٹھہر جاتی ہیں باتیں کتنی

ایک خواہش کہ کبھی خود سے بھی ملنا ہو نصیب
ورنہ کہنے کو بر آئی ہیں مرادیں کتنی

تیرہ بختی نے کبھی ساتھ نہ چھوڑا اپنا
چاندنی اوڑھے ہوئے آئی ہیں راتیں کتنی

منزلِ شوق کے موہوم تصور میں سروشؔ
دلِ آوارہ بدلتا رہا راہیں کتنی

(۱۶؍ مارچ ۲۰۰۴ء)

○

میں زوالِ عمر کی منزل میں ہوں اضطرابِ دوریٔ ساحل میں ہوں
کوئی خنجر ! کوئی تیرِ نیم کش! جانے کب سے کوچۂ قاتل میں ہوں
بے نیازِ لذتِ سود و زیاں میں حدودِ شہرِ لاحاصل میں ہوں
بجھ گیا ہوں شمع کی صورت مگر روشنی سی چشمِ مستقبل میں ہوں

(۲۶/اپریل ۲۰۰۲ء)

○

عمر کا اب یہ تقاضہ ہے چلو آہستہ
بات گر سخت کبھی کہنی ہے، کہو آہستہ

جامِ ہستی میں مئے ناب ہے خوش رنگ لطیف
ہے مگر اس کا نشہ تیز، پیو آہستہ

لفظ مشکل سے نمو پاتا ہے خونِ دل سے
لب پہ آجائے تو رک رک کے لکھو آہستہ

کتنا نازک ہے خیال اس کے تصور کی طرح
رنگ میلا ہی نہ ہوجائے چھوؤ آہستہ

شوقِ منزل کا تقاضہ ہے، چلو تیز سروشؔ
پیچ و خم راہ کے کہتے ہیں، رُکو، آہستہ

(۲/جون ۲۰۰۲ء)

○

وہ جس سے اپنا تعلق تھا جسم و جاں کی طرح
بکھر گیا ہے عدم میں وہ داستاں کی طرح
میں کارواں سے بچھڑ کر تو رہ نہیں سکتا
چلا ہوں ساتھ، مگر گردِ کارواں کی طرح
اسی کے سائے میں کاٹی ہے زندگی میں نے
جو سر پہ درد کی چادر ہے آسماں کی طرح
یہ کائنات کتابِ حیات ہے میری
ورق ورق پہ لکھا ہوں میں داستاں کی طرح
یہ قرب کیسا! مسلسل ہے فاصلہ جس میں
جو میں زمیں کی طرح ہوں، وہ آسماں کی طرح

(۱۱ر جون ۲۰۰۴ء)

○

بہت اُداس، بہت سوگوار رہتا ہے
کسے بتاؤں کہ دل بیقرار رہتا ہے
کسی سے مل کے بچھڑنے کا غم غنیمت ہے
نشہ تو ٹوٹ چکا ہے، خمار رہتا ہے
جدھر سے آتی ہیں کلیاں کھلاتی یادِ نسیم
اسی طرف تو وہ جانِ بہار رہتا ہے
ہمارے بیچ میں بس ایک موجِ خوں ہے سروشؔ
وہ روحِ حرف و قلم، اس کے پار رہتا ہے

(۱۲ر اگست ۲۰۰۴ء)

○

سونی سونی ہے ڈگر
اور میں گرمِ سفر

زندگی میرے لیے
درد کی راہگذر

جانے کیسا یہ مکاں
کوئی دیوار نہ دَر

آدمیت کا زوال
عیب بن جائے ہنر

سر بہ سر ایک سراب
سیم و زر کا یہ نگر

آگئے سامنے وہ
بجھ گئے شمس و قمر

آسماں زیرِ قدم
ہے یہ معراجِ بشر

بعد مدت کے کھلا
دل ہے اللہ کا گھر

نام بیشک ہے سروشؔ
ہوں مگر خاک بسر

(۲۱ر ستمبر ۲۰۰۴ء)

○

بستی بستی شعلے بھڑکے ، مسکن مسکن آگ لگی
نفرت کی آتش بازی سے ، آنگن آنگن آگ لگی

مظلوموں کے دل کا دُھواں چھایا شاید بادل بن کر
یہ کیسا پانی برسا ہے ساون ساون آگ لگی

مٹی تو زرخیز بہت ہے ، بیج ہی کچھ زہریلے تھے
کھیتوں میں شعلے اُگ آئے ، خرمن خرمن آگ لگی

اس گھر میں آئے تو کہاں سے آخر شیطانی چہرے
چیخ گئے سارے آئینے ، درپن درپن آگ لگی

کیسے پریم کی مالا گوندھوں ، کچھ بھی نہیں کانٹوں کے سوا
جھلس گئے سب پھول ، یہ کیسی گلشن گلشن آگ لگی

اب کے برس تو شہرِ ہوس میں دل والوں کی خیر نہیں
شعلہ رخوں کا ایسا جھرمٹ ! چلمن چلمن آگ لگی

سینہ چاک ہے ، دم گھٹتا ہے ، دل سے خوں رِستا ہے سروشؔ
آنکھوں سے جب برسے آنسو دامن دامن آگ لگی

(۲۴ ستمبر ۲۰۰۴ء)

○

ایک شیشے کا مکاں ہے، مری ہستی کیا ہے
نقش بر آب رواں ہے، مری ہستی کیا ہے

لفظ ہی لفظ ہے، آواز کا نازک پیکر
نفسِ سوختہ جاں ہے، مری ہستی کیا ہے

اِک گماں ہے کہ حقیقت کی رہی جس کو تلاش
اِک حقیقت کا گماں ہے، مری ہستی کیا ہے

برگِ آوارہ ہے، آندھی میں اُڑا جاتا ہے
پرفشاں نقشِ خزاں ہے، مری ہستی کیا ہے

اِک غبارِ رہِ منزل ہے ہواؤں میں سروشؔ
بے ثباتی کا نشاں ہے، مری ہستی کیا ہے

(۱۱ر اکتوبر ۲۰۰۳ء)

○

یہ رونقیں ہیں کسی پارسا کے سائے میں
بھری پُری ہے یہ بستی دُعا کے سائے میں

وہ جس سے گاتے ہیں چشمے، چٹکتے ہیں غنچے
تمام حرف اسی اِک نوا کے سائے میں

نفس نفس ہے نئی زندگی کا سرچشمہ
چراغ جلتا ہے دل کا ہوا کے سائے میں

ہزار بار کیا قتل مجھ کو دُنیا نے
میں سربلند ہوں لیکن خدا کے سائے میں

یہ زندگی تو بہت بے لگام ہو جاتی
اگر نہ ہوتی نظامِ فنا کے سائے میں

شہیدِ عشق کی قسمت پہ رشک آتا ہے
ملی بقائے دوامی قضا کے سائے میں

سروشؔ مرکزِ تہذیب ہے یہ عالم خاک
مگر چُھپا ہوا حرص و ہوا کے سائے میں

○

یہ بے ترتیب سانسیں زندگی کی داستاں لکھیں
جو ہو لفظوں سے عاری درد کی ایسی زباں لکھیں
یہ گلگشتِ چمن کو کون آیا ، پھول کھِل اُٹھے
خراماں ہے جو گلشن میں ، اسے سروِ رواں لکھیں
جو تم دُنیا میں آئے ہو ، کچھ ایسا کام کر جاؤ
تمھارے نام کو ہر دور میں تاریخ داں لکھیں
سیاست ایسا مذہب ہے کہ جس میں جھوٹ ہے لازم
بنا پر مصلحت کی دشت کو بھی گلستاں لکھیں
سروشؔ خوش نوا تم نے ہر اِک موضوع اپنایا
تمھاری شاعری کو زندگی کی ترجماں لکھیں

(۲۴ ر ستمبر ۲۰۰۴ء)

○

جتنا لہو دیا تھا ، گیا سب ہی رائگاں
اب لے رہی ہے زندگی اِک اور امتحاں
وجہِ سرورِ موجِ نفس برق پاشیاں
کیسے کہیں کہ برق جلاتی ہے آشیاں
گلگشت کرتے کرتے گزاری ہے ایک عمر
اب آخری پڑاؤ ہے شعلوں کے درمیاں
ہے موجِ تند و تیز سے اب رشتۂ وفا
ساحل سے آتے آتے جلا دی ہیں کشتیاں
اِک دشتِ بے امانِ حقیقت ہے اور ہم
اِک ایک کر کے اُجڑی ہیں خوابوں کی بستیاں
نادیدہ حسن کی متلاش رہی نظر
مجھ کو لیے پھرا دلِ ناداں کہاں کہاں
اس کارگاہِ شوق میں کس کو بھلا ثبات
رفعت سروشؔ میں بھی ہوں مٹتا ہوا نشاں

(۶ ر دسمبر ۲۰۰۶ء)

○

(نذرِ غالبؔ)

جتنی یادیں تھیں نہاں دل میں، نماں ہو گئیں
کچھ چبھیں کانٹوں کی صورت، کچھ گل افشاں ہو گئیں

سینۂ سوزاں میں ہے جیسے چراغاں کا سماں
سب لکیریں درد کی لعلِ بدخشاں ہو گئیں

دل کو اب راس آ گئی ہے لذتِ ہجر و فراق
غم کی ساری کونپلیں گل ہائے خنداں ہو گئیں

فکرِ انسانی کی ساری جودتیں تھیں خواب میں
اس طرح جاگیں کہ تہذیبوں کے عنواں ہو گئیں

اک پرندہ آسماں در آسماں اُڑتا گیا
رفتہ رفتہ سب نہاں راہیں نمایاں ہو گئیں

بزمِ امکاں کے بہت گوشے ابھی تاریک ہیں
کس طرح کہہ دوں کہ سب شمعیں فروزاں ہو گئیں

یہ جہانِ نو بسا ہے ملبۂ تاریخ پر
کتنی تہذیبیں اسی ملبے میں پنہاں ہو گئیں

آشیاں کی راکھ سے اُڑنے لگیں چنگاریاں
بلبلیں مجبور ہو کر شعلہ ساماں ہو گئیں

اے سروشؔ اس دور میں طرزِ غزل گوئی ہے اور
علم و فن کی سب حسیں قدریں گریزاں ہو گئیں

(۷؍دسمبر ۲۰۰۴ء)

○

ہے زمیں سے آسماں تک تیرگی ہی تیرگی
کچھ بتا اے وقت! کتنی رات باقی ہے ابھی

زندگی کی ہر نفاست مسخ ہو کر رہ گئی
ہے اگر اس دور کی پہچان تو بے چہرگی

اوّل اوّل جب رکھا تھا کوئے جاناں میں قدم
ہر صدا میں شاعری تھی، ہر نفس میں نغمگی

چرخِ رفتار، کوہ و دشت، بحرِ بے کنار
اور ہے ان کے مقابل منحنی سا آدمی

ایک ذرّے کی حقیقت سے بھی جو واقف نہیں
وائے نادانی! کہ اس کو ہے غرورِ آگہی

میں دِوانہ تھا، سدا اس کے تعاقب میں رہا
اِک چھلاوے کی طرح بھاگی ہے مجھ سے روشنی

زلزلے بوئے گئے روزِ ازل جس میں سروشؔ
اس ستارے پر مجھے بخشی گئی ہے زندگی

(۱۲رد سمبر۲۰۰۲ء)

○

حریفِ گردشِ کون و مکاں ہوں
زمیں پر میں نیا اِک آسماں ہوں

رہوں خاموش تو کوہِ گراں ہوں
جو لب کھولوں تو میں آتش فشاں ہوں

بہت ڈھونڈا مجھے اہلِ خرد نے
مگر بتلا نہ پائے میں کہاں ہوں

میں اِک آواز کا حرفِ مجسم
ہزاروں بار مٹ کر جاوداں ہوں

مری تخلیق اب تک اِک معمہ
کسی محبوب کا نقشِ عیاں ہوں

عناصر مجھ میں پوشیدہ ازل سے
میں اپنی ذات سے اِک کارواں ہوں

مجھے لکھا نہ جانے کس قلم نے
نہیں جو مٹ سکی وہ داستاں ہوں

(۱۵ر جنوری ۲۰۰۵ء)

○

کنکر، پتھر، پھول اور کانٹے، لے لو جو کچھ ہات لگے
ملتا ہے جو اس کی گلی سے پیار بھری سوغات لگے

موت کے سائے دھرتی پر کتنے لمبے، کتنے گہرے
سورج، چاند، ستارے، کالے، صدیوں لمبی رات لگے

اتنے دریا، اتنے سمندر، اتنے پہاڑ، اتنے جنگل
رنگ برنگی یہ دنیا تو شیوجی کی بارات لگے

ہم نے بھی جیون بگیا کی سیر بہت کی ہے یارو
پھول کبھی جو توڑنا چاہے، انگارے ہی ہات لگے

جانے کب سے تم سرِ ساحل سر تھامے بیٹھے ہو سروشؔ
ساری عمر کھنگالا ساگر، موتی بھی کچھ ہات لگے!

(۱۶ر مئی ۲۰۰۵ء)

○

بدن کے ماورا کچھ ہے، مگر کیا؟ خرد کو ہے بھلا اس کی خبر کیا
کروڑوں سال کی کہنہ زمیں پر اِک انساں کی حیاتِ مختصر کیا
بدلتی رہتی ہیں قدریں ہمیشہ ہے کیا نامعتبر اور معتبر کیا
نہ جانے کب سے رستہ دیکھتا ہوں کہیں گم ہوگیا ہے نامہ بر کیا
جسے ہم راستے میں چھوڑ آئے
وہی تھا کارواں کا راہبر کیا!! (۱رفروری ۲۰۰۵ء)

○

ہم موتیوں کے دھوکے میں پتھر سمیٹ لائے
تھے تشنہ لب، تو گھر میں سمندر سمیٹ لائے
کب خالی ہاتھ لوٹے ہیں ہم بزمِ ناز سے
نظروں میں بھر کے نور کے پیکر سمیٹ لائے
ہنگامۂ حیات کی رونق ہے اور ہم
بزمِ ازل سے شورشِ محشر سمیٹ لائے
اے اہلِ عدل کیجیے اب ہم کو سنگسار
ہم خود ہی اپنے واسطے پتھر سمیٹ لائے
چاروں طرف خزاں ہے، بگولوں کا رقص ہے
ہے کوئی جو بہار کا منظر سمیٹ لائے
اِک یاد بن کے رہ گئی اب میکدے کی شام
ٹوٹے پڑے تھے جو خم و ساغر سمیٹ لائے
رفعت سروشؔ مشقِ سخن کا ہے یہ صلہ
اشعار میں زبان کے تیور سمیٹ لائے (۲رفروری ۲۰۰۵ء)

○

میرے دل میں اِک سمندر پیچ وخم کھاتا ہے ہردم
مضطرب سا اِک نظامِ بے یقینی مجھ میں قائم

جسم ہے اِک راگنی ، سارے عناصر جیسے سرگم
ایک سُر بھی گر غلط لگ جائے ، تو پھر گیت مبہم

کوئی منزل ہے نہ جادہ ، ہر قدم ہے بے ارادہ
زندگی کی وادیوں میں ہم سفر ہے سعیٔ پیہم

یہ کہاں لے آئی مجھ کو اے مری عمرِ گریزاں
یاں نہ خلق و مہر و الفت ، اور نہ رسمِ ربطِ باہم

چل رہے ہیں لوگ کاندھوں پر اُٹھائے اپنی لاشیں
کونسی دنیا میں آخر آگئے اے زندگی ہم

موت اپنے ساتھ لے جائے گی تو کتنے جنازے
بزمِ اردو میں ہوا جاتا ہے اب تو ہُو کا عالم

اے سروشؔ اب جی اُلجھتا ہے ہجومِ بے اماں سے
ہو وہ ہنگامہ خوشی کا ، یا ہو برپا شورِ ماتم

(۳/مارچ ۲۰۰۵ء)

○

انتظارِ شدّتِ تاثیر کھینچ
آخرِ شب نالۂ دلگیر کھینچ

سینۂ سوزاں سے غم کا تیر کھینچ
دل سے اپنے درد کی شمشیر کھینچ

اپنی جرأت اپنی ہمت آزما
ہاتھ پر اپنے خطِ تقدیر کھینچ

کچھ زیادہ تیزرو ہے زندگی
ہوسکے تو وقت کی زنجیر کھینچ

تیرے ترکش میں بہت کچھ ہے ابھی
حوصلہ رکھ، ہر نفس اِک تیر کھینچ

ہوچکا کہنہ نظامِ زندگی
آدمیت کی نئی تصویر کھینچ

ہر طرف یورش اندھیرے کی سروشؔ
آسمانوں سے نئی تنویر کھینچ

(۴/مارچ ۲۰۰۵ء)

○

پاشکستہ، دل گرفتہ، سر بہ سر آشفتہ حال
ان دِنوں چھائی ہوئی ہے ذہن پر گردِ ملال

چبھ رہی ہیں ریزہ ریزہ کرچیاں احساس کی
اِک طلسماتی فضا، ہر سمت ہیں یادوں کے جال

بھولے بسرے خواب تازہ وارداتوں کی طرح
کسمسائے، رات بھر کرتے رہے مجھ سے سوال

ایک لمحہ وقت کی قندیل کا روشن ہوا
پھلجھڑی چھوٹی خیالوں کی، ہوا جشنِ وصال

دوسرا لمحہ! ستارہ ٹوٹ کر جیسے گرا
رفعتِ تخئیل کا دیکھا نہ تھا اتنا زوال

(۲۰/اپریل ۲۰۰۵ء)

○

نہ سوچو دور ہے منزل، چلو جب تک چلا جائے
نفس کے ساز پر گاؤ، جیو جب تک جیا جائے

ہوا کی زد پہ رہنا اور لڑنا بھی اندھیروں سے
چراغو! رات ہے لمبی، جلو جب تک جلا جائے

مداوا زندگی کے درد کا ممکن نہیں، لیکن
دریدہ دامنِ ہستی سیو جب تک سیا جائے

یہ میخانہ ہے یاں سب کو بقدرِ ظرف ملتی ہے
اُٹھاؤ جام خود بڑھ کر پیو جب تک پیا جائے

سروشؔ افسانۂ ہستی ادھورا تھا ادھورا ہے
تمھارا امتحاں ہے اب، لکھو جب تک لکھا جائے

(۲۰ مئی ۲۰۰۵ء)

○

نئی جنتوں کی تلاش میں میں جہنموں سے گزر گیا
یہ دِوانہ فصلِ بہار کا کئی حادثوں سے گزر گیا

میں سفر نصیب ازل سے ہوں کہ عجیب ہے مری داستاں
کبھی ساحلوں سے گزر گیا، کبھی منزلوں سے گزر گیا

وہ فریب خوردۂ آگہی تو رہا خرد کے حصار میں
میں گزر کے ہوش وحواس سے نئی رفعتوں سے گزر گیا

جنھیں اپنے آپ پہ ناز تھا وہ جہاز غرق ہوئے مگر
میں وہ اِک شکستہ سفینہ ہوں جو سمندروں سے گزر گیا

میں وہ خاک ہوں سوئے آسماں جسے آندھیوں نے اُڑا دیا
میں ہوں ایک ذرّۂ ناتواں جو بلندیوں سے گزر گیا

میں قلم کا ایسا سفیر ہوں جسے طرزِ نو کی تلاش ہے
میں روایتوں سے گزر گیا، میں حکایتوں سے گزر گیا

میں سروشؔ بندۂ ناتواں، تو فروغِ محفلِ دو جہاں
تری چاہ میں کبھی دار سے، کبھی مقتلوں سے گزر گیا

(۷؍جون ۲۰۰۵ء)

○

دشتِ تنہائی میں وارفتہ بگولہ بن جاؤں
خود تماشائی بنوں، خود ہی تماشہ بن جاؤں

ایک جلوہ جو نظر آئے سرِ طورِ جمال
رقصِ مستانہ کروں، پیکرِ سجدہ بن جاؤں

تیری یادوں کی صبا آئی ہے لہراتی ہوئی
کیوں نہ ہوں گرمِ سخن، اور گلِ نغمہ بن جاؤں

کیا خبر کونسی تصویر پسند آئے اُسے
کبھی آنسو کبھی نغمہ، کبھی شعلہ بن جاؤں

یہ زمیں کتنی حسیں، نازشِ ہستی ہے سروشؔ
اس کی انگشتِ حنائی کا نگینہ بن جاؤں

(۲۲ رجون ۲۰۰۵ء)

○

ایسا کیوں لگتا ہے جیسے اُن سے بچھڑے صدیاں گزریں
خواب سا اِک دیکھا تھا گویا، گھر سے نکلے صدیاں گزریں

رُوٹھ گیا ہے مجھ سے بچپن، اب تو کچھ ایسا لگتا ہے
جیسے نگینہ کی گلیوں میں کھیلے کودے صدیاں گزریں

لہر لہر بیتابیٔ دل ہے، قطرہ قطرہ اشک آلودہ
غم کے اس ساگر میں کشتی کھیتے کھیتے صدیاں گزریں

روز نئی کلیاں کھلتی ہیں، باغوں میں آتی ہیں بہاریں
اب آئی اب آئی قیامت، سنتے سنتے صدیاں گزریں

بھولے سے اِک پھل چکھا تھا باغِ خرد کے اِک گوشے میں
یہ پاداش! کہ انگاروں پر چلتے چلتے صدیاں گزریں

جو کہنا تھا، کہہ نہیں پایا، لوح و قلم کو عاجز پایا
حرفِ محبت لکھتے لکھتے، لکھتے لکھتے صدیاں گزریں

ایک زمانہ تھا جب اس کو خط پر خط لکھتا رہتا تھا
اب تو سروشؔ اس جانِ وفا کا نام بھی لکھے صدیاں گزریں

(۲۶ راگست ۲۰۰۵ء)

○

درد اگر آنکھوں تک آئے، آنسو بن کر بہنے دے
روک نہ ان گیلے لفظوں کو جو کہتے ہیں کہنے دے
تیری میری باتوں سے جی اور اُلجھتا ہے میرا
میٹھا میٹھا درد ہے دل میں چپکے چپکے سہنے دے
آئی یادوں کی پُروائی زخمِ جگر سے ملنے کو
کھل کر ان کو مہکنے دے، اب ان کا مداوا رہنے دے
اس کا نام زمانہ ہے، نکتہ چینی اس کی عادت
کان نہ دھر اس کی باتوں پر جو کہتا ہے کہنے دے
اِک دن فکرِ سخن کا سوتا ہو جائے گا خشک سروشؔ
دریا ہے یہ لفظوں کا جب تک بہتا ہے بہنے دے

(۶/اکتوبر ۲۰۰۵ء)

○

جب بھی یاد آتا ہے اس شوخ کی تحریر کا رنگ
چھن کے لفظوں میں چلا آتا ہے تصویر کا رنگ
وہ کھلاڑی ہوں کہ ہر پانسہ پڑے ہے اُلٹا
اور رہ رہ کے بدل جاتا ہے تدبیر کا رنگ
اُجڑے اُجڑے سے مکاں، صحنِ چمن وقفِ خزاں
کیا حسیں خواب تھے، اور کیسا ہے تعبیر کا رنگ
کون ہے تو کہ تصوّر میں ترے آتے ہی
پھیل جاتا ہے فضا میں تری تنویر کا رنگ
وہ سرِ بزم افگندہ نقاب آئے سروشؔ
دیکھنا پھر مرے اشعار کی تاثیر کا رنگ

(۶/اکتوبر ۲۰۰۵ء)

○

بہت دیا ہے مجھے تُو نے ، اور کیا مانگوں
ہوس کدے میں قناعت کا حوصلہ مانگوں

تمام عمر رہا آندھیوں کی رَو پہ مگر
ہر اک کلی کے لیے دامنِ صبا مانگوں

تمام رنگِ جہاں مل کے ایک ہو جائیں
وہ آسمان ، وہ ماحول ، وہ فضا مانگوں

بنا رہا ہوں میں تصویر اپنے بچپن کی
سرہانے رات کو مٹّی کا اِک دِیا مانگوں

خدا وہ دن نہ دکھائے مجھے محبت میں
کہ جب میں اپنی وفاؤں کا کچھ صلہ مانگوں

سجاؤں یاد میں اس کی عروسِ فطرت کو
ہوا کے دوش پہ تاروں کی اِک ردا مانگوں

نہیں ہے کوئی مداوا غمِ نہاں کا سروشؔ
میں اپنے گرد دعاؤں کا دائرہ مانگوں

(۵/اکتوبر ۲۰۰۵ء)

○

ہمارے ساتھ عجب حادثہ ہوا ، یعنی؟
ہمیں قرار دیا زندگی نے لایعنی

ہمارا قتل ہوا اور ہمیں بنے مجرم
ہمارے حق میں غلط فیصلہ ہوا یعنی

مرا ہر ایک عمل جب سزا کا موجب ہے
تو اپنی ذات کا دشمن میں خود ہوا یعنی

پہنچ گئے سرِ منزل جو راہی بچھڑے تھے
بھٹک گیا کہیں رستے میں قافلہ یعنی

کبھی کبھی تو اچانک وہ یاد آتے ہیں
کہ قطع ہو کے ہی باقی ہے سلسلہ یعنی

ہمارے سازِ نفس کے الگ الگ ہیں سُر
ہمارے بیچ ابھی باقی ہے فاصلہ یعنی

بہت دنوں سے کسی کو خبر نہیں اس کی
سروشؔ وادیٔ الفت میں کھو گیا یعنی

(۱۲/اکتوبر ۲۰۰۵ء)

○

فقر پر تکیہ ہو جس کا، ہے دلوں پر اس کا راج
ہیچ ہے اس کی نظر میں مال و دولت، تخت و تاج

باعثِ عزّت نہ کل تھی شاعری اور ہے نہ آج
دے رہا ہوں میں تو بچپن سے غریبی کو خراج

جانتا ہوں کامرانی ہے خوشامد کا ثمر
اہلِ دولت سے مگر ملتا نہیں اپنا مزاج

زندگی ہم نے گزاری اِک قلندر کی طرح
بارہا سولی چڑھے، پہنا سدا کانٹوں کا تاج

آمریت، تانا شاہی، دہشت و غارت گری
مختلف شکلوں میں اب بھی جی رہا ہے سامراج

جھوٹ، مکّاری، دغا، وعدہ خلافی، سب روا
عام لوگوں سے جدا اہلِ سیاست کا سماج

خاکساری شیوۂ اربابِ دانش ہے سروشؔ
اپنی دنیا میں نہیں ہے خود نمائی کا رواج

(۲۲؍اکتوبر ۲۰۰۵ء)

○

زلزلوں پر زلزلے ، طوفانِ بحرِ بے کنار
زندگی اب واہمہ ہے، کل بھی تھی بے اعتبار

جنت و دوزخ کی تمثیلیں بھی ہیں زیرِ زمیں
مخزنِ لعل و گہر بھی ہے یہ شعلوں کا دیار

سوچتا ہوں کتنی تہذیبیں ملی ہیں خاک میں
ہر نئی تہذیب کی بنیاد ماضی کا مزار

درسِ عبرت بن گیا خود اہلِ دانش کا غرور
یوں نہ ہو گر ، آدمی بن جائے گا پروردگار

دیکھتی ہے آنکھ، ہر اک سمت ہے چھائی خزاں
اُٹھ رہا ہے دل میں لیکن ایک طوفانِ بہار

کتنی صدیوں کی حسیں اقدار کا وارث ہوں میں
پھر کہوں کیسے ! سبھی کچھ ہے یہاں ناپائدار

کیا سمجھتا ہے زمانہ، اس سے کیا مطلب سروشؔ
ہم نے اپنے آپ کو سمجھا ہمیشہ خاکسار

(۱۴/۱۱ اکتوبر ۲۰۰۵ء)

○

اس شہرِ قید و بند میں آزادیٔ خیال!!
سونی پڑی ہے محفلِ رنگینیٔ خیال

الفاظ بے زبان ہیں، بے جان، بے صدا
ان کی رگوں میں گر نہ ہو رعنائیِ خیال

ہوں موردِ عتاب تو کر جسم و جاں کو قید
لیکن یہ کیا مذاق ! کہ پابندیٔ خیال!!

حصّے میں ان کے آئی زر و مال کی ہوس
اپنی متاعِ زیست مگر شوخیٔ خیال

ہوں دست و پا شکستہ تو دل کو سنبھال لوں
لیکن عذابِ جاں ہوئی بے ربطیٔ خیال

بزمِ تصوّرات میں یادوں کا اِک ہجوم
تنہائی کی رفیق ہے نیرنگیٔ خیال

اس پیکرِ جمال کو ڈھونڈیں کہاں سروشؔ
تھی جس کے دم سے ندرت و رعنائیِ خیال

(۲۰ر اکتوبر ۲۰۰۵ء)

○

اِک غزل اور بھی اس شوخ، طرحدار کے نام
چشمِ میگوں کے لیے عارضِ گلنار کے نام

شعلہ رو، سیم بدن، پیکرِ افسونِ بہار
دل نے اس شوخ کے رکھے ہیں کئی پیار کے نام

جانے کیا کیف تھا، کیا سحر تھا، کیسی تھی کشش
کردیئے نذرِ دل و جاں، نگہِ یار کے نام

خط تو پھر لکھا ہے، اب دیکھیے کیا آئے جواب
جس میں اقرار تھا، اس شوخیٔ انکار کے نام

اپنے لہجے کی نزاکت، وہ حلاوت، وہ سرور
کردیا اس نے بھی کچھ مرے اشعار کے نام

حسن کی نیم نگاہی کا سلام آیا تھا
ہم نے بھی لکھ دیا خط نرگسِ بیمار کے نام

کہہ کے رفعتؔ مجھے جب اس نے پکارا تھا سروشؔ
ایک تصویرِ سخن اس لبِ گفتار کے نام

(۲۹ر نومبر ۲۰۰۵ء)

○

یاد کا پیڑ اتنا سوکھ گیا
کوئی پتہ بچا، نہ گل بوٹا

یہ کھنڈر اور اِک اکیلا میں!
کاٹنے دوڑتا ہے سناٹا

صبح آئی مگر دریدہ بدن
پہنے پھولوں کی چاک چاک قبا

جب زمیں ہی نہ ہوسکی اپنی
آسماں سے بھلا شکایت کیا

جانے کیوں آج خشمگیں سورج
ڈوبتے ڈوبتے بہت رویا

ذہن ماؤف ہوتا جاتا ہے
آج میں اپنا نام بھول گیا

آستینوں میں سانپ پالے ہیں
مشغلہ ہے یہ زندگی بھر کا

(۲۲ر نومبر ۲۰۰۵ء)

○

یتیموں کی کہانی ، بے زبانوں کا بیاں لکھنا
بہت ہم نے قلم توڑے ، مگر آیا کہاں لکھنا
ہمیشہ ساتھ رہتی ہے ہر اِک لمحہ، ہر اِک ساعت
بہت مشکل ہے لیکن زندگی کی داستاں لکھنا
جہاں ٹوٹی اُمیدیں ، آرزوئیں سانس لیتی ہوں
کھنڈر ہو جو محبت کا اسے میرا مکاں لکھنا
مورّخ کشتگانِ دہر کا جب باب لکھنا ہو
ہمارے زخم ہیں تازہ ، ہمارا بھی بیاں لکھنا
ہزاروں کارواں بھٹکے ہوئے ہوں جس بیاباں میں
اسے ہم سفر تہذیبِ حاضر کا جہاں لکھنا
یہ بوڑھے پیڑ جانے کتنے طوفانوں کے کھیلے ہیں
بزرگوں کو ہمیشہ رحمتوں کا سائباں لکھنا
تمھارے ساتھ ہمت ہے، یقیں ہے عزمِ محکم ہے
اکیلے بھی چلو گر تم تو خود کو کارواں لکھنا
ہمارا قافلہ منزل بہ منزل بڑھتا جاتا ہے
گذشتہ ساری تہذیبوں کو گردِ کارواں لکھنا
منظّم سازشوں سے بھی مٹانا جس کو ناممکن
محبت کی ہے وہ سوغات اسے اُردو زباں لکھنا
بہاریں بیچ ڈالے اور خزاں بووے گلستاں میں
قیامت ہے سروشؔ اس کو چمن کا باغباں لکھنا

(۶ر دسمبر ۲۰۰۵ء)

○

چاند تارے دھیرے دھیرے چل رہے تھے رات بھر
اونگھتے سائے درختوں کے کھڑے تھے رات بھر

شانۂ موج صبا پر رکھتے ہی سر سو گئے
ہم تھکے ماندے تھے اور جاگے ہوئے تھے رات بھر

صبحِ نو آئی تو شبنم نے مٹا ڈالا انھیں
ہم نے اشکوں سے جو افسانے لکھے تھے رات بھر

ہو رہی تھیں آفتوں کی بارشیں چاروں طرف
آسمانوں سے ستارے ٹوٹتے تھے رات بھر

اپنے کاندھوں پہ زمین و آسماں کا بوجھ تھا
اور فرشتے جانے کیا کیا لکھ رہے تھے رات بھر

دن کے سب ہنگامے پھر انگڑائیاں لے کر اُٹھے
نیند کیا آتی ، مگر لیٹے رہے تھے رات بھر

اے سروشؔ اِک یاد ایسی بھی ہے میرے ذہن میں
مہوشوں کے قہقہے اور زمزمے تھے رات بھر

(۶ر جنوری ۲۰۰۶ء)

○

پہلے آجاتی تھی انگاروں پہ نیند　اور اب آتی نہیں پھولوں پہ نیند
جاگتی آنکھیں جو کرلیتا ہوں بند　سوتی رہتی ہے مری پلکوں پہ نیند
رات آئی خواب کے پیکر لیے　چھاگئی دُنیا کے ہنگاموں پہ نیند
کوئی دستک ہے نہ آہٹ آج رات　دیتی ہے پہرہ جو دروازوں پہ نیند
نیند ہے اِک ذائقہ احساس کا　سحر ساماں سوچ کی لہروں پہ نیند
ریشہ ریشہ اس کا زخمی ہوگیا　لوٹتی ہے غم کے انگاروں پہ نیند
آج کس کی یاد آئی اے سروشؔ
رُک گئی ہے آکے جو پلکوں پہ نیند

(۳؍جنوری ۲۰۰۶ء)

○

برق کی زد میں، گھٹاؤں کے نشانے پر ہے　آشیاں اپنا ہواؤں کے نشانے پر ہے
پھول ہی پھول جہاں کھلتے تھے ہر موسم میں　وہ چمن آج خزاؤں کے نشانے پر ہے
علم کے زعم میں فطرت کو کیا ہے پامال　آدمی اپنی خطاؤں کے نشانے پر ہے
لطف آئے گا بہت زخم جگر سینے میں　خیر سے عشق جفاؤں کے نشانے پر ہے
ایک اُمید کی مشعل ہے کہ بجھتی ہی نہیں　کب سے بے رحم ہواؤں کے نشانے پر ہے
وقت شاطر ہے، نہیں دوست کسی کا بھی سروشؔ
ہر بشر اس کی اداؤں پہ نشانے پر ہے

(۳؍جنوری ۲۰۰۶ء)

○

(نذرِ غالب)

چمن کے منظرِ وحشت اثر کو دیکھتے ہیں
قفس میں ٹوٹے ہوئے بال و پر کو دیکھتے ہیں

ہے جس کے سامنے شرمندہ فتنۂ چنگیز
ہم اپنے دَور میں اس فتنہ گر کو دیکھتے ہیں

یہ زندگی کا تسلسل! کہیں رُکے نہ تھمے
مدام گردشِ شام و سحر کو دیکھتے ہیں

پسِ غبارِ فضا کہکشاں ستاروں کی
اس آئینے میں جہانِ دگر کو دیکھتے ہیں

گزر کے صدیوں کی تہذیب کے اندھیروں سے
ہم اپنے دور کے شمس و قمر کو دیکھتے ہیں

یقین ہی نہیں ان کو خدا کی رحمت پر
دُعا کے بعد جو بابِ اثر کو دیکھتے ہیں

سروشؔ عمر گزاری ہے خوابِ غفلت میں
ہے چل چلاؤ، تو رختِ سفر کو دیکھتے ہیں

(۲۲ر فروری ۲۰۰۶ء)

○

میں اب بھی دل میں سجاتا ہوں اس کی تصویریں، اسے خبر ہی نہیں
میں اب بھی راتوں کو پڑھتا ہوں اس کی تحریریں، اُسے خبر ہی نہیں

وہ ایک رُوپ ہے اندازِ بے نیازی کا، جنوں نوازی کا
ہیں اس کے نام سے منسوب دل کی جاگیریں، اُسے خبر ہی نہیں

وہ اب بھی ہے مرے فکر و خیال کا محور، حسین پس منظر
ہیں میرے شعروں میں اس مہ جبیں کی تنویریں، اسے خبر ہی نہیں

مجھے خبر ہے وہ فطرت سے ہے بہت آزاد، مگر فریاد!
ہیں اس کے پاؤں میں اب بھی بہت سی زنجیریں، اُسے خبر ہی نہیں

وہ دُور ہے میری نظروں سے، میری دُنیا سے، غموں کے صحرا سے
میں اب بھی کرتا ہوں ملنے کی اس سے تدبیریں، اُسے خبر ہی نہیں

(۱۳/مارچ ۲۰۰۶ء)

○

وصل کے لمحے چھم چھم کرتے اُترے یادوں کے آنگن میں
ماضی کی کتنی تصویریں جاگ اُٹھیں من کے درپن میں

بادِ صبا کا آنچل اوڑھے شرمائی شرمائی کلیاں
دھیرے دھیرے کھلتی جائیں، آئیں بہاریں دل کے چمن میں

اب کے بہاروں کے موسم میں ویرانی سی ویرانی ہے
پھول تو کیا، کانٹے بھی نہیں ہیں آج مرے خالی دامن میں

کارے کجرارے نینوں کے گیت فضا میں گونج رہے ہیں
میں جانے کیوں دیکھ رہا ہوں آنسو اِک دُلہن کے نین میں

یادوں کی اِک کملی اوڑھے سارا جیون سکھ سے بیتا
گھر سے نکلا تو وہ کملی چھوڑ آیا میں پاگل پن میں

ندی، نالے، جنگل، پربت، سات سمندر، چاند، ستارے
سب سے میرا گہرا رشتہ، سب کا سکھ میرے جیون میں

اپنے عیب میں خود ہی جانوں، پھر بھی سروشؔ ایسا لگتا ہے
دیکھ رہا ہے دور سے سب کچھ، بیٹھا ہے کوئی چلمن میں

(۱۳/اپریل ۲۰۰۶ء)

○

خلا میں اُڑتے چمکتے مکان کس کے ہیں
نہیں ہمارے تو سات آسمان کس کے ہیں

ہمارے عزم سے طوفاں سوال کرتے ہیں
ہوا سے لڑتے ہوئے بادباں کس کے ہیں

سنا ہے شہر میں سب لوگ خیریت سے ہیں
جلے جلے سے مگر یہ مکان کس کے ہیں

یہ پال پوس کے کل ہم کو بیچ ڈالیں گے
درخت سوچ میں ہیں، باغباں کس کے ہیں!

تمھارے چہرے پہ غازہ ہے پارسائی کا
تو پھر فرشتے جولائے بیان، کس کے ہیں؟

سروشؔ تم تو ہمیشہ ہی مسکراتے ہو
مگر یہ زخمِ جگر ترجمان کس کے ہیں

سروشؔ غالبؔ و اقبالؔ کے نہیں ہمسر
مگر یہ فخر تو ہے، ہم زبان کس کے ہیں!

(۲۶ر مارچ ۲۰۰۶ء)

○

راہِ طلب میں بھٹکے دِوانے کہاں کہاں
لائے گئے ہیں مقتلِ جاں میں کشاں کشاں

ہم سرخرو رہے ہیں ہر اِک امتحان میں
لے کر گئی ہے گردشِ دوراں جہاں جہاں

آلامِ روزگار تھے پہلے سے واں مقیم
دل لے گیا تلاشِ سکوں میں جہاں جہاں

ویران میکدوں میں، سرابوں کے دشت میں
یہ تشنگی لیے پھری مجھ کو کہاں کہاں

دل جل کے خاک ہو چکا، اب کیا بچا سروشؔ
لگتا ہے جیسے پورا بدن ہے دُھواں دُھواں

(۳۰ر اپریل ۲۰۰۶ء)

○

شامِ غم نے جو در پہ دستک دی — دل نے ڈر کر جگر پر دستک دی
آخرِ شب کھلا جو بابِ قبول — پھر دُعا نے اثر پہ دستک دی
شوخ یادوں کے ایک لشکر نے — رات دل کے نگر پہ دستک دی
گردشِ وقت کو یہ کیا سوجھی — ناگہاں میرے گھر پہ دستک دی
تیرگی منہ چھپائے پھرتی ہے — چاند نے بحر و بر پہ دستک دی

آدمی کا ہے یہ عروج سروشؔ
بڑھ کے شمس و قمر پہ دستک دی

(۳۰ر اپریل ۲۰۰۶ء)

○

تھا ہمیشہ تیغِ جوہردار سے بہتر قلم
وقت آنے پر لڑا تلوار سے اکثر قلم

یہ متاعِ علم و عرفاں، ہے یہ دولت لازوال
لعل و گوہر کا خزانہ بھی نہ لوں دے کر قلم

آدمیت خوں دے کر سرخرو ہوتی رہی
مقتلِ حق و صداقت میں ہوئے ہیں سر قلم

بادشاہوں کے ہوئے ہیں کتنے چہرے بے نقاب
مجلہ تاریخ میں دیکھے جو خوں سے تر قلم

تاجرانِ علم و دانش بھی اسی دنیا میں ہیں
یہ حقیقت ہے مگر، بکتا نہیں ہے ہر قلم

حامیٔ امن و امان نے قتل کا محضر لکھا
علم بھی سکتہ میں ہے اور رہ گیا ششدر قلم

کچھ نہ غالبؔ کو ملا تھا، اور نہ کچھ پاؤ گے تم
لاکھ نکلو گھر سے رفعتؔ کان پر رکھ کر قلم

(۲رمئی ۲۰۰۶ء)

○

جبیں پہ شکن کیسی، نظر میں بے رُخی کیسی
وہی تم ہو، وہی میں ہوں، تو یہ بیگانگی کیسی

کتابِ زندگی کا ہر ورق بوسیدہ لگتا ہے
دمِ آخر اپنے آپ سے آزردگی کیسی

فریبِ مصلحت کا آئینہ مجھ کو نہ دِکھاؤ
کہا ہے درست جس کو اس سے آخر دشمنی کیسی

تیری دریادلی کا ذکر سن کر آئے تھے ساقی
پلائی تو نے جی بھر کر تو پھر یہ تشنگی کیسی

چراغِ فکر جلتا ہے مسائل کے اندھیروں میں
کرے دل کو نہ جو روشن وہ آخر شاعری کیسی

(۲۰رجون ۲۰۰۶ء)

○

شدّتِ گر یہ ہے کم ، زورِ فغاں کم ہوگیا ہے
آگ اب جلنے لگی ، دل میں دھواں کم ہوگیا ہے
اے دلِ آوارہ چل ڈھونڈیں کسی تازہ جہاں کو
سیر کرنے کے لیے یہ گلستاں کم ہوگیا ہے
میری سمت آتا نہیں ہے ٹوٹ کر کوئی ستارہ
اب مرے حصّے کا شاید آسماں کم ہوگیا ہے
کٹ رہا ہے ریزہ ریزہ اب بھی کوہِ جسم و جاں کا
ہاں مگر اتنا ہے احساسِ زیاں کم ہوگیا ہے
تذکرے اس میں رقیبوں کے، نہ ان کی بے رُخی کے
کیا سنیں رفعتؔ کہ لطفِ داستاں کم ہوگیا ہے

(۷/جولائی ۲۰۰۶ء)

○

حرمان وحزن ویاس کا ساگر نچوڑ دے — آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر نچوڑ دے
معلوم کچھ تو ہو کہ مری ہے بساط کیا — کشکول میں تو میرا مقدر نچھوڑ دے
اس نے کہا، میں قطرۂ آبِ حیات ہوں — کاغذ پہ میرا نام ہی لکھ کر نچوڑ دے
گنگا نئی نکال محبت کی ، پیار کی — کوہِ خلوص و مہر کے پتھر نچوڑ دے
ممکن ہے چار بوندیں ہوں میرے بھی نام کی — رحمت کے آسمان کی چادر نچوڑ دے
میں بادہ کش پرانا ہوں اے ساقیٔ بہار — صہبا میں آج نورِ گلِ تر نچوڑ دے

اس میں گناہ اور ندامت کا ہے حساب
پیشِ خدا سروشؔ یہ محضر نچوڑ دے

(۲۸/جولائی ۲۰۰۶ء)

○

کاغذی پھولوں سے گلدان سجاؤں کیسے
جشن نوروزِ محبت کا مناؤں کیسے

بستیاں شعلوں کے جنگل میں ہوئی ہیں تبدیل
پیار کے ساز پہ نغمات سناؤں کیسے

پے بہ پے ٹوٹتے رہتے ہیں فلک سے تارے
اپنے چھوٹے سے گھروندے کو بچاؤں کیسے

روز ہوتا ہے نئے نادر و چنگیز کا جنم
شہرِ تہذیب و ثقافت کو بچاؤں کیسے

کل کی تصویر تو شفاف بنا سکتا ہوں
داغ تاریخ کے چہرے سے ہٹاؤں کیسے

سر جھکانے نہیں دیتی ہے مجھے میری اَنا
عہدِ حاضر کے خداؤں کو مناؤں کیسے

خوفِ رُسوائیِ احباب نے روکا ہے سروشؔ
داغ جو دل پہ لگے ہیں وہ دکھاؤں کیسے

(ق)

آئی حصے میں مرے نوحہ گری کس کس کی
کتنے احباب گئے ان کو بھلاؤں کیسے

ساحرؔ و جعفریؔ و کیفیؔ و اخترؔ، باقرؔ
مقبرے اتنے ہیں سینے میں سجاؤں کیسے

(۲۸؍اگست ۲۰۰۶ء)

○

کیا کہوں، تنہائی کے بارے میں سوچا ہے بہت
ساتھ چلنے کے لیے تو اپنا سایہ ہے بہت
جیت اس کی ہے اُٹھا سکتا ہے جو پہلا قدم
شورشِ طوفاں کی خاطر اک بگولہ ہے بہت
بے نیازی ، خود شناسی ، اعتماد و آگہی
تجرباتِ زندگی سے ہم نے پایا ہے بہت
ہم کو اقلیمِ سخن کی سلطنت کب چاہیے
اپنے حصے کی زمیں مل جائے اتنا ہے بہت
رونقِ بزمِ سخن ہے خوش نوا رفعت سروش
لیکن اپنی ذات سے وہ شخص تنہا ہے بہت

(۳۰/اگست ۲۰۰۶ء)

○

یہ میری شام کا منظر اداس ہے کتنا
دھواں دھواں سا مرے آس پاس ہے کتنا

چُنا مجھی کو غمِ لازوال کی خاطر
مرا کریم بھی جوہر شناس ہے کتنا

زوالِ عمر کی منزل عجیب منزل ہے
نفس نفس کا مجھے اپنے، پاس ہے کتنا

بنائی کس نے یہ آخر سماج کی تصویر
ہے چہرہ مسخ دریدہ لباس ہے کتنا

اب اپنے آپ سے بھی خوف کھا رہا ہوں سروشؔ
یہ قتل و خون مرے آس پاس ہے کتنا

(۳/ستمبر ۲۰۰۶ء)

○

فضائے رنگ و بُو نے لیں نئی انگڑائیاں رفعتؔ
بہار آئی، چلیں یادوں کی پھر پروائیاں رفعتؔ

مری مجبوریاں ، معذوریاں ، تنہائیاں رفعتؔ
مرے چاروں طرف ہیں درد کی پرچھائیاں رفعتؔ

یہ دلّی تو مجھے لگتا ہے جیسے شہرِ تنہائی
خوشا وہ بمبئی اور اس کی بزم آرائیاں رفعتؔ

بہاروں کا جنازہ آج جس آنگن میں رکھا ہے
اسی آنگن میں گونجی تھیں کل شہنائیاں رفعتؔ

ہوئی مدّت ، تمنا کا کوئی غنچہ نہیں کھلتا
مثالِ بادِ صرصر بن گئیں پروائیاں رفعتؔ

تمھارے حرف کی اقلیم میں ہر رنگ کا پرتو
کہاں سے لائے فکروفن کی یہ رعنائیاں رفعتؔ

تمھارا ذکر رہتا ہے حسینوں ، مہ جبینوں میں
مبارک ہوں مبارک تم کو یہ رُسوائیاں رفعتؔ

(۸/ستمبر ۲۰۰۶ء)

○

پھول سے لفظوں پہ اور زورِ خطابت کا بوجھ
تتلیاں کیسے سہیں دُھوپ کی شدّت کا بوجھ

ریشمی شال میں لپٹی ہوئی دوشیزہ ہے
کتنی نازک ہے غزل اس پہ قدامت کا بوجھ

چوُر ہو جائے نہ اِک روز یہ نازک شیشہ
فن کے کاندھوں پہ ہے اربابِ سیاست کا بوجھ

یہ تو آئینہ ہے شفّاف اسے رہنے دو
دل پہ کیوں رکھتے ہو تم اپنے کدورت کا بوجھ

مصلحت منزلِ دشوار میں لے آئی ہے
مار ہی ڈالے گا اِک روز مروّت کا بوجھ

زندگی میں کبھی ایسا بھی مقام آتا ہے
سہہ نہیں پاتا ہے انسان صداقت کا بوجھ

کیا کہوں، وقت ہی کاٹے نہیں کٹتا ہے سروشؔ
میرے اعصاب پہ اب طاری ہے فرصت کا بوجھ

(۸/نومبر ۲۰۰۶ء)

○

ملے گی منزلِ دشوار، ہے جو خوابوں میں
ابھی نہیں ہے تھکن جستجو کے قدموں میں

زمیں پہ اُتری نہیں ایک بھی کرن اب تک
اُلجھ کے رہ گیا سورج سنہری شاخوں میں

عطا ہوئی جنھیں عجز و خلوص کی دولت
وہ جیت لیتے ہیں دُنیا کو باتوں باتوں میں

نہ جانے کون سا غم ہے جو آشکار نہیں
اٹک کے رہ گیا اِک اشک میری پلکوں میں

کبھی تھا جن سے عبارت سرور و کیفِ بہار
وہ یاد آتے ہیں اکثر اُداس لمحوں میں

بدلتی قدروں نے تصویر ہی بدل ڈالی
وفا کا نام فقط رہ گیا کتابوں میں

یہ کس کے پیار کی سوغات ہے جنابِ سروشؔ
بچھائے کس نے ستارے تمھاری راہوں میں

(۲۱ر ستمبر ۲۰۰۶ء)

○

زندگی کا یہ مرحلہ ہے عجیب
ہے وہی دوست اور وہی ہے رقیب

آدمی شہرِ شوق کا معیار
اور پھر خود ہی مائلِ تخریب

جس کی بنیاد تھی خلوص پہ کل
ڈھے گئی وہ عمارتِ تہذیب

کتنی بوسیدہ ہے کتابِ حیات
منتشر سب ورق ہیں بے ترتیب

روزِ محشر نہیں تو پھر کیا ہے
سب کے ہاتھوں میں اپنی اپنی صلیب

ایک فانی ہے ایک لافانی
فرق یہ روح و جسم کا ہے عجیب

اس کی سانسوں کی آنچ میں نے سہی
موت تھی رات میرے اتنے قریب

کیسی خوشبو سی ہے فضاؤں میں
بس یہیں ہے کہیں دیارِ حبیب

کیوں مذمت سروشؔ کی =
وہ نہ ملاّ، نہ مولوی، نہ خطیب

(۱۰ر اکتوبر ۲۰۰۶ء)

○

پھر بہار آئی، جلیں صحنِ چمن کی مشعلیں
ذہن میں روشن ہوئیں فکرِ سخن کی مشعلیں

چاند سورج ہیں فقط قندیلِ ایوانِ فضا
اور دل کی روشنی ہیں علم و فن کی مشعلیں

تا قیامت ہم کریں گے ان شہیدوں کو سلام
جو فروزاں کر گئے دار و رسن کی مشعلیں

لاکھ طوفانِ حوادث بن کے آئیں آندھیاں
بجھ نہیں پائیں گی تہذیبِ کہن کی مشعلیں

نغمۂ ہستی یونہی لکھتا رہوں گا اے سروشؔ
جب تلک روشن رہے گی یہ بدن کی مشعلیں

(۲۱ر ستمبر ۲۰۰۶ء)

○

ادھر انفاس نے چھیڑا ربابِ شامِ تنہائی
دلِ افسردہ نے کھولی کتابِ شامِ تنہائی

ذرا دیکھے کوئی رنگِ حجابِ شامِ تنہائی
ستارے جب اٹھاتے ہیں نقابِ شامِ تنہائی

تصور میں ہم آغوشی کی کیفیت کا عالم ہے
یہ آخر کس نے چھلکائی شرابِ شامِ تنہائی

اکیلا پن نہ جانے کب کا مجھ کو ڈس چکا ہوتا
چھلکتا جام ہے لیکن جوابِ شامِ تنہائی

پرندے چہچہاتے ہیں سرِ شاخِ چمن مل کر
ہوا مجھ پر ہی کیوں نازل عتابِ شامِ تنہائی

بجھے سورج تو شب کی تیرگی میں خود کو گم کر دوں
سہوں اے زندگی کب تک عذابِ شامِ تنہائی

ہر اک لمحہ، ہر اک ساعت ہے جیسے سوختہ ساماں
سروشؔ آخر لکھوں کیسے حسابِ شامِ تنہائی

(۷؍دسمبر ۲۰۰۶ء)

○

اداسیوں کے سمندر میں اِک جزیرہ ہے
اس کا نام تو ہم نے امید رکھا ہے

جو پھول سوکھ گیا شاخ سبز پر اپنی
گلِ مراد تھا کل، آج اپنا نوحہ ہے

خدا کا شکر، نہیں میں کسی کی پرچھائیں
ہزار چہروں میں میرا ابھی ایک چہرہ ہے

جلا رہا ہے کوئی دل میں آگہی کے چراغ
یہ کس نے لب پہ مرے، اپنا نام لکھا ہے

یہ کس کے ہاتھ میں میزان ہے جنابِ سروشؔ
جو بے گناہ ہے، مجرم ضرور ٹھہرا ہے

(۳۱ر دسمبر ۲۰۰۶ء)

○

تھکے تھکے ہیں قدم، زندگی اُداس اُداس
مگر نہ حوصلہ کم ہے، نہ دل میں خوف و ہراس

بہت دِنوں میں ہوا آگہی کو یہ احساس
کہ اصل اور ہے کچھ، جسم تو ہے ایک لباس

نہ جانے کب سے بھٹکتا ہوں اس خرابے میں
خبر نہیں کہ ملا کتنے سال کا بن باس

خیال ڈھونڈتا پھرتا ہے کیا خلاؤں میں
یہ کائنات حقیقت ہے کچھ، تو کچھ ہے قیاس

خلوص، دوستی، روئے نگار، صبحِ بہار
سروشؔ بس ہے یہی میری شاعری کی اساس

(۱۳ر جنوری ۲۰۰۷ء)

○

کیسے کہہ دوں مرے ماضی! کہ نہیں تو زندہ
تیرا سیّال لہو میں ہے مرے رقصندہ

یہ وہ سورج ہے، جو ڈھلتا نہیں صدیوں صدیوں
روحِ تاریخِ ازل سے ہے یونہی رخشندہ

زندگی تجھ سے ہے احساس کی شریانوں میں
ایک اِک لمحہ تری یاد کا ہے تابندہ

سینکڑوں رنگ کے ہیں پھول، مگر بوئے وفا!
گلشنِ دہر میں کس چیز کا ہے جوئندہ!

عیش و عشرت کے تو سامان کیے تو نے بہم
اب کوئی کام بھی ایسا، جو رہے پائندہ

اے مرے شعر! مرے خونِ جگر کی تخلیق
تیری ناقدری پہ تجھ سے ہوں بہت شرمندہ

وقت یہ کہتا ہوا پاس سے گزرا ہے سروشؔ
نیکیاں رہتی ہیں انساں کی ہمیشہ زندہ

(۱۷ر جنوری ۲۰۰۷ء)

○

منزل ہے دُور چھوٹ گیا ہم سفر کا ساتھ
چھوٹ جائے جیسے آنکھ سے تارِ نظر کا ساتھ

وہ طائرِ بہار ابھی تھا اُڑان میں
یک لخت کیسے چھوٹ گیا بال و پر کا ساتھ!

تنہا رواں دواں ہوں تری راہِ شوق میں
ہے صاحبِ نظر، نہ کسی دیدہ ور کا ساتھ

افلاک سے ہے یورشِ آلام اور میں
ہم دم ہے کوئی اور نہ کسی نوحہ گر کا ساتھ

ہوں سجدہ ریز کب سے تری بارگاہ میں
لیکن ملا نہ میری دُعا کو اثر کا ساتھ

بیشک ہے راہِ حق میں مجھے موت بھی قبول
ہرگز مگر نہ دوں گا کسی فتنہ گر کا ساتھ

شاید نہ ہو حساب گناہوں کا اے سروشؔ
مل جائے روزِ حشر جو خیر البشرؐ کا ساتھ

(۲۳ر جنوری ۲۰۰۷ء)

○

ہے کارواں کے ساتھ، نہ ہے راہبر کے ساتھ
اپنا معاملہ ہے فقط رہگذر کے ساتھ

اس ریگزارِ زیست میں ہم بے نشاں رہے
نقشِ قدم بھی اُڑ گئے گردِ سفر کے ساتھ

میں جی رہا ہوں درد کے شعلوں کے درمیاں
نسبت ہے میرے حال کو رقصِ شرر کے ساتھ

لطفِ حیات سے نہیں محروم کوئی شے
ذوقِ جمال چاہیے حسنِ نظر کے ساتھ

صحرائے بے پناہ میں آتا ہے یہ خیال
اپنا بھی ربط تھا کبھی دیوار و در کے ساتھ

ہوں آدمی سروشؔ، فرشتہ نہیں ہوں میں
مجھ کو قبول کیجیے عیب و ہنر کے ساتھ

(۲۴ رجنوری ۲۰۰۷ء)

○

لائے پیغامِ بہارِ نو ہوا کے قافلے
گدگداتے ہیں شگوفوں کو صبا کے قافلے

موت بھی کل رات گھر میں آتے آتے رُک گئی
خیمہ زن تھے میرے آنگن میں دُعا کے قافلے

یہ فضاؤں کی رگوں میں زہر کس نے بھر دیا
آسمانوں سے اُترتے ہیں فنا کے قافلے

بستیاں سنسان، گھر ویراں، شجر بے برگ و بار
خاک اُڑاتے پھر رہے ہیں اب ہوا کے قافلے

زندگی! دو چار غداروں سے گھبرانا نہیں
ہیں حفاظت کو تری اہلِ وفا کے قافلے

اے یزیدو! قاتلانِ نسلِ آدم! ہوشیار
آ رہے ہیں سر بہ کف پھر کربلا کے قافلے

گوشۂ عزلت میں کیوں خاموش بیٹھا ہے سروشؔ
چل، بلاتے ہیں تجھے حرف و نوا کے قافلے

(۳۱ رجنوری ۲۰۰۷ء)

○

کتنی موتیں ، کتنے لاشے ، کتنے خون
کس گوشے میں چھپ کر بیٹھا ہے قانون
جو اپنے رستے میں آئے قتل کرو
دولت ، عزت، شہرت پانا ایک جنون
یہ جو عمارت فلک سے باتیں کرتی ہے
کتنے انساں اس کی تہہ میں ہیں مدفون
غداری ، مکاری اور عیاری سے
کون یہ میرے دل پر مارے ہے شب خون
پیسہ پیسہ جوڑ کر آخر مرجانا
آج بھی اس دُنیا میں ہیں کتنے قارون

(۲رفروری ۲۰۰۷ء)

○

(نذرِ غالبؔ)

بارشِ آلام کا منظر کھلا الاماں ! پھر آسماں کا دَر کھلا
دیکھئے اب کس پہ ہو وہ مہرباں دستِ قاتل میں ہے پھر خنجر کھلا
امن گر چاہے، اسے بھی قید کر رہ گیا ہے ایک فتنہ گر کھلا
میکدہ چھوٹا ،تو کعبہ مل گیا دَر ہوا اِک بند، تو اِک دَر کھلا
ہم نے کی ہے ہر قدم پر خودکشی بعد مدّت راز یہ ہم پر کھلا
صاف تھا میرے مقدر کی طرح روزِ محشر جب مرا محضر کھلا
دل کی باتوں میں نہ آجانا سروشؔ
دشمنِ جاں ہے یہ غارت گر کھلا

(۸رفروری ۲۰۰۷ء)

○

اب کہاں بزمِ طرب، شہنائیاں چل رہی ہیں ہجر کی پروائیاں
مانگتی ہیں بیتے لمحوں کا حساب درد میں لپٹی ہوئی تنہائیاں
کوئی بھی چہرہ نظر آتا نہیں ناچتی ہیں ہر طرف پرچھائیاں
دھوپ محلوں سے اُترتی ہی نہیں ہوگئی ہیں تنگ اب انگنائیاں
انقلابِ وقت نے آواز دی رہ گئیں بستر پہ سب انگڑائیاں
جہل کا سکہ رواں ہے ہر طرف ہوگئی ہیں سرنگوں دانائیاں

یاد آتی ہے بہت رفعت سروشؔ
بمبئی اور اس کی بزم آرائیاں

(۱۲رفروری ۲۰۰۷ء)

○

ذہن میں ہے گھٹن اس قدر، بند ہیں سوچ کی کھڑکیاں
ناچتی ہیں مرے چار سو بیتے لمحوں کی پرچھائیاں
راستہ پرخطر ہے مگر، میں دُعاؤں کے سائے میں ہوں
دھوپ کے دشتِ پرخار میں چھا گئیں پیار کی بدلیاں
تجھ کو معلوم ہے اے خدا! میں تو دارالخطا میں رہا
یاد آتا نہیں ہے مجھے میں نے کی ہوں کبھی نیکیاں
اُس سے کہتا ہوں عجلت نہ کر کام باقی بہت ہے ابھی
موت کرتی ہے جس وقت بھی آ کے خوابوں میں سرگوشیاں
شاعری کے سخن زار میں آج تک ہے وہ عالم سروشؔ
اُڑتی رہتی ہیں شام و سحر فکر و احساس کی تتلیاں

(۱۷رفروری ۲۰۰۷ء)

○

ہم نشیں! کیسے کہوں اب تجھ سے، کیا گم ہوگیا
ایک شعلہ تھا لہو میں عشق کا، گم ہوگیا

حرفِ دل، حرفِ محبت، حرفِ شوق و آرزو
سب تو باقی ہیں مگر، حرفِ وفا گم ہوگیا

کچھ مسافر مشتعل ہیں، کچھ مسافر مضمحل
قافلہ ہی منتشر ہے، راستا گم ہوگیا

خضر میرے ساتھ تھے، پھر بھی نہ منزل مل سکی
وہ بھی حیراں تھے، کہاں آبِ بقا گم ہوگیا

گھومتی ہیں خود پسند اہلِ خرد کی ٹولیاں
جس میں سب دیوانے تھے، وہ قافلہ گم ہوگیا

خوبصورت لفظ، اور اک دوسرے سے اجنبی
حرف و معنی میں جو کل تھا رابطہ گم ہوگیا

اے سروشؔ اب میں ہوں اور طوفانِ بحرِ بے کنار
چھوڑ کر کشتی بھنور میں ناخدا گم ہوگیا

(۲۱ر فروری ۲۰۰۷ء)

○

لہو میں شعلۂ برقِ تپاں رواں کر دے
جو بجھ رہا ہے چراغ اس کو ضوفشاں کر دے

میں کب سے گرمِ سفر دھوپ کے بیاباں میں
تو اپنے دامنِ رحمت کو سائباں کر دے

یہ چار تنکے جو بکھرے ہیں صحنِ گلشن میں
انھیں سے پھر کوئی تعمیر آشیاں کر دے

غبارِ راہ جو اُٹھا ہے پائمالی سے
عجب نہیں کہ ہوا اس کو آسماں کر دے

میں ان کی بزم میں جاتا ہوں بے غرض، لیکن
مرا خلوص ہی ان کو نہ بدگماں کر دے

تمھارا نام جو لکھا ہے بے خیالی میں
نہ جانے اب مجھے رسوا کہاں کہاں کر دے

نفس نفس کا چکانا ہے قرض تجھ کو سروشؔ
حضور خالقِ کل نذر نقدِ جاں کر دے

(۲۵ر فروری ۲۰۰۷ء)

○

شعورِ فکر کو عرفانِ ذات لکھتے رہے
ہم اپنے آپ کو ہی کائنات لکھتے رہے

حقیقتوں سے کبھی ہم نے منہ نہیں موڑا
جو ہم پہ گزری، وہی واردات لکھتے رہے

عجیب طرح سے کھیلی ہے پیار کی بازی
ہم اپنی جیت کو بھی اپنی مات لکھتے رہے

زبانِ دل کی لکھی ہم نے کیف و مستی میں
جو اہلِ فن تھے، ادب کے نکات لکھتے رہے

تمام عمر نہ سمجھے کہ زندگی کیا ہے
تمام عمر جو نقدِ حیات لکھتے رہے

جو لمحہ ہم نے جیا اس کو جاوداں سمجھا
یہ فلسفی تو اسے بے ثبات لکھتے رہے

سبب کھلا نہ کبھی ان پہ حادثوں کا سروشؔ
مورّخوں کے قلم واقعات لکھتے رہے

(۷؍فروری ۲۰۰۷ء)

○

(نذرِ فراق)

خود کو مٹا جو حسرتِ تکمیلِ ذات ہے
ایثارِ خواہشات ہی اصلِ حیات ہے

عالم تغیرات کی لے میں ہے نغمہ زن
غم کو ثبات ہے نہ خوشی کو ثبات ہے

پھر مہرباں ہوا ہے مرے حالِ زار پر
اپنے مزاج ہی سے جو گردوں صفات ہے

خود کو سنوارنے کا بھی یارا نہیں جسے
اُس جانِ ناتواں کو غمِ شش جہات ہے

دیکھو تو آدمی ہے فقط ایک مشتِ خاک
سمجھو تو یہ کلیدِ طلسمِ حیات ہے

مغرب کے آسمان پہ سورج ٹھہر گیا
مشرق کی سرزمین میں صدیوں سے رات ہے

وارد ہوا ہے دل پہ مرے نغمۂ سروشؔ
لفظوں کے پیچ و خم میں غمِ کائنات ہے

(یکم مارچ ۲۰۰۷ء)

○

غم کی تصویر بنا تاج محل کا چہرہ
سانولا ہوگیا جمنا کے کنول کا چہرہ

ایک سناٹا ، نہ کہسار ، فقط رقصِ غبار
ہے تصوّر میں کچھ اس طرح ازل کا چہرہ

آسماں تو نے چھپا رکھے ہیں سب سیارے
نظر آتا ہے ہر اِک سمت زحل کا چہرہ

اب سوا نیزے پہ آ کر ہی رُکے گا سورج
آرسی ارض کی دِکھلاتی ہے کل کا چہرہ

پوچھئے ہم سے کہ انفاس کی قیمت کیا ہے
ہم نے دیکھا ہے غضبناک اجل کا چہرہ

جب سے وہ روٹھے ہیں، الفاظ میں نزہت ہی نہیں
بدلا بدلا نظر آتا ہے غزل کا چہرہ

عمر کس طرح گزاری ہے نہ پوچھو مجھ سے
میرے اشعار میں ہے فکر و عمل کا چہرہ

(۱۱ رمئی ۲۰۰۷ء)

○

ہیں چلتی پھرتی ہوئی مشینیں، زمین سے آدمی ندارد
یہی ہے تہذیبِ نو کا عالم، تو ایک دن زندگی ندارد
اُفق اُفق ہے سیاہ منظر ،اُداسیوں کی سیاہ چادر
ہر اک تصوّر ہے دُھندلا دُھندلا، شعور کی روشنی ندارد
جدید ہوں یا قدیم ہم نے، بہت صحیفے کھنگال ڈالے
علوم کا اِک ہجوم لیکن ، ہے ذہن سے آگہی ندارد
ہمارے حصّے میں غم کی دولت، زوال جس کو نہیں ہے، لیکن
خوشی کا دنیا میں کیا بھروسہ، ابھی ہے موجود ابھی ندارد
وہ کیا پھرے وعدۂ وفا سے، اُلٹ گئی ہے بساط دل کی
سکون و صبر و قرار، عزم و یقین و جرات، سبھی ندارد
چلو سروشؔ اپنے گھر چلو تم، تمھارے لائق نہیں یہ محفل
غزل کہی تم نے جس کی خاطر، ہے انجمن سے وہی ندارد

(۳۰؍جون ۲۰۰۷ء)

○

دل میں اِک شعلہ لپکتا تھا، جو بجھتا جا رہا ہے
سانس میں طوفانِ نغمہ تھا، جو سمٹا جا رہا ہے
اس وفا پیکر کو میں نے کیوں بھلا بے مہر سمجھا
دل میں اِک نازک سا کانٹا تھا، کھٹکتا جا رہا ہے
اس چھلاوے سے بچو جو دشمنِ انسانیت ہے
حرص کا موہوم سایہ تھا، جو بڑھتا جا رہا ہے
آسمانوں تک زمیں کے قافلے جانے لگے ہیں
ایک افسانہ ادھورا تھا، جو لکھا جا رہا ہے
نالہ و شیون نہ کر اے دل سرِ بزمِ تماشہ
ضبطِ غم کا جو پیالہ تھا وہ چھلکا جا رہا ہے
اے دلِ ناداں سنبھل یہ لغزشِ بیجا ہے شاید
زندگی سے ایک رشتہ تھا جو ٹوٹا جا رہا ہے
اے سروشؔ آخر ہوئی ظاہر حقیقت زندگی کی
اِک شکستہ سا سفینہ تھا جو ڈوبا جا رہا ہے

(۳۱؍جون ۲۰۰۷ء)

○

میں نے کیوں سوچا کہ میری زندگی ہے ایک خواب
میں نے کیوں سمجھا کہ ہے تارِ نفس مبہم رُباب

ہے نئے افسانے کا عنوان میرا ہر نفس
میں نے کیوں لکھا کہ میں ہوں ایک بوسیدہ کتاب

جب مرے دل میں نہیں عزّت کسی کے واسطے
میں نے کیوں سوچا کہ میں کہلاؤں گا عزّت مآب

مجھ کو ہے معلوم ، بے مقصد جئے جاتا ہوں میں
میں نے کیوں چاہا کہ لکھوں اپنے ہر پل کا حساب

ناسمجھ رہ کر ہی جینے میں تھا جینے کا مزا
میں نے کیوں جانا کہ یہ دُنیا تو ہے دارالعذاب

ڈھونڈتے تعبیر اس کی عمر ساری کٹ گئی
میں نے کیوں دیکھا تھا آخر جاگتی آنکھوں سے خواب

اس سے بہتر تو اکیلے جی رہا تھا میں سروشؔ
میں نے کیوں جوڑا وہ رشتہ جس کو کہتے ہیں سراب

(۳۱ مئی ۲۰۰۷ء)

○

سدا آشیانے بدلتا رہا — پرندہ ٹھکانے بدلتا رہا
حقیقت کبھی لب پہ آتی نہیں — وہ غم کے فسانے بدلتا رہا
نہ دل سے کیا کوئی سجدہ کبھی — یہ سر آستانے بدلتا رہا
پرندہ رہا اپنی پرواز میں — شکاری نشانے بدلتا رہا
شجر اس لیے اب بھی سرسبز ہے — سدا اپنے بانے بدلتا رہا
الجھتی گئی ڈور انفاس کی — بہت تانے بانے بدلتا رہا

بہت بوجھ تھا زندگی کا سروشؔ
ہر اک گام شانے بدلتا رہا

(۳۱؍مئی ۲۰۰۷ء)

○

سمندر میں اُتر کر گھل گئیں مہتاب کی آنکھیں
عجب منظر ہے، لہروں پر سجیں سیماب کی آنکھیں
سمٹتے پھیلتے رنگوں کے نقطے، ٹوٹتے تارے
نہ جانے کیا دِکھاتی ہیں مجھے یہ خواب کی آنکھیں
کھلی رہتی ہیں سوتے جاگتے، ہر وقت، ہر لمحہ
ہیں جانے منتظر کس کی دلِ بیتاب کی آنکھیں
خدا ہی جانے کیا انجام ہو، بحرِ حوادث میں
لگی ہیں پھر سفینے پر مرے گرداب کی آنکھیں
بھروسہ اُٹھ گیا ہے اے سروشؔ اب اہلِ دنیا کا
بدلتی ہم نے دیکھی ہیں بہت احباب کی آنکھیں

(۱۰؍اگست ۲۰۰۷ء)

○

نہ کوئی شور ، نہ ہلچل ، نہ کوئی ہنگامہ ، یہ کیسا شہرِ خموشاں بسا مرے دل میں
ترے خیال نے شمعیں جلائی ہیں لیکن ، تمام رات اُجالا رہا مرے دل میں

فساد ، خون کی ہولی ، لٹے لٹے سے شہر ، فضا میں گونجتی شہنائیاں ، ہجومِ نشاط
کسی کی یاد ، کسی کا خلوصِ بے پایاں ، نہ جانے کیسے یہ سب بس گیا مرے دل میں

وہ کیا گئے کہ گئیں رونقیں زمانے کی ، زمیں سے تا بہ فلک اِک مہیب سناٹا
نہ آرزو ، نہ اُمیدیں ، نہ حوصلے ، نہ اُمنگ ، بس ایک قطرۂ خوں ! کیا بچا مرے دل میں

نہ کوئی شکوۂ دُنیا ، نہ دوستوں کا گلہ ، نہ عزّ و جاہ کی خواہش ، نہ مال و زر کی ہوس
بس ایک وعدۂ فردا عجیب وعدہ تھا ، یہ ایک خار کھٹکتا رہا مرے دل میں

مرے مزاج کا رنگین استعارہ تھا ، مرے رموزِ سخن آشکار کر دیتا
ہوا یہ خوب کہ میں اس کو لکھ نہیں پایا ، وہ ایک شعر کہ جو رہ گیا مرے دِل میں

گئے زمانوں کے قصّے قدیم تہذیبیں ، شکست و فتح کے منظر روایتوں کے جلوس
جدید دَور کی سب عظمتیں جلو میں لیے ، ٹھہر گیا ہے عجب قافلہ مرے دل میں

سروشؔ اپنے پرایوں کی بھیڑ تھی کتنی ، اُداس اُداس تھے وہ بھی جو دشمنِ جاں تھے
یہ تھم گیا تو ملی شدّتِ الم سے نجات ، سکوں سے پہلے بہت شور تھا مرے دِل میں

(۷ / اگست ۲۰۰۷ء)

○

دُودھیا اندھیرے میں شب کو بجتی ہے محفل ذہن میں خیالوں کی
کہکشاں دمکتی ہے کیسے بے مثالوں کی، کیسے خوش جمالوں کی

گرمیٔ تماشہ میں اس کے قرب کی ٹھنڈک کس قدر تھی آسودہ
رات میرے پہلو میں اک حسین جنت تھی ریشمی اُجالوں کی

زندگی کا مقصد کیا، موت کی ضرورت کیا، کھیل کیا ہے قسمت کا
عقل اتنی عاجز کیوں، کون دے جواب ان کا، بھیڑ ہے سوالوں کی

مجھ کو ایسا لگتا ہے نور کے پرندے ہیں نغمہ زن فضاؤں میں
تذکرہ حرم کا ہو، ذکر ہو کلیسا کا، بات یا شوالوں کی

پُروقار سا لہجہ، لفظ لفظ شائستہ، حرف حرف با معنی
ہاں ابھی ضرورت ہے اے سروشؔ اُردو کو تجھ سے با کمالوں کی

(جولائی ۲۰۰۷ء)

○

اِک ایک گانٹھ کھلے گی دل کی، اِک اِک ٹانکا ٹوٹے گا
تب جا کر یہ جان کا پنچھی قیدِ قفس سے چھوٹے گا

عقل گئی اوسان گئے، خوش رہنے کے سامان گئے
وقت کا رہزن مجھ کو مفلس سے اور اب کیا کیا لوٹے گا

بستی بستی خودغرضی ہے، قدم قدم پر عیاری
پاپ کی اس نگری سے یارب کیسے پیچھا چھوٹے گا

تم سے روشن تھی یہ دُنیا، جاؤ بہت یاد آؤ گے
جب بھی فلک سے آخرِ شب میں کوئی ستارہ ٹوٹے گا

پی لو جو بھر کر چھلکا لو، دھوم مچا لو محفل میں
اِک دن وہ بھی آئے گا جب ہاتھ سے ساغر چھوٹے گا

(جولائی ۲۰۰۷ء)

○

کیا قرب کا لمحہ تھا، مہکتا رہا برسوں
نشہ سا مری روح پر چھایا رہا برسوں

کب جائے اماں مجھ کو ملی تیرے نگر میں
گھر سر پہ اُٹھائے ہوئے پھرتا رہا برسوں

منزل کی طلب کس کو تھی، مقصود سفر تھا
چلتا رہا، چلتا رہا، چلتا رہا برسوں

اِس ہاتھ سے اُس ہاتھ میں اُس ہاتھ سے اِس ہاتھ
میں جنسِ گراں مایہ تھا، بکتا رہا برسوں

کس کس نے پڑھا مجھ کو، مجھے اس خبر کیا
دیوار پہ بازار کی لکھا رہا برسوں

جاگا تو زمانے کی فضا اور ہی کچھ تھی
میں حجلۂ تاریخ میں سویا رہا برسوں

جس شخص نے اوروں کے لیے جان گنوا دی
وہ شخص پسِ مرگ بھی زندہ رہا برسوں

میں کیا ہوں سروشؔ ایک کہانی کا تسلسل
اِک نقش جو مٹ مٹ کے اُبھرتا رہا برسوں

(یکم اکتوبر ۲۰۰۷ء)

○

جب ملی ان سے نظر، ہاتھ سے ساغر رکھا
آنکھ میں گردشِ کونین کا منظر رکھا

اس ستمگر سے عجب طرح ملاقات ہوئی
ایک بستر تھا، مگر بیچ میں خنجر رکھا

خوب انداز ہے عشاق کی دلجوئی کا
طاق میں وعدۂ فردا کو سجا کر رکھا

وائے صناع! کہ ریشم سا بدن، چہرہ گلاب
اس کے پہلو میں مگر دل نہیں، پتھر رکھا

مجھ کو تو ٹال دیا دے کے شعورِ تدبیر
اپنے قبضہ میں مگر میرا مقدر رکھا

تجھ سے شکوہ ہے نہ رکھا مری عظمت کا خیال
آسماں کو بھی مرے قد کے برابر رکھا

دل یہ چاہے ہے کہ سر سجدے سے اُٹھے نہ سروشؔ
ہائے وہ لمحہ کہ جب سر ترے در پر رکھا

(یکم اکتوبر ۲۰۰۷ء)

○

سانس لینے کی ہمت نہیں ہے مگر، زندگی تیرا دامن نہیں چھوٹتا
پتّا پتّا ہر اک شاخ سے گر گیا، پھر بھی ویران گلشن نہیں چھوٹتا

اس خرابے سے جب بھی ہوا ہے گزر، تھا جو گہوارہ بچپن کے ایام کا
وقت تھم جاتا ہے، پاؤں گڑ جاتے ہیں، اپنی مٹی کا آنگن نہیں چھوٹتا

من کا پنچھی تو اُڑنے کو بیتاب ہے، کب سے بیٹھا ہے وہ سانس کی ڈال پر
آدمی کی عناصر سے نسبت عجب، آرزوئیں گئیں، تن نہیں چھوٹتا

اے فرشتو! رُکو، اتنی جلدی بھی کیا، اب ابد تک رہیں گے سدا ساتھ ہم
یہ سکوں، یہ فضا، یہ شبِ عافیت، تا قیامت یہ مدفن نہیں چھوٹتا

ساری دُنیا کو پہچانتا ہوں مگر، اپنی پہچان دُشوار ٹھہری سروشؔ
رُوبرو ہیں خیالوں کی پرچھائیاں، ہاتھ سے میرے درپن نہیں چھوٹتا

(۷ر دسمبر ۲۰۰۷ء)

○

ہے سخن کا لطف بچپن کا بیاں لکھتے ہوئے
گاؤں کی پگڈنڈیوں کو کہکشاں لکھتے ہوئے

خواب سے جاگے تو دیکھا، بن گئے خود داستاں
سو گئے تھے زندگی کی داستاں لکھتے ہوئے

خانہ ویرانی کی جس نے کیں ہمیشہ سازشیں
شرم آتی ہے اسی کو پاسباں لکھتے ہوئے

مصلحت کوشی اسے کہیئے کہ جبرِ زندگی!
عمر گزری ہے قفس کو آشیاں لکھتے ہوئے

آنکھ میں آنسو بھر آئے، ہاتھ سے چھوٹا قلم
یاد کوئی آ گیا جب ناگہاں، لکھتے ہوئے

جیتے جی ہم نے نہ چھوڑا دامنِ ربطِ حیات
مر گئے ہم زندگی کو جاوداں لکھتے ہوئے

خشک اس درجہ ہے تیری داستاں رفعت سروش
سو گئے ہیں خود فرشتے بھی بیاں لکھتے ہوئے

(۷؍دسمبر ۲۰۰۷ء)

○

زمیں رقصندہ رقصندہ، فلک تابندہ تابندہ
اور ان کے درمیاں ہے آدمی پائندہ پائندہ

ہوئے پہلے تو ذرّوں کے جگر کو کاٹ کر نازاں
عمل پر اہلِ دانش اب ہیں خود شرمندہ شرمندہ

ذرا مہلت تو دی ہے وقت نے کچھ مسکرانے کی
دِکھاتی ہے مگر کیا زندگی آئندہ آئندہ

نہیں گر آرزو تیری، نہیں گر جستجو تیری
لہو میں ہے تو پھر کیا چیز یہ تابندہ تابندہ

سروش الفاظ میں میرے، مگر تائید ہے کس کی
یہ کس کے فیض سے ہے ہر ورق تابندہ تابندہ

(۳۰؍دسمبر ۲۰۰۷ء)

○

فلک بوس پیڑوں کو محسوس کر چہکتے پرندوں کو محسوس کر
ہر اک برگ پر ہے رقم زندگی ہر اک سو کتابوں کو محسوس کر
زمیں سے نئے رشتے کی کر شناخت فلک کی دعاؤں کو محسوس کر
فضاؤں میں رقصندہ پاکیزگی صداقت کی رُوحوں کو محسوس کر
خموشی اور اتنی خموشی کہ بس سکوں کے فرشتوں کو محسوس کر
یہ سورج کا سونا سمٹنے کو ہے ہر اک سو اندھیروں کو محسوس کر
کثافت سے عاری، تصنع سے پاک
سکوں ریز لمحوں کو محسوس کر

(جم کاربیٹ پارک، ۲۰ جنوری ۲۰۰۸ء)

○

مرا مزاج صداقت ، میں بولتا ہوں سچ
محبتوں کی ترازو میں تولتا ہوں سچ
مجھے یقیں ہے کہیں سے کرن تو پھوٹے گی
اندھیرے جھوٹ کے دل میں ٹٹولتا ہو سچ
زمین تیرے خزانے سے میں نہیں ہوں اُداس
نہیں جواہر و موتی ، میں رولتا ہوں سچ
بنے گا زہرِ ہلاہل بھی ایک دن تریاق
سروش مکر کے دریا میں گھولتا ہوں سچ

(۲۲ جنوری ۲۰۰۸ء)

○

لبوں پہ پیاس لیے میں پھرا فرات فرات
مگر ملی نہ مجھے کربِ تشنگی سے نجات

مرے شعور کو پالا ہے کس تجسّس نے
نہ جانے کس کی امانت ہیں میرے احساسات

روایتوں سے بغاوت سہی مزاج مرا
مگر ہیں ذہن پہ کندہ قدیم تر آیات

ترا خیال مجھے کس جہاں میں لے آیا
یہاں نہ صبح نہ شام اور نہ دن ہے اور نہ رات

مری نگاہ سے گزرا ہے نور کا سایہ
ہزار صدیوں پہ بھاری ہیں پرفشاں لمحات

تجلیات سے عاری ہے آج کی دُنیا
زمیں سے تا بہ فلک جیسے اک اندھیری رات

ازل سے آج تلک مضطرب رہا ہوں سروشؔ
کہ میرے حصّے میں آئی ہے درد کی سوغات

(۲۶ر جنوری ۲۰۰۸ء)

○

اندھیری رات میں اور صاحبِ نظر کی بات
قفس میں رہ کے ہی کرتے ہو بال و پر کی بات

دل و نظر سے کہو ، خود معاملہ کرلیں
زبانِ درد پہ کیوں آئے اپنے گھر کی بات

ہر ایک سمت سے یورش ہے برق و آہن کی
اور ایسے حال میں جینا! بڑے ہنر کی بات

تم آدمی ہو ، تمھاری سرشت میں ہے خطا
نہ آئیں عیب نظر ، ہے یہ بس ہنر کی بات

چلو تو نقشِ قدم اپنے چھوڑتے جاؤ
سفر سے پہلے ہی سوچو نہ ہم سفر کی بات

یقین ہی نہیں اُس کو خدا کی رحمت پر
دعا کے بعد جو کرنے لگے اثر کی بات

یہ زخم ہی تو فقط حاصلِ محبت ہیں
سروشؔ = نہ للہ چارہ گر کی بات

(۷؍ فروری ۲۰۰۸ء)

○

(نذرِ صبیحہ، غالبؔ کی زمین)

پھر وہی رشکِ قمر یاد آیا　　بھولنا چاہا ، مگر یاد آیا
جس میں اُترے تھے بہاروں کے جلوس　　بعد مدّت کے وہ گھر یاد آیا
ہم سفر ، ہمدم و غمخوار ، رفیق　　پھر بہ عنوانِ دِگر یاد آیا
اس کے ہنسنے کی ادا یاد آئی　　رُوٹھ جانے کا ہنر یاد آیا
زندگی جس سے سلیقہ سیکھے　　مرگ ساماں وہ بشر یاد آیا
آشیانے پہ گری یوں بجلی　　نقشۂ رقصِ شرر یاد آیا
مشعلِ جاں تھی ضیاپاش جہاں　　تیرہ تار وہ گھر یاد آیا
منجمد ہوگیا ہر قطرۂ خوں　　رُوح کا وقتِ سفر یاد آیا
جو ہوا بے حس و حرکت یکسر　　اپنے زانو پہ وہ سر یاد آیا

اس کے رُخسار پہ ٹپکے آنسو
''پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا''

(۱۶ر فروری ۲۰۰۸ء)

○

زمیں سے آسماں تک زندگی کی شعلہ افشانی
پریشانی ، پریشانی ، پریشانی ، پریشانی

بلا سے قتل ہوں مخلوق، ویراں شہر ہو جائیں
جہاں بانی، جہاں بانی، جہاں بانی، جہاں بانی

ترے گلّے کی بھیڑیں دن بہ دن کم ہوتی جاتی ہیں
نگہبانی ، نگہبانی ، نگہبانی ، نگہبانی

نہ موضوعِ سخن تازہ، نہ سوزِ فکر و فن لیکن
زباں دانی، زباں دانی، زباں دانی، زباں دانی

مصاحب اہلِ زر کا ہوں مرے حصّے بھی آئی ہے
ثنا خوانی ، ثنا خوانی ، ثنا خوانی ، ثنا خوانی

خوشامد پر جو قدرت ہے تو پھر اسبابِ دولت کی
فراوانی ، فراوانی ، فراوانی ، فراوانی

میں اے رفعتؔ اگر اعمال پر اپنے نظر ڈالوں
پشیمانی ، پشیمانی ، پشیمانی ، پشیمانی

(۱۰/۱/اپریل ۲۰۰۸ء)

احساس کے جزیرے

(رُباعیات، قطعات، دوہے، نغمے)

رُباعیات

○

یکتا ہے، کوئی تیرا نہ ہم رشتہ ہے
عظمت کو تری کون سمجھ پایا ہے
تو نورِ جہاں تاب ہے اے ربِ جلیل
ہر پست و بلند پر ترا سایہ ہے

○

ثانی ہے ترا اور نہ کوئی ہمسر
صورت ہے تری اور نہ کوئی پیکر
پہچان سکوں تجھ کو عطا ہو توفیق
تفہیم تری اصل میں معراجِ بشر

○

Prof. SHARIB RUDAULVI COLLECTION

ظاہر جو دو عالم میں ہوا ہے اب تک
اور اس کے سوا جو بھی چھپا ہے اب تک
ہے تیری جلالت پہ دلالت یہ سب
تو نے مرے دل پر جو لکھا ہے اب تک

○

اے خالقِ عالم تری عظمت کے نثار
انسان پہ کھولے ہیں یہ تو نے اسرار
بازیچۂ طفلاں ہے نظامِ شمسی
دنیائیں کئی اور ہیں سورج کے پار

○

جھکنا درِ معبود پہ انسان کی شان
سجدہ ہے عبادت کی مقدس پہچان
اس سے بھی زیادہ ہے سبب رحمت کا
توحید پہ گر پختہ ہو تیرا ایمان

○

مٹّی تھا بدن رُوح کہاں سے آئی
یہ صرف عناصر کی نہیں انگڑائی
اِک قوتِ صد نام پسِ پردہ ہے
بیشک یہ اسی کی ہے کرم فرمائی

○

قائم ہے نگارخانۂ دنیا کب سے
تصویر بناتا ہے وہ کس کس ڈھب سے
یہ کیسا مصور ہے کہ ہر اِک تصویر
اِک جیسی لگے، پھر بھی الگ ہے سب سے

○

ہر شخص کے ہاتھوں کی لکیریں ہی جدا
ملتا نہیں آپس میں کسی کا چہرہ
نیرنگیٔ یک رنگ نمایاں ہے سروشؔ
فطرت نے دِکھایا یہ تماشہ کیسا

○

یہ عیش، یہ آرام، یہ کھانا پینا
یہ دولت و ثروت کا سنہرا زینہ
اس عمر کی لیکن ہے مقرر میعاد
ممکن نہیں اِک لمحہ زیادہ جینا

○

ہر شخص کی اک سوچ ہے، اپنی مرضی
کس طرح سے جینا ہے، ہماری مرضی
کب تک ہے مگر فرصتِ ہستی ہم کو!
کب رُوح کرے سلب! خدا کی مرضی

○

کچھ ایسا عطا کردے کہ جو ہو انمول
اس تشنہ سماعت کے لیے پیار کے بول
نظارۂ پاکیزہ کی مل جائے بھیک
نظروں میں لیے پھرتا ہوں کب سے کشکول

○

وہ جلوۂ اسرار نظر آئے مجھے
وہ شعلۂ بیدار نظر آئے مجھے
پھر اُٹھیں نگاہیں نہ کسی کی جانب
وہ مرکزِ انوار نظر آئے مجھے

○

بے لوث محبت کی ملی ہے دولت
تہذیبِ صداقت کی ملی ہے دولت
میں اتنی عنایات کا لائق تو نہ تھا
افکار کی رفعت کی ملی ہے دولت

○

عسرت میں مسرّت کی ملی ہے دولت
ہر شخص کی چاہت کی ملی ہے دولت
یہ مکر و ریا، حرص و ہوس کی دُنیا
ہاں مجھ کو قناعت کی ملی ہے دولت

○

ناچیز نے پائی ہے غضب کی دولت
بیگانگیٔ عیش و طرب کی دولت
قسّامِ ازل نے مجھے بخشی ہے سروشؔ
وارفتگیٔ علم و ادب کی دولت

○

اظہارِ صداقت کا ہنر دے یارب
الفاظ کو اعجاز و اثر دے یارب
لکھنے کے لیے نعت اُٹھاتا ہوں قلم
سینے کو مرے نور سے بھر دے یارب

○

حیران ہے دل اور نظر ہے ششدر
یہ میرا قلم نور کا پیکر یکسر
آواز یہ آئی کہ مبارک ہو سروشؔ
یہ پاک ہوا نامِ محمدؐ لکھ کر

○

تو صادق و دانا ہے، امیں تیرا لقب
نبیوں میں فضیلت تجھے اے ماہِ عرب
ہے ذات پہ نازاں تری خود ربِّ جلیل
الفت تری تخلیقِ دوعالم کا سبب

○

فاران کی چوٹی ہو، صفا یا مروا
ہو بدر کا میدان کہ ہو غارِ حرا
اسلام کی عظمت کے نشاں ہیں یہ سب
یاں گونجتی ہے اب بھی محمدؐ کی صدا

○

ہے کرۂ خاکی میں ہر اک سو ہلچل　　ہیں چھائے ہوئے جنگ وجدل کے بادل
جو پیار کی شمعوں کو جلا سکتی ہے　　واللہ کہ قرآن ہے ایسی مشعل

○

اسلام کی عظمت کو لیے خوابوں میں　　ایمان کی دولت کو لیے سینوں میں
یلغار کریں قلعۂ ظلمت کی طرف　　قرآن کی مشعل کو لیے ہاتھوں میں

○

اِک شخص کہ نازاں بشریت جس پر　　اِک ایسا امیں ختمِ صداقت جس پر
چرچا ہے فلک پر کہ زمیں سے پہنچا　　اِک ایسا نبی ختمِ رسالت جس پر

○

ہے پیکرِ خاک، خاک داں کا رہبر　　عظمت میں ہے افلاک سے بھی بالاتر
انسان نے رکھا ہے وہاں بڑھ کے قدم　　کھائی ہے فرشتوں نے جہاں پر ٹھوکر

○

با کرّ و عزّ و شان اُتارا جائے　　اللہ کا فرمان اُتارا جائے
اس سینے کی عظمت کا تصور کیجیے　　جس سینے پہ قرآن اُتارا جائے

○

ہر صاحبِ ایمان کا یہ ہے ایقان
دُنیا کے ہر اک علم کا مخزن قرآن
مخفی ہے زمانے میں نہ جانے کیا کیا
بس علم سے ہوسکتی ہے اس کی پہچان

●

بیٹھک تھی ، اٹاری تھی ، نہ پکاّ کوٹھا
اِک پھونس کا چھپّر ہی ہمارا گھر تھا
بجلی تھی نہ لالٹین اپنے گھر میں
اِک طاق میں بس جلتا تھا مٹّی کا دِیا

○

ڈھیلا سا پلنگ ، کھردرا سا بستر
تکیہ تھا پھٹا ہوا ، تو میلی چادر
جب سوتے تھے کچھ ہوش نہیں رہتا تھا
یاد آتے ہیں بچپن کے وہ دن رہ رہ کر

○

لمبی کبھی راتیں ، کبھی لمبے دن تھے
اپنی ہی وہ دنیا تھی وہ اپنے دن تھے
کھانے کی کوئی فکر ، نہ پینے کا خیال
بچپن کے وہ دن کتنے سہانے دن تھے

○

چپکے سے نکل گھر سے ، گلی میں آنا
دوپہر میں وہ لُو کے تھپیڑے کھانا
کیابات تھی ، اس عمر میں جلتے تھے نہ پاؤں
سب لڑکوں کا تالاب کنارے جانا

○

ممتا سے بھرے پھول سے چانٹے کی چٹک غصہ سے بھرے ڈھول کے یاد آئے دھمک
ماں پاس ہو، بیتا ہوا بچپن لوٹ آئے رہ رہ کے بھلا اٹھتی ہے کیوں دل میں کسک

○

ممتا کی مہک، پھول سا بچپن یاد آئے وہ نیم کی چھاؤں بھرا آنگن یاد آئے
اس عمر میں جب اسّی برس بیت گئے بے فکر جنوں خیز لڑکپن یاد آئے

●

میں زیرِ نگیں دشت و دمن کرتا ہوں تزئینِ گل و سرو سمن کرتا ہوں
کھل جاتے ہیں اسرارِ جہاں دل پہ میرے واللہ میں جب فکرِ سخن کرتا ہوں

○

لفظوں کو برتنے کا سلیقہ آیا شعروں کو سجانے کا قرینہ آیا
کی کوہکنی دشتِ سخن میں اِک عمر تب ہاتھ میں انمول نگینہ آیا

○

اندازِ سخن میرؔ کا، غالبؔ کا کمال افکار کے اظہار میں طرزِ اقبالؔ
دھڑکن ہو زمانے کی مرے شعروں میں اے کاش! غزل ہو مری اُردو کا جمال

محبت کے بعد

تو میرے ساتھ سہی پھر بھی گھپ اندھیرا ہے
تری نظر کے اشاروں سے آج کیا ہوگا
ذرا ٹھہر، مجھے سورج طلوع کرنے دے
کہ زرد زرد ستاروں سے آج کیا ہوگا

کل اور آج

کل حریفِ غمِ دوراں تھا، مگر آج یہ کیا
اپنی ہی ذات کے میں بوجھ سے گھبراتا ہوں
صبح اُٹھتا ہوں سمیٹے ہوئے اعضائے بدن
رات ہوتی ہے تو بستر پہ بکھر جاتا ہوں

شمعِ امید

شمعِ غم سینۂ سوزاں میں جلا کر رکھوں
ان کو دُنیا کی نگاہوں سے بچا کر رکھوں
کیا خبر، کون کب آجائے مری خلوت میں
شمعِ امید دریچے میں جلا کر رکھوں

رُخِ ملیح

رُخِ ملیح پہ مایوسیوں کی پرچھائیں
نشیلی آنکھوں میں حزن وملال کی کاجل
یہ تم ہو یا کوئی تصویرِ شامِ ہجراں کی
یہ تم ہو یا ہے کوئی میرؔ کی اُداس غزل

نگاہ

نگاہ مل کے جھکی، جھک کے پھر اُٹھی، لیکن
اس ایک لمحے میں صدیاں گزر گئیں جیسے
حکایتیں جو چھپائی تھیں دل نے آنکھوں میں
مژہ پہ آکے اچانک بکھر گئیں جیسے

تشنگی

بہک بہک کے سنبھلتے رہے ہیں میرے قدم
وفا کے وعدے کیے اور کر کے توڑ دیے
میں تشنہ کام رہا میکدے میں آکر بھی
بہت سے جام لبوں سے لگا کے چھوڑ دیے

سرِشام

(۱)

کیا ہے وقت نے بے آب لیکن
کمی اب بھی نہیں ہے دلکشی میں
نظر آتی ہے وہ پایاب لیکن
بھنور پڑتے ہیں پھر بھی اس ندی میں

(۲)

جو کل تھا آج وہ عالم نہیں ہے
خزاں کی تمکنت بھی کم نہیں ہے
چمن محروم ہے پھولوں سے لیکن
کسی بھی شاخ کا سر خم نہیں ہے

(۳)

نہ جانے عمر کس صورت سے گزری
تعجب سے اسے دیکھے زمانہ
ادائیں آج بھی توبہ شکن ہیں
نظر اب بھی ہے اس کی کافرانہ

(۴)

چڑھی تھی جو بہ صد رنگ و تمازت
وہ کافر دھوپ ڈھلتی جا رہی ہے
بہت پُر کیف ہے لیکن سرِ شام
نشہ سا ہر طرف برسا رہی ہے

(۵)

کسی صورت خمارِ شب نہ ٹوٹے
علاجِ گردشِ ایام ساقی
پلا اپنے پرانے بادہ کش کو
شرابِ کہنہ کا اِک جام ساقی

آتشِ شوق

خشک سالی میں ہوئی پیار کی ہلکی بارش
ہونٹ کچھ تر ہوئے، آنکھوں میں تراوٹ آئی
مینہہ جو دَم بھر کو کھلا، تیز ہوئی آتشِ شوق
تشنگی اور بڑھی اور بڑھی اور بڑھی

وہ لمحہ

مٹا چکا ہوں نقوشِ ماضی ، بھلا چکا ہوں حکایتِ غم
کہ نو شگفتہ بہار کے دن گنوائے اے دل فضول میں نے
مگر وہ لمحہ بھلاؤں کیسے کہ جب حسیں گوشۂ چمن میں
کسی کے شب رنگ گیسوؤں میں کھلائے تھے سُرخ پھول میں نے

سلام کہنا

سلام کہنا مہکتی ہوئی بہاروں سے
سلام کہنا جواں سال ماہ پاروں سے
پہنچ کے انجمنِ رنگ و بُو میں بادِ صبا
سلام کہنا محبت کی یادگاروں سے

طوفان کے بعد

نہ بیزاری ، نہ بیتابی ، نہ شغل گوہر افشانی
مرے سیلِ جنوں میں اب نہیں اگلی سی طغیانی
کسی کی یاد آتی ہے بہ اندازِ ہوائے گل
مری تنہائیوں میں اب نہیں اگلی سی ویرانی

تجدید

بے صدا تھا دلِ حزیں کا ساز
تھک چکی تھی خیال کی پرواز
جاگ اٹھا نغمۂ بہارِ نشاط
جانے پھر کس نے دی مجھے آواز

دامنِ بہار

یہ مچلتے ہوئے ہر موجِ نفس میں نغمے
یہ مہکتا ہوا دوشیزہ بہاروں کا چمن
شہرِ تنہائیِ تخئیل میں چلتے چلتے
یک بہ یک ہاتھ میں پھر آ گیا کس کا دامن

آمدِ بہار

کل شبکسار فضاؤں پہ خزاں چھائی تھی
کل بہاریں کہیں روپوش تھیں خاموش تھے دل
آج سہمی ہوئی کلیوں کی قبا چاک ہوئی
آج کھلنے لگے پھول، آج دھڑکنے لگے دل

فصلِ گل

غنچہ لب کھول رہا ہے کہ بکھیرے نغمے
پھول انگشتِ حنائی کا تمنائی ہے
فصلِ گل آئی، چمن جھوم رہا ہے رفعتؔ
پھول تو پھول ہیں، کانٹوں پہ بہار آئی ہے

کون؟

کون آیا ہے گلستاں میں بہ اندازِ بہار
کس کا پرتو ہے کہ بجلی سی چمک جاتی ہے
کس کی آواز ہے، غنچے سے چٹک جاتے ہیں
کس کا دامن ہے کہ پھولوں کی مہک آتی ہے

ابھی نہیں

نظر کو وقفِ غمِ انتظار ہونے دو
خرد کو جوشِ جنوں کا شکار ہونے دو
ابھی نہیں، ابھی رُخ سے نہ تم اٹھاؤ نقاب
کچھ اور دل کو مرے بیقرار ہونے دو

سازِ بہار

چٹکتے غنچے لیے لبوں میں، گلاب مہکائے عارضوں میں
لطیف خوابوں کی آرزوئیں بسائے شب رنگ گیسوؤں میں
یہ کس نے سازِ بہار چھیڑا، اُداس تنہائی گنگنائی
مسرّتیں جسمِ ناز بن کر ڈھلک گئیں میرے بازوؤں میں

کانٹوں کی سیج

تو جانِ بہار لالۂ و گل، نور مہ و اختر ہے ساتھی
میرے شعروں کے دامن میں تیرا ہی پیکر ہے ساتھی
لیکن یہ کیسے کہوں تجھ سے اس وقت مرے کاشانے میں
پھولوں کی نازک سیج نہیں، کانٹوں کا بستر ہے ساتھی

محبت سے پہلے

میں بیقرار نہ تھا، درد کا شکار نہ تھا
مجھے حیات کی شوریدگی سے پیار نہ تھا
عجیب دن تھے کہ جب میری رفتہ حالی کو
تری تلاش نہ تھی، تیرا انتظار نہ تھا

نغمے

○

یہ زندگی کا ہے چمن عجب یہاں کا ہے چلن
کوئی کسی پہ طعنہ زن، کوئی کسی پہ خندہ زن

کسی کو عیش کی ہوس، کسی کو غم ہی راس ہے
کسی کی آرزو جواں، کسی کا دل اُداس ہے

اِسے خزاں سے پیار ہے، اُسے بہار کی لگن
یہ زندگی کا ہے چمن عجب یہاں کا ہے چلن

غم والم کی آنچ سے کبھی جو دل پگھل گئے
تو انجمن میں قہقہے بھی آنسوؤں میں ڈھل گئے

ہوائے غم کی موج سے بجھے چراغ انجمن
یہ زندگی کا ہے چمن عجب یہاں کا ہے چلن

تڑپ رہی ہیں بجلیاں، وہ جل رہا ہے آشیاں
وہ لٹ رہا ہے گلستاں، وہ ہنس رہا ہے باغباں

وہ آرہی ہیں آندھیاں، لیے بہار کا کفن
یہ زندگی کا ہے چمن عجب یہاں کا ہے چلن

○

دل رہ گیا ہمارا اک بار مسکرا کر
غم دے گئی محبت اِک بار گنگنا کر

دل میں مچلنے والے طوفان سو گئے ہیں
ارمان زندگی کے روپوش ہو گئے ہیں
خاموش ہو گئی ہے پھر شمع جھلملا کر
دل رہ گیا ہمارا اِک بار مسکرا کر

پھر یاد آرہے ہیں بھیگے ہوئے نظارے
پلکوں پہ کانپتے ہیں ٹوٹے ہوئے ستارے
غم جھلملا رہا ہے زخموں کو گدگدا کر
دل رہ گیا ہمارا اِک بار مسکرا کر

ویرانیاں چمن کی تقدیر بن گئی ہیں
محروم زندگی کی تصویر بن گئی ہیں
خوش ہے خزاں کا طوفاں پھولوں کا دل جلا کر
دل رہ گیا ہمارا اک بار مسکرا کر

○

وقت کے ساقی نے چھلکایا خوشیوں کا پیمانہ
پھولوں نے پھر ہنس کر چھیڑا الفت کا افسانہ

کل تک آنکھوں میں آنسو تھے، درد جگر میں، لب پر نالے
آج صدا پر سازِ طرب کی جھوم رہے ہیں ہم متوالے
پھولوں سے کہتی ہے صبا پھر بلبل کا افسانہ
وقت کے ساقی نے چھلکایا خوشیوں کا پیمانہ

میں بھونرا، تو شوخ کلی ہے، گلشن میں نازوں سے پلی ہے
نظروں نے افسانہ کہا ہے، دل سے دل کی بات چلی ہے
تو ہے میری شمع محبت ، میں تیرا پروانہ
وقت کے ساقی نے چھلکایا خوشیوں کا پیمانہ

○

ناچ رہی ہے زمین جھوم رہا آسماں
آئی ہے نئی بہار زندگی ہے شادماں

پائلوں کے ساتھ ساتھ ناچتی ہے زندگی
ناچتی ہے کہکشاں، ناچتی ہے چاندنی
مست ہوگئے ہیں آج فصلِ گُل کے کارواں
ناچ رہی ہے زمین جھوم رہا آسماں

چاندنی کے سائے میں جشنِ نوبہار ہے!
آج ہر نگاہ میں پیار کا خمار ہے
آج ہر نگاہ میں کوندتی ہیں بجلیاں
ناچ رہی ہے زمین جھوم رہا آسماں

اک دیا جو آندھیوں کے رُخ پہ رہ کے جل سکے
اک محل جو ایک دن خود بخود ہی گر پڑے
کس قدر عجیب ہے زندگی کی داستاں
ناچ رہی ہے زمین جھوم رہا آسماں

پھول ہیں، نہ گیت ہیں، رنگ ہے نہ رات ہے
آنکھ لگ گئی تو پھر مختصر حیات ہے
لوٹ کر نہ آئے گا زندگی کا کارواں
ناچ رہی ہے زمین جھوم رہا آسماں

مسکرائے جاؤ یونہی، یہ فضا بدل نہ جائے
وقت کس کا دوست ہے ہاتھ سے نکل نہ جائے
اور جام ساقیا، رات ہے ابھی جواں
ناچ رہی ہے زمیں، جھوم رہا آسماں

خوش فہمی

لب پہ حسنِ زندگی کی داستاں ہے آج بھی
ذہن میں زہراؤں کی اِک کہکشاں ہے آج بھی
رہ گیا بچپن کہیں ، احباب بوڑھے ہو چکے
دل کو خوش فہمی ہے لیکن، نوجواں ہے آج بھی

حادثہ

اس حادثۂ درد کا کس طرح بیاں ہو
جس نے مرے قدموں کو نئے موڑ دیئے ہیں
اعصاب کچل ڈالے رگِ جاں ہوئی مجروح
ہمت تو نہیں پاؤں مرے توڑ دیئے ہیں

OO

دوہے

○

اوپر اوپر برف ہے اندر اندر آگ
لکھا وِدھاتا نے ترا دھرتی کیسا بھاگ

○

مٹی، پانی، آگ، ہوا، سب سے ہم کو پیار
بن اُن کے جیون کہاں، سُونا ہے سنسار

○

رفعت جی ایکانت میں بیٹھے جی گھبرائے
تنہائی تو دُور ہو، چاہے دشمن آئے

○

کتنی ہی بپتا پڑے، کھونا مت اوسان
جینا ہی دُشوار ہے، مرنا تو آسان

○

جس کا سایہ ساتھ تھا، ٹوٹی وہ دیوار
اب تو دھوپ ہی دھوپ ہے، جینا ہے دشوار

○

بند کرو یہ چوپڑی، پھینکو قلم دوات
بس اس کا سمرن کرو، سنے جو من کی بات

○

کجرارے نینوں میں بسائے مست البیلا ساون
چال کچھ ایسی متواری لہرائے جیسے ناگن

○

مدھر ملن کی مدِرا پی کر جھوم رہا ہے من
اتنا ہوش نہیں کب آئے اور گئے ساجن

○

سب کو جیون دینے والی جنم جنم کی پیاسی
یگ یگ سے ہے دھرتی ماں اپنی سنتان کی داسی

○

روم روم کھل اُٹھتا ہے جب صبح صبح وہ آتا
جنم جنم سے ہی سورج سے ہے دھرتی کا ناتا

○

سورج کی بانہوں سے نکل کر سب تارے ویران
انجانی اِک ڈور بندھی ہے گھوم رہے نادان

○

جیون کی چنچل ندیا میں لہر لہر تھی روانی
جیٹھ کی دھوپ پڑی کچھ ایسی سوکھ گیا سب پانی

○

جنم جنم کی پیاسی ہوں میں لوک لاج کی ماری
میرا درد نہ کوئی جانے میں ہوں ابلا ناری

○

آنسو پی کر خون پلاتی ممتا میرا نام
دھرم مرا ہے سکھ پہنچانا جیون ہے نشکام

○

پل پل چھن چھن مٹتی جاتی یہ ماٹی کی کایا
پیڑ جو نیکی کا بویا بڑھتی ہے اس کی چھایا

○

کون اپنا اور کون پرایا کیا اس کی پہچان
جو ہے تیرے دُکھ کا بھاگی وہ سچا انسان

○

اِک نگری ایسی بھی دیکھی پردیسی کے ساتھ
محل دومحلوں والوں کی بھی قسمت میں فٹ پاتھ

○

کھیل تماشے، شور شرابہ، یہ جیون اِک میلا
ہنس لے، گالے، دھوم مچالے، کل جانا ہے اکیلا

○

دشمن، دوست، سگے سمبندھی، ملے ہیں کیسے کیسے
ایسے جیون کا اک پل بھی ایک صدی ہے جیسے

○

کون کسی کا درد مٹائے، سنے کسی کا حال
تم کیسے ہو؟ میں اچھا ہوں، سب شبدوں کے جال

○

یہ تذکرۂ عظمتِ پارینہ ہے   اور حکمت و علم و فن کا گنجینہ ہے
یہ صرف نہیں جنگ و جدل کی روداد   تاریخ تو تہذیب کا آئینہ ہے

○

دن رات بدل جاتے ہیں، لیکن تاریخ   سکّے نئے ڈھل جاتے ہیں، لیکن تاریخ!
تاریخ کا ہر لفظ ابد کی تحریر   پتھر بھی پگھل جاتے ہیں، لیکن تاریخ

○

تاریخ کی تعظیم ضروری ہے بہت   تاریخ کی تکریم ضروری ہے بہت
لیکن اسے بامعنی بنانے کے لیے   تاریخ کی تفہیم ضروری ہے بہت

○

کچھ گردِ مہہ و سال میں کھو جاتے ہیں   کچھ مقبرۂ وقت میں سو جاتے ہیں
تاریخ کے کردار وہی ہیں افضل   جو مٹ کے سدا بہار ہو جاتے ہیں

○

تاریخ کا ایوانِ عدالت دیکھو   آخر ہوئی سرخ رو صداقت دیکھو
ظالم تھے جو کل، آج وہ ٹھہرے ملزم   یہ وقت کے انصاف کی عظمت دیکھو

○

دانشوریٔ اہلِ خرد پائندہ پیشانیٔ تہذیبِ ہنر تابندہ
مٹ جاتا ہے انسان کا جسم خاکی اعمال مگر رکھتے ہیں اس کو زندہ

○

ہر سمت دغا، مکر و ریا اور ہلچل تاریک میں کس درجہ نئے رنگ محل
ہاں جلتی ہے تاریخ کے تہہ خانوں میں تہذیب و تمدن کی ابھی تک مشعل

○

تھے کتنے شہنشاہ جو مجرم ٹھہرے معصوم جو کہلاتے تھے ملزم ٹھہرے
جب وقت کی میزان میں تولا ان کو جو ظلِ الٰہی تھے وہ ظالم ٹھہرے

○

دنیا ہے یہ سانسوں کا انوکھا بازار اس میلے میں سب کرتے ہیں اپنا بیوپار
کیوں دشمنی لے مول ہے کس کو فرصت دشمن ہے اگر کوئی تو اپنا کردار

○

انفاس کا جب ٹوٹ گیا پیمانہ کل تک جو حقیقت تھا، بنا افسانہ
تاریخ جسے کہتے ہیں اہلِ دانش گزرے ہوئے لمحوں کا ہے مردہ خانہ

○

ہیں لاکھ بکھیڑے فقط اِک جان کے ساتھ
آفات کا لشکر ہے ہر انسان کے ساتھ
طوفانِ حوادث سے نہیں جو خائف
لڑتے ہیں وہی گردشِ ایام کے ساتھ

○

بگڑے ہیں کچھ اس طور سے دنیا کے ڈھنگ
تبدیلیٔ ماحول سے تاریخ ہے دَنگ
عریانی و بے غیرتی و خود غرضی
تحفے نئی تہذیب کے کتنے خوش رنگ

○

دنیا نے مجھے لوٹا ہے دھیرے دھیرے
یہ شیشۂ دل ٹوٹا ہے دھیرے دھیرے
کس طرح کہوں صبر و سکوں کا دامن
ہاتھوں سے مرے چھوٹا ہے دھیرے دھیرے

○

اے وقت کے رہوار ذرا دھیرے چل
اے قافلہ سالار ذرا دھیرے چل
منزل ہے کہاں کچھ نہیں معلوم ابھی
ہے راستہ دشوار ذرا دھیرے چل

○○

قطعات

ابتدا

شروع کرتا ہوں ہر بات تیرے نام کے بعد
کوئی مقام نہیں ہے تیرے مقام کے بعد
یہ تیرا فیضِ سخن ہے کہ بزمِ زنداں میں
کلام پڑھتا ہوں اپنا ترے کلام کے بعد

اُردو

(۱)

ہے بزم میں الفت کی کہانی اُردو — اخلاص و مروّت کی نشانی اُردو
اور رزم گہہِ شوق میں باطل کے لیے — ہے تیغِ صداقت کی روانی اُردو

(۲)

تہذیبِ محبت کا قرینہ اُردو — سیلابِ تعصب میں سفینہ اُردو
جس رفعتِ تہذیب پہ جانا ہے ہمیں — اس بامِ ترقی کا ہے زینہ اُردو

خسرو

بلبلِ ہندوستاں اے خسروؔ شیریں بیاں ہیں ترے نغمات میں اسرار وحدت کے نہاں
ہے ترے اشعار کے دل میں معانی کا ہجوم ہندی و اُردو کا سنگم ہے تری پیاری زباں

غالبؔ و اقبالؔ

کتنے نظر فریب ہیں ان بوتلوں کے رنگ جن بوتلوں میں فلسفۂ مغربی ہے بند
ہم تشنہ کامِ ہند ہیں اے پیرِ میکدہ! ہم کو تو جامِ غالبؔ و اقبالؔ ہے پسند

نگینہ

(۱)

زمیں وہ جسے آسماں کہہ سکوں وہ گلیاں جنھیں کہکشاں کہہ سکوں
خوشا پھر نگینہ میں رکھا قدم محبت کا جس کو جہاں کہہ سکوں

(۲)

نگینہ کی فضائیں اللہ اللہ وضو کرتی ہیں U اللہ اللہ
صدا والد کی اپنے سن رہا ہوں سحر دم یہ اذانیں اللہ اللہ

(۳)

شرافت سے ڈھلے معصوم چہرے
صداقت سے سجے معصوم چہرے
تصور کی کرامت اللہ اللہ
نظر آنے لگے معصوم چہرے

(۴)

سبق پہلا جو بچپن میں پڑھا تھا
اسی کی دین ہے یہ علم و حکمت
سلام اس مدرسہ کو جس نے بخشا
مزاجِ شاعرانہ ، ذوقِ خدمت

بھلائی

(۱)

لینن کے حسین خواب کی تعبیر بھلائی
نہرو کے تبسم کی ہے تنویر بھلائی
جس شعر کا اک مصرعہ ہے روس ایک ہے بھارت
اے دوست ہے اس شعر کی تفسیر بھلائی

(۲)

پگھلا ہوا سونا ہے کہ فولاد کی دھار
تعمیر کا نغمہ ہے کہ فولاد کی دھار
ہے کتنا سکوں ریز یہ شورِ تخلیق
یہ امن کی گنگا ہے کہ فولاد کی دھار

(۳)

احساس کی چوڑیاں کھنک جاتی ہیں
فولاد کی اُنگلیاں لچک جاتی ہیں
گوری جو کبھی بھول کے رکھتی ہے قدم
فولاد کی گاگریں چھلک جاتی ہیں

پرانے خدا

تاج و تخت و سرمایہ حسنِ زیست تھے کل تک
آج موت بہتر ہے یہ فریب کھانے سے
اُٹھ! کہ اب بدل ڈالیں اے شعورِ آزادی!
یہ زمین کہنہ سی ، یہ خدا پُرانے سے

تفریقِ مذاہب

جانے کیا شے تھی ترے جام میں اے ساقیٔ زیست
جانے کب پی تھی مگر آج بھی باقی ہے خمار
نشۂ فرقہ پرستی نہیں اُترا سر سے
اَب بھی انسان ہے تفریقِ مذاہب کا شکار

خودداری کے تابوت

دیکھ کر آج بھی انسان کو مطلب کا شکار
دلِ بیدار سے پھر اُٹھتے ہیں رہ رہ کے شرار
یہ جو ہر در پہ ہیں دولت کے لیے سجدہ کناں
ہیں یہ خودداری کے تابوت، حمیت کے مزار

موت اور زندگی

پھونس کے چھپّر سے بھی محروم مفلس کا مکاں
لعل و گوہر سے مزیّن بادشاہوں کے مزار
اے دلِ شاعر مگر مایوس کیوں ہوتا ہے تو
یہ بہارِ زندگی وہ موت کا سونا دیار

آفتابِ حیات

خزاں رسیدہ بہاروں کی بات جانے دے
شکستہ حال مزاروں کی بات جانے دے
اُبھر رہا ہے شفق سے وہ آفتابِ حیات
اُفق میں ڈوبتے تاروں کی بات جانے دے

سنامی

پھر زمیں کے سینۂ بیتاب میں ہلچل ہوئی
زلزلوں نے پھر تہہ و بالا کیا سارا نظام
قلبِ بحرِ بے کراں سے پھر اُٹھا طوفانِ موج
یہ قیامت خیز طوفاں، ہے سنامی جس کا نام

سمندر

اس میں پانی ہے تو سب سیاروں سے افضل زمیں
اشرف المخلوق اس کرّے پہ ہی آباد ہے
جوش میں آئے گا جب انسان کو پی جائے گا
کیا خبر تھی یہ سمندر اس قدر جلاّد ہے

بے بسی

چاند تاروں پہ کمندیں ڈالتا ہے آدمی
اور رہوارِ زمیں اب تک ہے لیکن بے لگام
زلزلوں سے یہ حقیقت آشکارا ہوگئی
آدمی کتنا ہے بے بس اور نیچر کا غلام

نئے آفتاب

لبوں پہ گیت نظر میں گلاب لے کے چلے
دلوں میں ولولۂ انقلاب لے کے چلے
زمینِ ہند تری عظمتوں کے دیوانے
ہتھیلیوں پہ نئے آفتاب لے کے چلے

تلواروں کے سائے

تلواروں کے سائے میں پلے ہیں ہم لوگ
طوفان میں شعلوں کے بڑھے ہیں ہم لوگ
منزل یہ بہاروں کی نہ تھی کچھ آساں
کانٹوں بھری راہوں پہ چلے ہیں ہم لوگ

سنگ پارے

دیکھ یہ تاج و اجنتا کے منقش در و بام
مسکراتا ہوا گلشن ہے ہر اک پتھر میں
سنگ پارے ہیں یہ تہذیبِ محبت کے امیں
قلبِ معمار کی دھڑکن ہے ہر اک پتھر میں

تعصب

روش روش پہ کھلے ہیں ہزار رنگ کے پھول
ہوا کا ریشمی آنچل فضا میں لہرائے
بہت حسین تھا یہ منظرِ بہار مگر
تعصّبات کے کانٹے چمن میں اُگ آئے

محبت کا نشاں

خون، نفرت، جنگ، لاشیں، بربریت، الاماں!
آدمیت لے رہی ہے ہچکیوں پر ہچکیاں
اور کچھ اُونچا کریں نفرت کے اس ماحول میں
''ویز'' کا بخشا ہوا امن و محبت کا نشاں

بمبئی

(۱)

بمبئی تیری جنوں خیز بہاروں کو سلام
بعد مدت کے میں پردیس سے لوٹا ہوں ابھی
تُو نے بخشا تھا کبھی درد کا نادر تحفہ
اس کو سینے سے لگائے ہوئے زندہ ہوں ابھی

(۲)

بمبئی تیرے شب و روز کے ہنگاموں میں
گھل رہے ہیں مرے نغمے، مری آواز کا درد
تو نے جو آگ محبت کی لگائی تھی کبھی
وقت کی برف اسے کر نہ سکی اب تک سرد

اِک کلی

جب نسیمِ صبح نے چھیڑی سحر کی راگنی
پتیوں کی آڑ میں یوں مسکرائی اِک کلی
جس طرح جاگے کوئی دوشیزہ خوابِ ناز سے
انکھڑیاں ملتی ہوئی، انگڑائیاں لیتی ہوئی

زندگی کی سحر

سُرخیاں عارضوں پہ ضَو افگن
نورِ معصومیت جبینوں پر
مہ جمالوں کو دیکھتا ہوں میں
یا نظر میں ہے زندگی کی سحر

خیال

بے رنگ تھے مناظر، بے کیف تھی طبیعت
آئے خیال بن کر کچھ بے مثال سائے
سجدے کئے فضا کی بیہوشیوں نے دل کو
مدہوش چاندنی نے خاموش گیت گائے

یادیں

بہت دنوں بعد آج دل میں کسک سی محسوس کر رہا ہوں
بہت دنوں بعد آج نشتر بنی ہیں اٹکھیلیاں صبا کی
نکھر رہی ہیں حسین یادیں، اُبھر رہی ہیں پُرانی چوٹیں
نہ جانے کیوں مسکرا رہی ہیں متین خاموشیاں فضا کی

کاش

ذرّہ ذرّہ دہر کا خاموش ہے
ظلمتوں میں سو گئیں پرچھائیاں
کاش ایسے میں کوئی رنگیں جمال
لُوٹ لے آ کر مری تنہائیاں

اُمید

امید نے پھر لیا سنبھالا!
پھر جانبِ در اُٹھیں نگاہیں
دُھندلی سی لکیر زندگی کی
لہرائی فنا کی وادیوں میں

آہٹ

کس کی آہٹ مرے احساس کو چونکاتی ہے
یاں اندھیرا ہے بہت، آؤ سنبھل کر آؤ
کون ہو تم! مجھے کچھ یاد نہیں آتا ہے
گوشۂ ذہن سے باہر تو نکل کر آؤ

عالمِ حیرت

ہیں میرے ذہن میں رقصاں ہزار تصویریں
ہر ایک میں ترا پرتو، ترا جلال و جمال
مگر وہ بُعد کہ قربت نثار ہو جس پر
عجیب عالمِ حیرت! فراق ہے نہ وصال

وہ آئیں گھر پہ

ہاں یہی ہے مرا یہ خانۂ غم
عمر گزری اسی کا شانے میں
اب تکلف کی ضرورت کیا ہے
بیٹھ جاؤ اِسی ویرانے میں

نذر

متاعِ زندگیٔ مستعار نذر کروں
قبول ہو تو دلِ بیقرار نذر کروں
تمام رات برستے رہے جو آنکھوں سے
پسند ہو تو ان اشکوں کا ہار نذر کروں

خموشی

لبِ سروشؔ کو یوں ہی خموش رہنے دو
دلِ شکستہ کے نغمے نہ سن سکو گی تم
یہ ایک موجِ تبسم بہت غنیمت ہے
کہ چشمِ شوق کے موتی نہ چن سکو گی تم

ایک راز

لب پر نہ آسکے گا کبھی حرفِ آرزو
یہ بات اپنے دیدۂ حیراں سے پوچھنا
کیوں اتنا بیقرار ہے تیرے لیے سروشؔ
یہ راز اپنی زلفِ پریشاں سے پوچھنا

بے رُخی

شاید تجھے بھی یاد نہ آئے وہ دن کبھی
جب تیرے ہر نفس نے پکارا نہیں مجھے
اے جانِ نَو بہار یہ کیا انقلاب ہے
اب مجھ سے گفتگو بھی گوارا نہیں تجھے

دلِ ناداں

مجھے ملال نہیں تیری بے نیازی نے
مرے خلوص ، مری دوستی کو ٹھکرایا
مگر میں سوچ رہا ہوں کہ یہ دلِ ناداں
ترے خیال، ترے غم سے کیوں نہ باز آیا

وہ لمحہ

مٹا چکا ہوں نقوشِ ماضی ، بھلا چکا ہوں حکایتِ غم
کہ نو شگفتہ بہار کے دن گنوائے اے دل فضول میں نے
مگر وہ لمحہ بھلاؤں کیسے کہ جب حسیں گوشۂ چمن میں
کسی کے شب رنگ گیسوؤں میں کھلائے تھے سُرخ پھول میں نے

سلام کہنا

سلام کہنا مہکتی ہوئی بہاروں سے
سلام کہنا جواں سال ماہ پاروں سے
پہنچ کے انجمنِ رنگ و بُو میں بادِ صبا
سلام کہنا محبت کی یادگاروں سے

طوفان کے بعد

نہ بیزاری ، نہ بیتابی ، نہ شغلِ گوہر افشانی
مرے سیلِ جنوں میں اب نہیں اگلی سی طغیانی
کسی کی یاد آتی ہے بہ اندازِ ہوائے گل
مری تنہائیوں میں اب نہیں اگلی سی ویرانی

تجدید

بے صدا تھا دلِ حزیں کا ساز
تھک چکی تھی خیال کی پرواز
جاگ اُٹھا نغمۂ بہارِ نشاط
جانے پھر کس نے دی مجھے آواز

دامنِ بہار

یہ مچلتے ہوئے ہر موجِ نفس میں نغمے
یہ مہکتا ہوا دوشیزہ بہاروں کا چمن
شہرِ تنہائیِ تخیّل میں چلتے چلتے
یک بہ یک ہاتھ میں پھر آ گیا کس کا دامن

آمدِ بہار

کل شبکسار فضاؤں پہ خزاں چھائی تھی
کل بہاریں کہیں روپوش تھیں خاموش تھے دل
آج ہی ہوئی کلیوں کی قبا چاک ہوئی
آج کھلنے لگے پھول، آج دھڑکنے لگے دل

فصلِ گُل

غنچہ لب کھول رہا ہے کہ بکھیرے نغمے
پھول انگشتِ حنائی کا تمنائی ہے
فصلِ گل آئی، چمن جھوم رہا ہے رفعتؔ
پھول تو پھول ہیں، کانٹوں پہ بہار آئی ہے

کون؟

کون آیا ہے گلستاں میں بہ اندازِ بہار
کس کا پرتو ہے کہ بجلی سی چمک جاتی ہے
کس کی آواز ہے، غنچے سے چٹک جاتے ہیں
کس کا دامن ہے کہ پھولوں کی مہک آتی ہے

ابھی نہیں

نظر کو وقفِ غمِ انتظار ہونے دو
خرد کو جوشِ جنوں کا شکار ہونے دو
ابھی نہیں، ابھی رُخ سے نہ تم اٹھاؤ نقاب
کچھ اور دل کو مرے بیقرار ہونے دو

سازِ بہار

چٹکتے غنچے لیے لبوں میں، گلاب مہکائے عارضوں میں
لطیف خوابوں کی آرزوئیں بسائے شب رنگ گیسوؤں میں
یہ کس نے سازِ بہار چھیڑا، اُداس تنہائی گنگنائی
مسرّتیں جسمِ ناز بن کر ڈھلک گئیں میرے بازوؤں میں

کانٹوں کی سیج

تو جانِ بہار لالۂ و گل، نور مہ و اختر ہے ساتھی
میرے شعروں کے دامن میں تیرا ہی پیکر ہے ساتھی
لیکن یہ کیسے کہوں تجھ سے اس وقت مرے کاشانے میں
پھولوں کی نازک سیج نہیں، کانٹوں کا بستر ہے ساتھی

محبت سے پہلے

میں بیقرار نہ تھا، درد کا شکار نہ تھا
مجھے حیات کی شوریدگی سے پیار نہ تھا
عجیب دن تھے کہ جب میری رفتہ حالی کو
تری تلاش نہ تھی، تیرا انتظار نہ تھا

محبت کے بعد

تو میرے ساتھی سہی پھر بھی گھپ اندھیرا ہے
تری نظر کے اشاروں سے آج کیا ہوگا
ذرا ٹھہر، مجھے سورج طلوع کرنے دے
کہ زرد زرد ستاروں سے آج کیا ہوگا

کل اور آج

کل حریفِ غمِ دوراں تھا، مگر آج یہ کیا
اپنی ہی ذات کے میں بوجھ سے گھبراتا ہوں
صبح اُٹھتا ہوں سمیٹے ہوئے اعضائے بدن
رات ہوتی ہے تو بستر پہ بکھر جاتا ہوں

شمعِ امید

شمعِ غم سینۂ سوزاں میں جلا کر رکھوں
ان کو دُنیا کی نگاہوں سے بچا کر رکھوں
کیا خبر، کون کب آجائے مری خلوت میں
شمعِ امید دریچے میں جلا کر رکھوں

رُخِ ملیح

رُخِ ملیح پہ مایوسیوں کی پرچھائیں
نشیلی آنکھوں میں حزن وملال کی کاجل
یہ تم ہو یا کوئی تصویرِ شامِ ہجراں کی
یہ تم ہو یا ہے کوئی میرؔ کی اُداس غزل

نگاہ

نگاہ مل کے جھکی، جھک کے پھر اُٹھی، لیکن
اس ایک لمحے میں صدیاں گزر گئیں جیسے
حکایتیں جو چھپائی تھیں دل نے آنکھوں میں
مژہ پہ آکے اچانک بکھر گئیں جیسے

تشنگی

بہک بہک کے سنبھلتے رہے ہیں میرے قدم
وفا کے وعدے کیے اور کر کے توڑ دیئے
میں تشنہ کام رہا میکدے میں آکر بھی
بہت سے جام لبوں سے لگا کے چھوڑ دیئے

سرِ شام

(۱)

کیا ہے وقت نے بے آب لیکن
کمی اب بھی نہیں ہے دلکشی میں
نظر آتی ہے وہ پایاب لیکن
بھنور پڑتے ہیں پھر بھی اس ندی میں

(۲)

جو کل تھا آج وہ عالم نہیں ہے
خزاں کی تمکنت بھی کم نہیں ہے
چمن محروم ہے پھولوں سے لیکن
کسی بھی شاخ کا سر خم نہیں ہے

(۳)

نہ جانے عمر کس صورت سے گزری
تعجب سے اسے دیکھے زمانہ
ادائیں آج بھی توبہ شکن ہیں
نظر اب بھی ہے اس کی کافرانہ

(۴)

چڑھی تھی جو بہ صد رنگ و تمازت
وہ کافر دھوپ ڈھلتی جارہی ہے
بہت پرکیف ہے لیکن سرِ شام
نشہ سا ہر طرف برسا رہی ہے

(۵)

کسی صورت خمارِ شب نہ ٹوٹے
علاجِ گردشِ ایام ساقی
پلا اپنے پرانے بادہ کش کو
شرابِ کہنہ کا اِک جام ساقی

آتشِ شوق

خشک سالی میں ہوئی پیار کی ہلکی بارش
ہونٹ کچھ تر ہوئے، آنکھوں میں تراوٹ آئی
مینہہ جو دَم بھر کو کھلا، تیز ہوئی آتشِ شوق
تشنگی اور بڑھی اور بڑھی اور بڑھی

خوش فہمی

لب پہ حسنِ زندگی کی داستاں ہے آج بھی
ذہن میں زہراؤں کی اک کہکشاں ہے آج بھی
رہ گیا بچپن کہیں ، احباب بوڑھے ہو چکے
دل کو خوش فہمی ہے لیکن ، نوجواں ہے آج بھی

حادثہ

اس حادثۂ درد کا کس طرح بیاں ہو
جس نے مرے قدموں کو نئے موڑ دیئے ہیں
اعصاب کچل ڈالے رگِ جاں ہوئی مجروح
ہمت تو نہیں پاؤں مرے توڑ دیئے ہیں

○○

دوھے

○

اوپر اوپر برف ہے اندر اندر آگ
لکھا وِدھاتا نے ترا دھرتی کیسا بھاگ

○

مٹی، پانی، آگ، ہوا، سب سے ہم کو پیار
بن اُن کے جیون کہاں، سُونا ہے سنسار

○

رفعت جی ایکانت میں بیٹھے جی گھبرائے
تنہائی تو دُور ہو، چاہے دشمن آئے

○

کتنی ہی بپتا پڑے، کھونا مت اوسان
جینا ہی دُشوار ہے، مرنا تو آسان

○

جس کا سایہ ساتھ تھا، ٹوٹی وہ دیوار
اب تو دھوپ ہی دھوپ ہے، جینا ہے دشوار

○

بند کرو یہ چوپڑی، پھینکو قلم دوات
بس اس کا سمرن کرو، سنے جو من کی بات

○

کجرارے نینوں میں بسائے مست البیلا ساون
چال کچھ ایسی متواری لہرائے جیسے ناگن

○

مدھر ملن کی مدرا پی کر جھوم رہا ہے من
اتنا ہوش نہیں کب آئے اور گئے ساجن

○

سب کو جیون دینے والی جنم جنم کی پیاسی
یگ یگ سے ہے دھرتی ماں اپنی سنتان کی داسی

○

روم روم کھل اُٹھتا ہے جب صبح صبح وہ آتا
جنم جنم سے ہی سورج سے ہے دھرتی کا ناتا

○

سورج کی بانہوں سے نکل کر سب تارے ویران
انجانی اک ڈور بندھی ہے گھوم رہے نادان

○

جیون کی چنچل ندیا میں لہر لہر تھی روانی
جیٹھ کی دھوپ پڑی کچھ ایسی سوکھ گیا سب پانی

○

جنم جنم کی پیاسی ہوں میں لوک لاج کی ماری
میرا درد نہ کوئی جانے میں ہوں ابلا ناری

○

آنسو پی کر خون پلاتی ممتا میرا نام
دھرم مرا ہے سکھ پہنچانا جیون ہے نشکام

○

پل پل چھن چھن گھٹتی جاتی یہ ماٹی کی کایا
پیڑ جو نیکی کا بویا بڑھتی ہے اس کی چھایا

○

کون اپنا اور کون پرایا کیا اس کی پہچان
جو ہے تیرے دُکھ کا بھاگی وہ سچا انسان

○

اِک نگری ایسی بھی دیکھی پردیسی کے ساتھ
محل دو محلوں والوں کی بھی قسمت میں فٹ پاتھ

○

کھیل تماشے، شور شرابہ، یہ جیون اِک میلا
ہنس لے، گا لے، دھوم مچا لے، کل جانا ہے اکیلا

○

دُشمن، دوست، سگے سمبندھی، ملے ہیں کیسے کیسے
ایسے جیون کا اِک پل بھی ایک صدی ہے جیسے

○

کون کسی کا درد مٹائے، سنے کسی کا حال
تم کیسے ہو؟ میں اچھا ہوں، سب شبدوں کے جال

نغمے

○

یہ زندگی کا ہے چمن عجب یہاں کا ہے چلن
کوئی کسی پہ طعنہ زن، کوئی کسی پہ خندہ زن

کسی کو عیش کی ہوس، کسی کو غم ہی راس ہے
کسی کی آرزو جواں، کسی کا دل اُداس ہے

اِسے خزاں سے پیار ہے، اُسے بہار کی لگن
یہ زندگی کا ہے چمن عجب یہاں کا ہے چلن

غم والم کی آنچ سے کبھی جو دل پگھل گئے
تو انجمن میں قہقہے بھی آنسوؤں میں ڈھل گئے

ہوائے غم کی موج سے بجھے چراغ انجمن
یہ زندگی کا ہے چمن عجب یہاں کا ہے چلن

تڑپ رہی ہیں بجلیاں، وہ جل رہا ہے آشیاں
وہ لٹ رہا ہے گلستاں، وہ ہنس رہا ہے باغباں

وہ آرہی ہیں آندھیاں، لیے بہار کا کفن
یہ زندگی کا ہے چمن عجب یہاں کا ہے چلن

○

دل رہ گیا ہمارا اِک بار مسکرا کر
غم دے گئی محبت اِک بار گنگنا کر

دل میں مچلنے والے طوفان سو گئے ہیں
ارمان زندگی کے روپوش ہو گئے ہیں
خاموش ہو گئی ہے پھر شمع جھلملا کر
دل رہ گیا ہمارا اِک بار مسکرا کر

پھر یاد آ رہے ہیں بہکے ہوئے نظارے
پلکوں پہ کانپتے ہیں ٹوٹے ہوئے ستارے
غم جھلملا رہا ہے زخموں کو گدگدا کر
دل رہ گیا ہمارا اِک بار مسکرا کر

ویرانیاں چمن کی تقدیر بن گئی ہیں
محروم زندگی کی تصویر بن گئی ہیں
خوش ہے خزاں کا طوفاں پھولوں کا دل جلا کر
دل رہ گیا ہمارا اِک بار مسکرا کر

○

وقت کے ساقی نے چھلکایا خوشیوں کا پیمانہ
پھولوں نے پھر ہنس کر چھیڑا الفت کا افسانہ

کل تک آنکھوں میں آنسو تھے، درد جگر میں، لب پر نالے
آج صدا پر سازِ طرب کی جھوم رہے ہیں ہم متوالے
پھولوں سے کہتی ہے صبا پھر بلبل کا افسانہ
وقت کے ساقی نے چھلکایا خوشیوں کا پیمانہ

میں بھونرا، تو شوخ کلی ہے، گلشن میں نازوں سے پلی ہے
نظروں نے افسانہ کہا ہے، دل سے دل کی بات چلی ہے
تو ہے میری شمع محبت ، میں تیرا پروانہ
وقت کے ساقی نے چھلکایا خوشیوں کا پیمانہ

○

ناچ رہی ہے زمین جھوم رہا آسماں
آئی ہے نئی بہار زندگی ہے شادماں

پائلوں کے ساتھ ساتھ ناچتی ہے زندگی
ناچتی ہے کہکشاں ، ناچتی ہے چاندنی
مست ہوگئے ہیں آج فصلِ گل کے کارواں
ناچ رہی ہے زمین جھوم رہا آسماں

چاندنی کے سائے میں جشنِ نو بہار ہے!
آج ہر نگاہ میں پیار کا خمار ہے
آج ہر نگاہ میں کوندتی ہیں بجلیاں
ناچ رہی ہے زمین جھوم رہا آسماں

اِک دیا جو آندھیوں کے رُخ پہ رہ کے جل سکے
اِک محل جو ایک دن خود بخود ہی گر پڑے
کس قدر عجیب ہے زندگی کی داستاں
ناچ رہی ہے زمین جھوم رہا آسماں

پھول ہیں، نہ گیت ہیں، رنگ ہے نہ رات ہے
آنکھ لگ گئی تو پھر مختصر حیات ہے
لَوٹ کر نہ آئے گا زندگی کا کارواں
ناچ رہی ہے زمین جھوم رہا آسماں

مسکرائے جا یونہی ، یہ فضا بدل نہ جائے
وقت کس کا دوست ہے ہاتھ سے نکل نہ جائے
اور جام ساقیا ، رات ہے ابھی جواں
ناچ رہی ہے زمیں ، جھوم رہا آسماں

○

ہنس رہا ہے چاند گا رہی ہے رات
پھر فضاؤں پر چھا رہی ہے رات
دل کی دھڑکنیں گیت بن گئیں
پیار کی ہوائیں ، میت بن گئیں
کس نے رکھ دیا میرے دل پہ ہات
ہنس رہا ہے چاند ، گا رہی ہے رات
زندگی کی چھاؤں ، پیار کی ترنگ
حسن کی بہار ، پریت کی اُمنگ
تارے لائے ہیں ، پیار کی برات
ہنس رہا ہے چاند ، گا رہی ہے رات
بن کے چاندنی ، رات ڈھل نہ جائے
وقت ہاتھ سے ، پھر نکل نہ جائے
دل میں رہ نہ جائے آج دل کی بات
ہنس رہا ہے چاند ، گا رہی ہے رات

○

محبت کا ادھورا گیت گالوں پھر چلے جانا
تمناؤں کی محفل کو سجالوں پھر چلے جانا

سہانی چاندنی ، تاروں کی چھاؤں اور تنہائی
اُمنگیں مسکرائیں ، زندگی نے لی ہے انگڑائی
میں اس جنت کو پہلو میں بسالوں پھر چلے جانا
محبت کا ادھورا گیت گالوں پھر چلے جانا

مہکتے گیسوؤں کو یونہی شانوں پر مچلنے دو
جوانی کے قدم پھر ڈگمگانے دو سنبھلنے دو
سنبھل کر دل کا افسانہ سنالوں پھر چلے جانا
محبت کا ادھورا گیت گالوں پھر چلے جانا

محبت میں جوانی نے ہزاروں خواب دیکھے ہیں
تمھاری مسکراہٹ سے وہ رنگیں خواب جاگے ہیں
میں اُن خوابوں کی تصویریں بنالوں پھر چلے جانا
محبت کا ادھورا گیت گالوں پھر چلے جانا

○

ٹوٹے ہوئے دل کا سُنے اب کون فسانہ
بیگانہ ہوا مجھ سے زمانہ کا زمانہ

اب درد کے ماروں کو سہارا نہیں ملتا
طوفان کی موجوں میں کنارا نہیں ملتا

لوٹا ہے محبت نے مسرّت کا خزانہ
ٹوٹے ہوئے دل کا سُنے اب کون فسانہ

بیتاب ہوں، آنکھوں سے برستی ہیں گھٹائیں
اشکوں میں جھلکتی ہیں زمانہ کی جفائیں

ہونٹوں پہ لرزتا ہے وفاؤں کا ترانہ
ٹوٹے ہوئے دل کا سُنے اب کون فسانہ

○

ٹوٹے ہوئے دل آ تجھے آنکھوں سے لگالوں
اے دردِ محبت تجھے سینہ میں چھپالوں

مرجھایا ہوا دل کا کنول اب نہ ہنسے گا
اِک بار جو اُجڑا یہ چمن ، پھر نہ بسے گا
روکر ہی سہی ، غم یہ جدائی کا اُٹھالوں
ٹوٹے ہوئے دل آ تجھے آنکھوں سے لگالوں

اِک پھول بھی باقی نہیں اب میرے چمن میں
جس پیار کے پھولوں سے بہار آئی تھی من میں
اس پیار کے کانٹوں سے ہی دامن کو سجالوں
ٹوٹے ہوئے دل آ تجھے آنکھوں سے لگالوں

○

دل کا سکون لُٹ گیا ، روح بھی بیقرار ہے
تاروں کی آنکھ نم ہے آج، چاند بھی داغدار ہے
دل کے چمن کی خیر ہو ، کوندرہی ہیں بجلیاں
ڈر ہے کہ آج جل نہ جائے زندگی تیرا آشیاں
شغلِ بہار اب کہاں ، ہر کلی سوگوار ہے
دل کا سکون لُٹ گیا ، روح بھی بیقرار ہے
اب نہ ہنسی کی گفتگو ، اب نہ خوشی کی جستجو
درد نے جیسے چھین لی دل سے ہر ایک آرزو
شمعِ امید بجھ گئی ، دل ہے کہ اک مزار ہے
دل کا سکون لُٹ گیا ، روح بھی بیقرار ہے

○

آجاؤ سن تو لو مرے دل کی پکار تم!
گلشن میں زندگی کے ہو پہلی بہار تم

یہ چاندنی، یہ رات، یہ خاموشیوں کے جال
تنہائی مجھ سے کرتی ہے رہ رہ کے یہ سوال
کرتے ہو کس کو یاد یہاں بار بار تم
آجاؤ سن تو لو مرے دل کی پکار تم!

موجوں نے راگ چھیڑا ہے پھر آج پیار کا
ٹھنڈی ہَوا سُناتی ہے نغمہ بہار کا
کہتی ہے مجھ سے کیوں ہو بھلا بیقرار تم
آجاؤ سن تو لو مرے دل کی پکار تم!

ارمان زندگی کے جو تم نے جگائے تھے
امیّد کے وہ پھول جو تم نے کھلائے تھے
کہتے ہیں لوٹ آؤ مثالِ بہار تم
آجاؤ سن تو لو مرے دل کی پکار تم!

○

میں تو مہمان ہوں ستاروں کا
مسکراتی ہوئی بہاروں کا

میرا نغمہ چٹک ہے غنچوں کی
گنگناہٹ چمن میں بھونروں کی

یا ترنّم ہے آبشاروں کا
میں تو مہمان ہوں ستاروں کا

ہنستے پھولوں کی تازگی کی قسم
شوخ کلیوں کی دلکشی کی قسم

میں ہوں پروانہ گل عذاروں کا
میں تو مہمان ہوں ستاروں کا

اے صبا چھوڑ دے مرا دامن
غم کا گلشن ہے زندگی کا چمن

میں ہوں محبوب ماہ پاروں کا
میں تو مہمان ہوں ستاروں کا

○

اگر تم نہ آئے اگر تم نہ آئے

نہ برسیں گے بادل، نہ چھلکے گی چھاگل
نہ گائے گی کوئل، نہ چھنکے گی پائل
اگر تم نہ آئے اگر تم نہ آئے
ہنسیں گے نہ گلشن، یہ چہکے گی بلبل
نہ مہکیں گی راتیں، نہ بکھریں گے کاکل
اگر تم نہ آئے اگر تم نہ آئے
رچے گی نہ مہندی، کھلے گا نہ کجرا
بندھے گا نہ جوڑا، گندھے گا نہ گجرا
اگر تم نہ آئے اگر تم نہ آئے

○

جانے تم کون ہو کس دیس کے باسی ہو تم
میں نے آواز کے پردے میں تمھیں دیکھا ہے

کبھی چاہا ہے تمھیں موجِ صبا کی صورت
دل میں اُترے ہو کبھی مہر و وفا کی صورت

میں نے آواز کو پیغامِ وفا سمجھا ہے
میں نے آواز کے پردے میں تمھیں دیکھا ہے

چاند تاروں کو خبر ہے نہ ہَوا کو معلوم
یہ مرا جذبۂ الفت ہے نہایت معصوم

میں نے اس راز کو سینہ میں چھپا رکھا ہے
میں نے آواز کے پردے میں تمھیں دیکھا ہے

○

بہاریں آ گئیں لیکن نہ دل جھوما نہ تم آئے
ابھی تک ہیں مری تنہائیوں میں درد کے سائے

ہوائیں گنگناتی ہیں ترانہ زندگانی کا
کلی کے لب پہ ہے عنواں مرے دل کی کہانی کا
گلوں نے پھر محبت کے نشیلے جام چھلکائے
بہاریں آ گئیں لیکن نہ دل جھوما نہ تم آئے

ہر اک رخسار پر گل کے جو لرزاں اشکِ شبنم ہے
ترانہ ریز ہے بلبل 'یہ دنیا بزمِ ماتم ہے'
فضا نے سازِ غم چھیڑا گھٹا نے اشک برسائے
بہاریں آ گئیں لیکن نہ دل جھوما نہ تم آئے

○

کلی کلی چٹک گئی چمن چمن مہک اُٹھا
لبوں پہ مسکراہٹیں لیے یہ کون آ گیا

دلوں کی بیقراریاں حسین پھول بن گئیں
مسرّتوں کے ساز پر ہوائیں ناچنے لگیں
حسین گیت بن گیا ، خیال نو بہار کا
کلی کلی چٹک گئی ، چمن چمن مہک اُٹھا

اگر کہیں ہیں جنتیں تو گیسوؤں کی چھاؤں میں
یہ کس کا رُوپ رنگ ہے بہار کی فضاؤں میں
یہ کس کے عارضوں کو چھو کے جھومنے لگی ہوا
کلی کلی چٹک گئی ، چمن چمن مہک اُٹھا

○

یہ چاندنی ، یہ فضا ، یہ سماں ستاروں کا
ہمارے ساتھ چلا کارواں بہاروں کا
مہک رہی ہے ہوا تیرے گیسوؤں کی قسم
دمک اُٹھا ہے چمن، تیرے عارضوں کی قسم
نصیب جاگ اُٹھا ہے حسیں نظاروں کا
یہ چاندنی ، یہ فضا ، یہ سماں تاروں کا
رَواں ہیں چاند کی کشتی میں دو دھڑکتے دل
یہیں ہے پیار کا طوفان اور یہیں ساحل
سلام لاتی ہیں موجیں یہیں کناروں کا
یہ چاندنی ، یہ فضا ، یہ سماں ستاروں کا
نگاہ دل کو سُناتی ہے داستاں اپنی
یہ چاندنی کہ ہے پہلے سے راز داں اپنی
سمجھ رہی ہے یہ مطلب حسیں اشاروں کا
یہ چاندنی ، یہ فضا ، یہ سماں ستاروں کا

Prof. SHARIB RUDAULVI
COLLECTION

○

میں بہت دُور ہوں لیکن مری آواز سنو
میرے محبوب ، مرا نغمۂ پرواز سنو

میرے لہجہ میں مرا جوشِ وفا شامل ہے
میرے نغمہ میں مرے دل کی صدا شامل ہے
سن سکو اَب تو مری روح کا یہ ساز سنو
میں بہت دُور ہوں لیکن مری آواز سنو

گونجتے ہیں مری دُنیا میں تمھارے نغمے
میری نظروں میں سمائے ہیں تمھارے جلوے
جو مرے لب پہ نہ آیا کبھی وہ راز سنو
میں بہت دُور ہوں لیکن مری آواز سنو

○

جو دل میں سمائے ہیں وہ سامنے آجائیں
خاموش محبت کی اب شمع جلاجائیں

یہ پھول ، یہ رنگینی ، یہ ہنستے ہوئے تارے
گلشن کے یہ نظارے تھے مجھ کو کبھی پیارے

اس وقت یہ انگارے یوں مجھ کو نہ تڑپائیں
جو دل میں سمائے ہیں وہ سامنے آجائیں

کلیوں نے کہا ہنس کر وہ آگئے ، وہ آئے
پھولوں پہ ستاروں پر کچھ سائے سے لہرائے

اے بادِ صبا ! کہنا ، یوں ہم کو نہ ترسائیں
جو دل میں سمائے ہیں وہ سامنے آجائیں

○

ہجومِ شوق میں آنسو ، بہا کے لَوٹ آیا
پہنچ کے در پہ ترے مسکرا کے لَوٹ آیا

اُداس اُداس ہواؤ ! مجھے نہ بہلاؤ
خزاں رسیدہ گلو ! مجھ پہ طنز فرماؤ
کہ میں بہار کی منزل پہ جا کے لَوٹ آیا
ہجومِ شوق میں آنسو بہا کے لوٹ آیا

ہر اِک کلی نے چٹک کر مجھے سلام کیا
صبا نے لالۂ و گُل کا مجھے پیام دیا
مگر میں پھولوں سے دامن بچا کے لوٹ آیا
ہجومِ شوق میں آنسو بہا کے لوٹ آیا

○

دل میں شعلے نہاں، لب پہ نغمے جواں
ہے رَواں زندگی کا حسیں کارواں
ساتھ اپنے لیے عشق کے زمزمے
حسن کی کہکشاں ، پیار کی داستاں

گھل گئی آج نغموں کی آواز میں
چوڑیوں کی کھنک ، دردِ دل کی کسک
بس گئی آج گیتوں کے انداز میں
سوزِ غم کی لہک ، زخمِ دل کی مہک
ہم قدم ہیں بہاروں کی رنگینیاں
ہم سفر ہے محبت کا رنگیں جہاں
دل میں شعلے نہاں، لب پہ نغمے جواں
ہے رواں زندگی کا حسیں کارواں

یہ سہانا سماں ، زندگی شادماں ،
رات ہے خندہ زن ، چاند ہے گامزن
کس ادا سے چلا قافلہ پیار کا
عشق ہے نغمہ زن ، حسن شعلہ فگن
ہیں زمیں پہ قدم ، دل میں عزم جواں
اور نگاہوں میں ہے رفعتِ آسماں
دل میں شعلے نہاں، لب پہ نغمے جواں
ہے رواں زندگی کا حسیں کارواں

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

○

کتنی اُداس آج محبت کی شام ہے
یہ منزلیں ہیں موت کی، جینے کا نام ہے

فصلِ بہار میں ہم رو رو کے جی لیے ہیں
اب پی لیے ہیں آنسو اور ہونٹ سی لیے ہیں

اے محفلِ جہاں تجھے اپنا سلام ہے
کتنی اُداس آج محبت کی شام ہے

اس زندگی میں ہم کو دنیا سے کیا ملا ہے
اِک داغِ آرزو تھا، وہ دل نے کھو دیا ہے

اب موت کا سکون بھی مجھ پر حرام ہے
کتنی اداس آج محبت کی شام ہے

رفعت سروش کی مطبوعات

۱. وادیٔ گل (۱۹۶۳ء)
(قیمت: ۳ روپے، کتابی سائز، ۷۶ صفحات)
پبلشر: بیگم صبیحہ سروش، اے-۳۷، آر کے پورم، نئی دہلی-۱۶
یہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۶۲ء تک کی مختصر نظموں کا انتخاب ہے۔ کل نظمیں ۲۷۔

۲. عروجِ آدم (۱۹۶۷ء)
(قیمت: ۵ روپے، کتابی سائز، ۷۶ صفحات)
پبلشر: مجلسِ اشاعتِ ادب، دہلی
یہ کتاب پانچ منظوم ڈراموں اور دو مثنویوں پر مشتمل ہے۔

۳. ذکر اُس پری وش کا (۱۹۶۸ء)
(قیمت: روپے، پاکٹ سائز)
پبلشر: اسٹار پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی
اس میں ۳۶ قطعات، ۲۲ نغمے، ۲۲ وطنی نظمیں اور ۲۶ رومانی نظمیں شامل ہیں۔

۴. جہاں آرا (۱۹۷۳ء)
(قیمت: ۵ روپے، ڈیمائی سائز)
پبلشر: نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵
یہ اوپیرا دہلی اور بیرونِ دہلی کئی شہروں میں بہت دنوں تک کھیلا گیا۔
مقدمہ: پروفیسر گوپی چند نارنگ

۵. روشنی کا سفر (۱۹۷۴ء)
(قیمت: ۱۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۹۲ صفحات)
پبلشر: مجلسِ اشاعتِ ادب، امروہہ، یوپی
اس کتاب میں کل ۶۸ نظمیں اور ۶ منظوم ڈرامے ہیں۔ موضوعات ہیں حب الوطنی اور امنِ عالم، مقدمہ: علی جواد زیدی۔

۶. نقشِ صدا (۱۹۷۷ء)
(قیمت: ۵ روپے، ڈیمائی سائز، ۸۷ صفحات)
پبلشر: انجمن ترقی اردو ہند، دہلی
یہ انتخاب ہے۔ جس میں ۴۰ نظمیں اور ۱۴ غزلیں شامل ہیں۔
پیش لفظ: ڈاکٹر خلیق انجم

۷. شاہجہاں کا خواب (دسمبر ۱۹۸۰ء)
(قیمت: ۱۰ روپے، کتابی سائز، ۷۶ صفحات)
پبلشر: نورنگ کتاب گھر، اے-۳۴، پنڈارا روڈ، نئی دہلی-۳
تاج محل کی عظمت پر مبنی یہ اوپیرا پہلے مسلسل پانچ ماہ تک آگرہ میں "تاج کی کہانی" کے نام سے، اور پھر بہت سے شہروں میں کھیلا گیا۔
مقدمہ: پروفیسر قاضی عبدالستار

۸. وادیٔ غزل (اکتوبر ۱۹۸۱ء)
(قیمت: ۲۵ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۲۰ صفحات)
پبلشر: نورنگ کتاب گھر، اے-۳۴، پنڈارا روڈ، نئی دہلی-۳
کل ۷۵ غزلیں۔ مقدمہ: پروفیسر شکیل الرحمن

۹. نقوشِ رفتہ (ستمبر ۱۹۸۳ء)
(قیمت: ۴۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۲۰۰ صفحات)
پبلشر: رفعت سروش اے-۳۴، پنڈارا روڈ، نئی دہلی-۳
اس کتاب میں ۱۴ مضامین ہیں۔

۱۰. **تاریخ کے آنچل میں** (دسمبر ۱۹۸۴ء) **پبلشر**: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

(قیمت: ۱۵ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۰۰ صفحات) اس کتاب میں ایک ڈانس ڈرامہ "اک شہنشاہ عشق و وفا: جہانگیر" اور ایک اوپیرا "حبہ خاتون" شامل ہیں۔ دونوں کئی کئی بار اسٹیج پر کھیلے جا چکے ہیں۔ "حبہ خاتون" کا پیش لفظ ڈاکٹر محمد حسن نے لکھا ہے اور مقدمہ قیصر قلندر (مرحوم) نے۔ ڈانس ڈرامہ "جہانگیر" کا مقدمہ ڈاکٹر خلیق انجم نے سپرد قلم کیا ہے۔

۱۱. **مری صدا کا غبار** (دسمبر ۱۹۸۵ء) **پبلشر**: رفعت سروش، نورنگ کتاب گھر، منیرکا، نئی دہلی

(قیمت: ۵۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۷۶ صفحات) اس مجموعہ کلام میں ۹۶ نظمیں، ۳ طویل نظمیں، ۶۰ غزلیں اور ۲ منظوم ڈرامے شامل ہیں۔

۱۲. **بمبئی کی بزم آرائیاں** (۱۹۸۶ء) **پبلشر**: نورنگ کتاب گھر، منیرکا، نئی دہلی

(قیمت: ۵۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۶۰ صفحات) خود نوشت (۱۹۴۵ء تا ۱۹۸۵ء)

۱۳. **پھولوں کی وادی** (۱۹۸۶ء) **پبلشر**: پبلی کیشنز ڈویژن (حکومت ہند) پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

(قیمت: ۱۵ روپے) یہ منظوم ڈرامہ آزادیٔ وطن کے بعد کے منظر نامے کو پیش کرتا ہے۔

۱۴. **ریت کی دیواریں** (۱۹۸۷ء) **پبلشر**: ناولستان، جامعہ نگر، نئی دہلی

(قیمت: ۵۷ روپے، کتابی سائز، ۱۱۰ صفحات) یہ ناول متوسط طبقہ کے ایک نوجوان کی زندگی کی جدوجہد اور مسائل کو پیش کرتا ہے۔

۱۵. **اُسی دیوار کے سائے میں** (۱۹۸۷ء) **پبلشر**: رفعت سروش، نورنگ کتاب گھر، منیرکا، نئی دہلی

(قیمت: ۳۵ روپے، ۱۶۰ صفحات) اس کتاب میں سات منظوم ڈرامے شامل ہیں۔

۱۶. **کربِ تنہائی** (دسمبر ۱۹۸۹ء) **پبلشر**: نورنگ کتاب گھر، بی-۱۷، سیکٹر-۱۱، نوئیڈا

(قیمت: ۵۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۱۲ صفحات) اس مجموعہ کلام میں ۳۳ نظمیں اور ۱۳ غزلیں شامل ہیں۔ مقدمہ: پروفیسر شارب ردولوی

۱۷. **یادوں کے چاند ستارے** (۱۹۹۰ء) **پبلشر**: باب العلم پبلی کیشنز، نوئیڈا

(قیمت: ۲۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۴۰ صفحات) یہ پاکستان کا سفرنامہ ہے۔ مصنف نے ۱۹۸۴ء میں چند روز کے لیے لاہور اور کراچی کا سفر کیا تھا۔

۱۸. **قلم کے صفیر** (نومبر ۱۹۹۰ء) **پبلشر**: نورنگ کتاب گھر، ۲-بی، پاکٹ سی، سدھارتھ ایکسٹینشن، نئی دہلی-۱۴

(قیمت: ۵۷ روپے، ڈیمائی سائز) اس کتاب میں مختلف شخصیات پر ۲۳ مضامین شامل ہیں۔

۱۹. **ریت کی دیواریں** (۱۹۹۱ء) **پبلشر**: نورنگ کتاب گھر، ۲-بی، پاکٹ سی، سدھارتھ ایکسٹینشن، نئی دہلی-۱۴

(قیمت: ۴۰ روپے، کتابی سائز، ۱۱۰ صفحات) اردو ناول کا ہندی ترجمہ

۲۰. ڈگر پنگھٹ کی (دسمبر ۱۹۹۱ء)
پبلشر: نورنگ کتاب گھر، ۲-بی، پاکٹ سی، سدھارتھ ایکسٹینشن، نئی دہلی-۱۴
(قیمت: ۶۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۶۰ صفحات) اس کتاب میں چھ نثری ڈرامے شامل ہیں۔ (۱) ڈگر پنگھٹ کی: یہ ڈرامہ دہلی، شاہجہانپور اور جے پور میں کئی بار کھیلا گیا اور ریڈیو کے نیشنل ڈرامہ پروگرام میں کئی بار نشر ہوا۔ (۲) مصور: ریڈیو پر پیشکش کے علاوہ اس ڈرامہ پر ٹیلی فلم بھی بنی اور بمبئی کے مہاراشٹر کالج میں کھیلا بھی گیا۔ (۳) بگولے (۴) غنچہ پھر کھلنے لگا (۵) ایک ڈوبتا جزیرہ (۶) یہ چاروں ریڈیائی ڈرامے ہیں۔

۲۱. شاخِ گل (۱۹۹۲ء)
پبلشر: نورنگ کتاب گھر، ۲-بی، پاکٹ سی، سدھارتھ ایکسٹینشن، نئی دہلی-۱۴
(قیمت: ۷۵ روپے، ڈیمائی سائز، ۲۰۸ صفحات) اس مجموعہ کلام میں ۷۶ نظمیں اور ۷۰ غزلیں شامل ہیں۔

۲۲. اور بستی نہیں یہ دلّی ہے (۱۹۹۲ء)
پبلشر: نورنگ کتاب گھر، ۲-بی، پاکٹ سی، سدھارتھ ایکسٹینشن، نئی دہلی-۱۴
(قیمت: ۲۰۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۳۶۴ صفحات) یہ خود نوشت حصہ دوم ہے۔ جس میں ۱۹۵۸ء سے ۱۹۹۱ء تک کے حالات زندگی ہیں۔

۲۳. شعورِ آگہی (۱۹۹۳ء)
پبلشر: نورنگ کتاب گھر، ۲-بی، پاکٹ سی، سدھارتھ ایکسٹینشن، نئی دہلی-۱۴
(قیمت: ۱۰۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۲۵۲ صفحات) اس کتاب میں بارہ منظوم ڈرامے اور اوپیرا شامل ہیں، جن میں سے روشنی کا کارواں، انارکلی اور فکر غالب (ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے) ڈانس ڈراموں کی شکل میں اسٹیج پر کیے جا چکے ہیں۔

۲۴. قافلہ (۱۹۹۴ء)
پبلشر: نورنگ کتاب گھر، ۲-بی، پاکٹ سی، سدھارتھ ایکسٹینشن، نئی دہلی-۱۴
(قیمت: ۱۰۰ روپے، ڈیمائی سائز، صفحات ۲۳۲) اس مجموعہ میں ہم عصر ادیبوں اور شاعروں پر ۳۲ مضامین شامل ہیں۔

۲۵. غزل کے رنگ (۱۹۹۴ء)
پبلشر: نورنگ کتاب گھر، ۲-بی، پاکٹ سی، سدھارتھ ایکسٹینشن، نئی دہلی-۱۴
(قیمت: ۱۰۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۶۰ صفحات) یہ دیوناگری رسم الخط میں رفعت سروش کی غزلوں کا انتخاب ہے۔ مشکل الفاظ کے معانی بھی درج ہیں۔ کل غزلیں ۱۴۴۔

۲۶. زندگی اک سفر (۱۹۹۵ء)
پبلشر: نورنگ کتاب گھر، ۲-بی، پاکٹ سی، سدھارتھ ایکسٹینشن، نئی دہلی-۱۴
(قیمت: ۸۰ روپے، ۱۴۴ صفحات)
اس کتاب میں دو ریڈیائی ڈرامے "امراؤ جان ادا" (رسوا کے ڈرامے کا ریڈیائی روپ) اور "زندگی اک سفر" اور ریڈیائی ڈرامے پر ایک تفصیلی مضمون شامل ہے۔ اول الذکر ڈرامہ ریڈیو کے نیشنل پروگرام میں نشر ہوا۔

۲۷. دھندلکے کی زنجیر (۱۹۹۶ء)
پبلشر: رفعت سروش، نورنگ کتاب گھر، اے-۸۰، سیکٹر-۲۷، نوئیڈا
(قیمت: ۶۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۲۰ صفحات) یہ سترہ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔

۲۸. پتہ پتہ بوٹا بوٹا (۱۹۹۷ء) پبلشر: رفعت سروش، نورنگ کتاب گھر، اے-۸۰، سیکٹر-۲۷، نوئیڈا
(قیمت: ۸۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۲۰۶ صفحات) یہ خودنوشت کا تیسرا حصہ ہے۔ (اصولاً اسے پہلے لکھنا چاہیے تھا مگر......) بچپن سے ۱۹۴۵ء تک کے حالات۔

۲۹. پتہ پتہ بوٹا بوٹا (۱۹۹۷ء) پبلشر: رفعت سروش، نورنگ کتاب گھر، اے-۸۰، سیکٹر-۲۷، نوئیڈا
(قیمت: ۱۵۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۴۸۰ صفحات) دوسرا ایڈیشن مع اضافہ۔ اس ایڈیشن میں "پتہ پتہ بوٹا بوٹا" اور "بمبئی کی بزم آرائیاں" شامل ہیں۔ گویا یہ کتاب بچپن سے ۱۹۵۸ء تک کے حالات کا احاطہ کرتی ہے۔

۳۰. رنگ منچ کے پانچ رنگ (۱۹۹۷ء) پبلشر: رفعت سروش، نورنگ کتاب گھر، اے-۸۰، سیکٹر-۲۷، نوئیڈا
(قیمت: ۱۰۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۱۲ صفحات) اس کتاب میں پانچ ہندی منظوم ڈرامے شامل ہیں جن میں سے "رائے پروین" کو آل انڈیا ریڈیو کے نیشنل پروگرام (ڈرامہ) میں پیش کیا گیا۔ اور "پرتوراج" کو دوردرشن پر پیش کیا گیا۔

۳۱. پانی پت (۱۹۹۷ء) پبلشر: رفعت سروش، نورنگ کتاب گھر، اے-۸۰، سیکٹر-۲۷، نوئیڈا
(قیمت: ۱۲۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۴۴ صفحات) یہ رزمیہ ہے جس میں پانی پت کے حوالے سے ہندوستان کی پانچ ہزار سالہ تاریخ کی جھلکیاں ہیں۔ دیباچہ: ڈاکٹر خلیق انجم

۳۲. پتہ پتہ بوٹا بوٹا (۱۹۹۸ء) پبلشر: وچار کی سنکلن، میورو ہار، دہلی
(قیمت: ۲۰۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۲۰۸ صفحات) ہندی میں بھی یہ خودنوشت بچپن سے ۱۹۵۸ء تک کے حالات کا احاطہ کرتی ہے۔

۳۳. زاویۂ نظر (۱۹۹۸ء) پبلشر: رفعت سروش، نورنگ کتاب گھر، اے-۸۰، سیکٹر-۲۷، نوئیڈا
(قیمت: ۱۰۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۰۶ صفحات) اس کتاب میں چودہ مضامین شامل ہیں۔

۳۴. شہرِ غزل (۱۹۹۹ء) پبلشر: رفعت سروش، نورنگ کتاب گھر، اے-۸۰، سیکٹر-۲۷، نوئیڈا
(قیمت: ۱۵۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۹۲ صفحات) تقسیم کار: معیار پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ اس کتاب میں کل ۱۲۱ غزلیں شامل ہیں جن میں ۴۸ غزلیں پرانے مجموعوں سے لی گئی ہیں۔

۳۵. سرِ شام (۱۹۹۹ء) پبلشر: رفعت سروش، نورنگ کتاب گھر، اے-۸۰، سیکٹر-۲۷، نوئیڈا
(قیمت: ۱۵۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۲۴۰ صفحات) اس کتاب میں کل ۱۳۶ نظمیں شامل ہیں جن میں سے ۳۸ پرانے مجموعوں سے لی گئی ہیں۔ دیباچہ: پروفیسر عتیق اللہ

۳۶. خواب اور تعبیرِ خواب (۱۹۹۹ء) پبلشر: رفعت سروش، نورنگ کتاب گھر، اے-۸۰، سیکٹر-۲۷، نوئیڈا
(قیمت: ۲۵ روپے، ڈیمائی سائز، ۴۸ صفحات) یہ منظوم ڈرامہ بیسویں صدی میں آزادیٔ وطن کی جدوجہد اور اس کے بعد تعمیری سرگرمیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اردو سروس سے پیش کیا جا چکا ہے۔

۳۷. براڈ کاسٹنگ (مارچ ۲۰۰۰ء) پبلشر: رفعت سروش، نورنگ کتاب گھر، اے-۸۰، سیکٹر-۲۷، نوئیڈا
(قیمت: ۱۵۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۶۰ صفحات) یہ کتاب براڈ کاسٹنگ کے فن سے متعلق ہے اور نشر ہونے والے ہر قسم کے پروگراموں پر بھرپور روشنی ڈالتی ہے۔

۳۸. پروین رائے اور دوسرے منظوم ڈرامے (۲۰۰۱ء) پبلشر: نورنگ کتاب گھر، اے-۸۰، سیکٹر-۲۷، نوئیڈا
(قیمت: ۱۰۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۲۸ صفحات) اس کتاب میں پانچ منظوم ڈرامے شامل ہیں۔

۳۹. اندھیرے اُجالے کے درمیان (۲۰۰۲ء) پبلشر: نورنگ کتاب گھر، اے-۸۰، سیکٹر-۲۷، نوئیڈا
(قیمت: ۱۰۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۲۸ صفحات) یہ ناول ہندی میں ہے اور اس کا موضوع تحلیلِ نفسی ہے۔

۴۰. خانوادۂ نور (۲۰۰۳ء) پبلشر: نورنگ کتاب گھر، اے-۸۰، سیکٹر-۲۷، نوئیڈا
(قیمت: ۲۰۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۹۲ صفحات) یہ طویل نظم اسلام کی منظوم تاریخ ہے۔

۴۱. گم ہوتا ہوا آسمان (۲۰۰۳ء) پبلشر: نرالی دنیا پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی
(قیمت: ۱۵۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۷۶ صفحات) اس مجموعہ میں ۹۱ نظمیں اور ۶۳ غزلیں ہیں۔

۴۲. شہرِ نگاراں (۲۰۰۴ء) پبلشر: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، نئی دہلی
(قیمت: ۲۰۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۲۸ صفحات) یہ ناول بمبئی کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔

۴۳. اندھیرے اُجالے کے درمیان (۲۰۰۴ء) پبلشر: فرید بک ڈپو، دہلی
(قیمت: ۳۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۱۲ صفحات) یہ ناول اُردو میں ہے۔ ہندی میں یہ ناول پہلے شائع ہو چکا ہے۔

۴۴. کلامِ اقبال کا طنزیہ پہلو (۲۰۰۴ء) پبلشر: فرید بک ڈپو، دہلی
(قیمت: ۳۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۱۲ صفحات) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ تنقیدی کتاب ہے۔

۴۵. بہارِ نو بہار (مارچ ۲۰۰۴ء) پبلشر: رفعت سروش، نورنگ کتاب گھر، اے-۸۰، سیکٹر-۲۷، نوئیڈا
(قیمت: ۱۵۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۴۴ صفحات) اس کتاب میں بہار کے سات ادیبوں اور شاعروں پر مضامین ہیں۔

۴۶. تھکے نہ میرے پاؤں (۲۰۰۵ء) پبلشر: نورنگ کتاب گھر 204، صبا سہکاری آواس سمیتی، ڈی-3، سیکٹر-44، نوئیڈا (یوپی)
(قیمت: ۲۰۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۹۲ صفحات) سوویت یونین، پاکستان، عراق، سعودی عرب، لندن، حیدرآباد، بمبئی اور بھوپال کے سفرنامے۔

۴۷. Songs of Life (۲۰۰۶ء) پبلشر: نورنگ کتاب گھر نوئیڈا۔
(قیمت: ۲۵۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۶۰ صفحات) (اس کتاب میں رفعت سروش کی تقریباً پچاس منتخب نظمیں معہ انگریزی ترجمہ شامل ہیں اور کچھ ناقدین کے انگریزی مضامین)

۴۸. علم و ادب کے روشن چراغ (۲۰۰۶ء) پبلشر: نورنگ کتاب گھر، نوئیڈا
(قیمت: ۲۰۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۹۲ صفحات) (اس کتاب میں ۱۱ مشاہیر پر تاثراتی مضامین شامل ہیں)

۴۹. فغانِ دہلی (۲۰۰۷ء) پبلشر: نورنگ کتاب گھر، نوئیڈا
(قیمت: ۲۰۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۲۴۴ صفحات) (۱۸۵۷ء میں دہلی کی تباہی پر منظومات۔ مرتب: تفضل حسین کوکب ۱۸۶۳ء میں شائع اس کتاب کو رفعت سروش نے ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے)

۵۰. جہانِ رقص ونغمہ (۲۰۰۷ء) — پبلشر: نورنگ کتاب گھر، نوئیڈا
(قیمت: ۵۰۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۵۴۴ صفحات) (اس کتاب میں رفعت سروش کے تمام منظوم ڈراموں، اوپیراؤں اور ڈانس ڈراموں کو یکجا کر دیا گیا ہے)

۵۱. آنسوؤں کے چراغ (۲۰۰۸ء) — پبلشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
(قیمت: ۲۰۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۲۰۸ صفحات) (۳۹ قلم کاروں کے ارتحال پر فوری طور پر قلم سے نکلے مضامین)

۵۲. اثاثہ (۲۰۰۸ء) — پبلشر: فرید بک ڈپو، دہلی
(ڈیمائی سائز، ۱۰۵۶ صفحات) (کلیات نظم وغزل)

تراجم

۵۳. دیمک (۱۹۷۷ء) — پبلشر: نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی
(قیمت: ۷/۵ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۴۴ صفحات) بنگالی ناول نگار شرشیندو مکھوپادھیائے کے ناول "گھن پوکا" کا ترجمہ ہندی سے۔ (حال ہی میں یہ ناول کراچی پاکستان سے رفعت سروش کے نام سے چھپا ہے)

۵۴. مولانا ابوالکلام آزاد (۱۹۸۲ء) — پبلشر: پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی
(قیمت: ۸/۵۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۶۵ صفحات) یہ کتاب عرش ملسیانی کی اُردو کتاب کا ہندی ترجمہ ہے۔

۵۵. رانی لکشمی بائی (۱۹۹۱ء) — پبلشر: نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی
(قیمت: ۱۳ روپے، کتابی سائز، ۹۶ صفحات) مجاہدۂ آزادی مہارانی لکشمی بائی کی زندگی پر یہ ناول ہندی ناول نگار ورنداون لال ورما کی تصنیف ہے جسے رفعت سروش نے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔

۵۶. جوش ملسیانی (۲۰۰۷ء) — پبلشر: ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی (عزیز پریہار کی انگریزی کتاب کا ترجمہ)

رفعت سروش پر تنقیدی و تحقیقی کتابیں

۱. فکر وآگہی: رفعت سروش نمبر (۱۹۹۰ء) — ایڈیٹر: ڈاکٹر رضیہ حامد
(قیمت: ۱۰۰ روپے، ۳۸۷ صفحات) — ناشر: باب العلم پبلی کیشنز، نوئیڈا

۲. رفعت سروش: شخصیت اور فن (۱۹۹۰ء) — مرتبہ: ڈاکٹر رضیہ حامد
(قیمت: ۱۰۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۳۸۶ صفحات) — ناشر: باب العلم پبلی کیشنز، نوئیڈا

۳. رفعت سروش بحیثیت صاحبِ طرز نثر نگار — مرتبہ: ڈاکٹر رضیہ حامد
(قیمت: ۵۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۶۲ صفحات) — ناشر: باب العلم پبلی کیشنز، نوئیڈا

۴. نذرِ رفعت سروش (۲۰۰۲ء) — مرتبہ: ڈاکٹر شبانہ نذیر
(قیمت: ۱۵۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۶۲ صفحات) — ناشر: نورنگ کتاب گھر، نوئیڈا

۵. رفعت سروش (۲۰۰۳ء) — ڈاکٹر عطیہ سلطانہ کا تحقیقی مقالہ
(قیمت: ۱۵۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۲۰۷ صفحات) — ناشر: باب العلم پبلی کیشنز، بھوپال

۶. بہارِ نو بہار: رفعت سروش: تجزیاتی مطالعہ (۲۰۰۷ء) — محمد سالم
(قیمت: ۱۵۰ روپے، ڈیمائی سائز، ۱۱۲ صفحات) — ناشر: فرحت فاطمہ، امریکہ

رفعت سروش: ایک نظر میں

نام : رفعت سروش

پیدائش : ۲رجنوری ۱۹۲۶ء، نگینہ، ضلع بجنور (یوپی)

ملازمت : • پہلی ملازمت: جنرل ہیڈ کوارٹر ۱۹۴۳ء پھر کئی ملازمتیں چھوڑنے کا تجربہ کرنے کے بعد
• آل انڈیا ریڈیو (بمبئی اور دلی) ۱۹۴۵ء تا ۱۹۸۴ء
• غالب انسٹی ٹیوٹ (دہلی) ۱۹۸۴ء تا ۱۹۸۵ء

انعامات و اعزازات: • قومی اقبال سمان • سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ • ہم سب غالب ایوارڈ • ساہتیہ اکیڈمی انعام • آغا حشر کاشمیری عالمی ایوارڈ • فراق گورکھپوری عالمی ایوارڈ • حضرت امیر خسرو ایوارڈ • میر اکیڈمی ایوارڈ • نشانِ سجاد ظہیر • مخدوم محی الدین ایوارڈ • کنور مہندر سنگھ بیدی ثقافتی ایوارڈ (ہریانہ اردو اکیڈمی) • دہلی اُردو اکیڈمی فیلوشپ • اور بہت سے اداروں کے دیگر انعامات کے علاوہ اُتر پردیش، دلی، مغربی بنگال اور بہار اُردو اکیڈمیوں کے اٹھائیس ایوارڈ مختلف کتابوں پر۔

شعری مجموعے: • وادیٔ گل • ذکر اس پری وش کا • نقشِ صدا • روشنی کا سفر • وادیٔ غزل • مری صدا کا غبار • کربِ تنہائی • شاخِ گل • شہرِ غزل • سرِ شام • گم ہوتا ہوا آسمان • Songs of Life

منظوم ڈرامے اور اوپیرا: • عروجِ آدم • جہاں آرا • شاہجہاں کا خواب • پھولوں کی وادی • تاریخ کے آنچل میں • اسی دیوار کے سائے میں • شعورِ آگہی • خواب اور تعبیرِ خواب • پانی پت (رزمیہ) • پروین رائے اور دوسرے ڈرامے • خانوادۂ نور (طویل نظم) • جہانِ رقص و نغمہ (منظوم ڈراموں، ڈانس ڈراموں اور اوپیراؤں کا کلیات)

نثر میں: • ڈگر پنگھٹ کی • زندگی اک سفر (ڈرامے) • ریت کی دیواریں (ناول) • شہرِ نگاراں (ناول) • اندھیرے اُجالے کے بیچ (ناول) • دھند لکے کی زنجیر (افسانے) • پتہ پتہ بوٹا بوٹا • بمبئی کی بزم آرائیاں اور بستی نہیں یہ دِلّی ہے (خودنوشت تین حصوں میں) • براڈ کاسٹنگ (فن نشریات)

مضامین کے مجموعے: • نقوشِ رفتہ • قلم کے صفیر • قافلہ • زاویۂ نظر • بہارِ نو بہار • یادوں کے چاند ستارے (سفرنامہ) • کلامِ اقبال کا طربیہ پہلو • علم و ادب کے روشن چراغ • تھکے نہ میرے پاؤں (سفرنامہ) • آنسوؤں کے چراغ (۳۹ قلم کاروں کے ارتحال پر مضامین)

ہندی میں: • رنگ منچ کے پانچ رنگ (منظوم ڈرامے) • غزل کے رنگ (غزلیں) • پتہ پتہ بوٹا بوٹا (خودنوشت) • ریت کی دیواریں (ناول) • اندھیرے اُجالے کے بیچ (ناول)

تراجم و ترتیب: • مولانا ابوالکلام آزاد • دیپک • رانی لکشمی بائی • جوش ملسیانی • فغانِ دہلی

بیرونی ممالک کی سیاحت: • سوویت یونین • عراق • انگلینڈ • سعودی عرب • پاکستان • ایران

رفعت سروش و اہلیہ

رفعت سروش ایوارڈ و اپنی مطبوعات کے ساتھ

M. R. Publications

Printers, Publishers, Suppliers & Distributors of Literary Books

10 Metropole Market, 2724-25 First Floor

Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 09810784549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com